تفسیر موضوعی

جلد نہم

زیرِ نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

قرآن مجید میں امامت اور ولایت

نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

حجۃ الاسلام سید حسنین عباس گردیزی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ------------------ تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن

جلد ------------------ نہم

مؤلف ------------------ آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ------------------ حجۃ الاسلام مولانا سید حسنین گردیزی

نظر ثانی ------------------ حجۃ الاسلام ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

سیٹنگ و گرافکس ------------------ قلب علی سیال

سال اشاعت ------------------ 2013ء

ناشر ------------------ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ (پیامِ قرآن جلد 8،9،10) ------- 1000 روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِ حاضر میں جب تفسیرِ قرآن کی بات ہوتو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِ اوّل سے لے کر آج تک لکھی جارہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔۱۔تفسیرِ مفرداتی ۲۔تفسیرِ ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیرِ ارتباطی ۵۔تفسیرِ کلی۔

تفسیر کے پہلے دو طریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کو ایک مقام پر لا کر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے، لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظرعام پر آچکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعیٔ جمیل کا نتیجہ ہے،اس کی سات جلدیں پہلے سے قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔جلد ہشتم تا دہم قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''پیامِ قرآن جلد نہم'' کا اردو ترجمہ ادارہ ہذا کے تعاون سے حجۃ الاسلام مولانا سید حسنین عباس گردیزی نے کیا ہے۔ادارہ مولانا موصوف کا اس سعیٔ جمیل پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہے۔بلاشبہ مولانا موصوف اگر ادارہ ہذا کے ساتھ طے شدہ ضوابط کے تحت تکمیلِ معاہدہ فرماتے تو زیرِ نظر کتاب 8 ماہ قبل قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوتی ،لیکن غفلت کی ستم ظریفی!۔۔۔ کتاب ہذا کی تکمیل میں 6 ماہ کی بجائے 15 ماہ کا طویل عرصہ لگا دیا گیا۔اس وقت تفسیر موضوعی (پیام قرآن) کی جلد نمبر 9 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔جون 2012ء تک آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب سائٹ www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست مضامین

پیش لفظ

موضوعی تفسیر کیا ہے؟ اور کن مشکلات کو حل کرتی ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب موجودہ کتاب جیسی کتابوں کو صحیح مضمون میں سمجھنے میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ جب تک ان دو سوالوں کا جواب واضح نہیں ہوتا، اس وقت ہم اس قسم کی کتابوں کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم یاد دہانی کراتے ہیں کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جو ۲۳ سال کے لمبے عرصے میں مختلف معاشرتی حالات اور تقاضوں اور گونا گوں واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے نازل ہوئی ہے اور اسلامی معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس (کی تعلیمات میں) میں بھی پیشرفت ہوتی رہی ہے۔

جن سورتوں کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر توحید و معاد پر ایمان و اعتقاد کو محکم کرنے خصوصاً شرک اور بت پرستی کے خلاف شدید جد و جہد کی عکاسی کرتی ہیں جبکہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی آیات قدرتی طور پر اسلامی حکومت کے تشکیل پانے کے بعد نازل ہوئی ہیں، لہٰذا معاشرتی، عبادی، سیاسی احکام اور بیت المال کی تشکیل اور اسلام کے قضائی نظام کی طرف ناظر ہیں اور پھر منافقین وغیرہ کے ساتھ جنگ و صلح پر مبنی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں کہ جن میں اس وقت اسلام مبتلا تھا۔

واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایک رسالۂ عملیہ (توضیح المسائل) یا قدیم نصابی اور درسی کتاب کی شکل میں پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ آیات مختلف مناسبتوں، تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق نازل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد، جنگی احکامات، عہد ناموں، اسیروں، جنگی تاوانوں وغیرہ سے متعلق احکام ہر غزوہ کی مناسبت سے پراکندہ صورت میں نازل ہوئے ہیں یہ بالکل ایک ماہر طبیب کے نسخے کی طرح ہیں کہ جو ہر روز بیمار کے حال کے مطابق نسخہ لکھتا ہے اور اسے مکمل صحت عطا کرتا ہے۔

اب اگر ہم قرآنی آیات کی نازل شدہ سورتوں میں ہر سورت میں آیات کے مطابق، ترتیب کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ ''ترتیبی تفسیر'' ہوگی اور اگر ایک ''موضوع'' سے متعلق آیات پورے قرآن سے جمع کر کے ایک ساتھ رکھیں اور پھر ان کی فصل بندی کر کے تفسیر کریں تو یہ ''موضوعی تفسیر'' ہوگی۔

مثلاً جب بھی جہاد سے متعلق تمام آیات کہ جو دس سال کے دوران، مدنی سوروں میں نازل ہوئی ہیں یا اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے متعلق آیات جو ۲۳ رسال کے دوران پورے قرآن میں نازل ہوئی ہیں، ایک ساتھ رکھی جائیں اور پھر ان کی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی بنا پر تفسیر کی جائے تو یہ موضوعی تفسیر کہلائے گی۔

دونوں قسم کی تفسیر کی اپنی اپنی خصوصیات اور اثرات ہیں کہ جو ہمیں ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں کرتیں

اور ''ہر چیز اپنی جگہ پر اچھی ہوتی ہے'' کے مصداق دونوں قسم کی تفسیریں قرآن کے محققین کے لئے ضروری ہیں (البتہ پہلے ترتیبی تفسیر ہے اور پھر موضوعی تفسیر)۔

ترتیبی تفسیر کی خصوصیات

اس طرح کی تفسیر میں آیات کے نازل ہونے کے زمان ومکان، پہلے اور بعد میں آنے والی آیات اور داخلی اور بیرونی قرائن کے لحاظ ہر آیت کا مقام واضح ہوجاتا ہے، اس کے بغیر آیت کا صحیح معنی سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ترتیبی تفسیر ہر آیت کو اس کے اپنے مقام پر دیکھتی ہے اور اسلامی معاشرے کی روح کے ساتھ اس کے تعلق اور اس کی پیشرفت وتکامل کو مدنظر رکھتی ہے اور اس تعلق سے بہت سے مسائل واضح ہوجاتے ہیں۔

جبکہ موضوعی تفسیر میں آیات عینی اور جزئی واقعات کی شکل سے نکل کر ایک مجموعی وکلی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے مقام سے کسی حد تک دور ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس موضوعی تفسیر کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

موضوعی تفسیر کی خصوصیات

۱۔ ایک ہی موضوع کی مختلف آیات میں پیش ہونے والے گوناگوں پہلوؤں کو ایک ساتھ قرار دیتے ہوئے تمام موضوعات کو جامع انداز میں چند پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے جس سے قدرتی طور پر جدید حقائق سامنے آتے ہیں۔

۲۔ قرآن کی بعض آیات میں پہلی نظر میں (انسان کو) ابہامات نظر آتے ہیں لیکن '' **القرآنُ یفسر بعضہ بعضاً** '' (قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں) کے اصول کے مطابق یہ ابہامات (موضوعی تفسیر) کی وجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔

۳۔ موضوعی تفسیر بطور کلی ہر مسئلے اور ہر موضوع کے بارے میں اسلامی نظریۂ کائنات کو واضح کر دیتی ہے۔

۴۔ قرآن کے بہت سے چھپے ہوئے اسرار کو فقط موضوعی تفسیر کی روش پر ہی واضح کیا جاسکتا ہے اور انسانی استعداد کی حد تک آیات کی گہرائیوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

بنابرایں گہری سوچ اور آگاہی رکھنے والا کوئی بھی مسلمان اس دونوں قسم کی تفاسیر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اگرچہ زمانۂ قدیم حتیٰ ائمہ ہدیٰؑ کے زمانے سے موضوعی تفسیر کی طرف توجہ دی جاتی رہی ہے اور علمائے اسلام نے اس سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جس کی واضح مثال '' آیات الاحکام'' کے نام سے لکھی جانے والی کتابیں ہیں، لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ موضوعی تفسیر میں جس طرح ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی اور ابھی تک یہ اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے۔ لہٰذا علمائے

کرام کی زحمات کے نتیجے میں اسے اپنے حقیقی مقام تک پہنچنا چاہیے۔

اس کتاب ''پیام قرآن'' میں کاملاً ایک جدید روش کے مطابق قرآن کی موضوعی تفسیر کے موضوع پر جدید قدم اٹھائے گئے ہیں اور الحمدللہ اس کا بہت زیادہ استقبال ہوا ہے اور ہر روز معاشرے کے مختلف طبقات کی طرف سے اسے پذیرائی مل رہی ہے پھر بھی یہ کام ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے اور اسے علمائے اسلام اور مفسرین عالی مقام کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور تعاون کی ضرورت ہے تاکہ یہ اپنے انتہائی مقصد تک پہنچ سکے۔ ہم ہمیشہ اہل نظر اور ارباب معرفت سے اس کام کو مکمل کرنے والے نظریات وآراء کی توقع رکھتے ہیں۔

ہم اس کام میں خداوند بزرگ وبرتر سے زیادہ سے زیادہ توفیق وہدایت طلب کرتے ہیں!

حجج الاسلام عالی جناب محمد رضا آشتیانی، محمد جعفر امامی، عبدالرسول حسنی، محمد اسدی، حسین طوسی، سید شمس الدین روحانی اور محمد محمدی کے تعاون سے!

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارہ

اسلامی تاریخ میں علم کلام، تفسیر اور حدیث کی مباحث میں سے ایک اہم ترین بحث، ولایت اور امامت کا موضوع ہے اور کلی طور پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کے معنوں میں "امامت" کا موضوع ان علوم میں خصوصی طور پر زیر بحث رہا ہے اور اسلام کی پوری تاریخ میں کسی موضوع پر اتنی بحث نہیں ہوئی جتنی اس موضوع پر ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات یہ موضوع، بحث و گفتگو اور استدلال کے میدان سے نکل کر جنگ و جدال کے میدان میں پہنچ گیا اور کئی خونی جنگوں کا سبب بنا اور بعض متکلمین کے بقول:

"ما سُلَّ فِی الاسلامِ سَیفٌ کما سُلَّ فِی الِامامَةِ"

"جتنی تلوار اسلام میں امامت کے مسئلے پر اٹھائی گئی ہے اتنی کسی اور مسئلے پر نہیں اٹھائی گئی۔"

یہی وجہ ہے کہ اسلامی عقائد کے اس موضوع پر بحث نے دیگر موضوعات کی نسبت سب سے زیادہ ترقی اور نشوونما پائی ہے اور سب سے زیادہ کتابیں اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ تحقیق اور دقیق مطالعے کا ذوق رکھنے والے افراد کے لیے اس موضوع پر تمام زاویوں اور پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے؛ اگرچہ ان میں غیر منطقی، فرقہ وارانہ اور متعصّبانہ بحثیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس اہم ترین، حساس اور وسیع موضوع پر بحث کے حوالے سے ہماری ذمہ داری درج ذیل امور کو انجام دینا ہے:

۱۔ منطقی اور اصولی گفتگو کو غیر منطقی گفتگو سے جدا کرنا، مدلل اور تحقیق پر مبنی بحث کو تعصب آمیز بیان سے جدا کرنا اور قرآن، سنت قطعی اور عقلی دلائل کو گفتگو کی بنیاد قرار دینا اور پھر انہیں ترتیب دے کر منظم کرنا۔

۲۔ امامت سے مربوط مسائل اور عنوانات کو ولایت اور رہبریت پر منطبق کرنا جو کہ معصومینؑ کی ولایت الٰہیہ کی فروعات اور شاخیں ہیں۔

۳۔ اس تفسیری بحث میں اس موضوع پر قرآن کی رو سے روشنی ڈالنا ہمارا اصلی مقصود ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ امامت کے موضوع سے مربوط آیات پر بہت زیادہ تحقیق کی جائے اور ان کی دقیق تفسیر بیان کی جائے۔ بعض محققین کے بقول امامت کا مسئلہ صرف ماضی کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ عالم اسلام کے آج کا مسئلہ ہے۔ یہ امامت کی قیادت اور رہبری کا مسئلہ ہے جو کہ نبوت کی بقاء اور استمرار کا عامل اور اسلام کی تقدیر کا مسئلہ ہے۔[1]

بنابراں، ہم اس مسئلہ کے بیان میں سب سے پہلے پورے عالم ہستی کی قیادت و رہبری کو بیان کریں گے۔ پھر عالم انسانیت کی رہبری کا مسئلہ اٹھائیں گے اور اس کے بعد معصوم اماموں کی رہبری اور آخر میں ان کے نائبین کی حکومت اور قیادت پر گفتگو کریں گے۔ لیکن سب سے پہلے چند باتوں کا ذکر ضروری ہے:

---

[1] امامت و رہبری، تالیف آیۃ اللہ شہید مطہری، ص ۱۳۔

۱۔امامت کیا ہے؟

امامت کی تعریف میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف ہونا بھی چاہیے کیونکہ ایک گروہ (مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں اور شیعوں) کے نزدیک امامت اصول دین اور عقیدے کی بنیادوں میں سے ہے جب کہ دوسرے گروہ (اہل سنت) کے نزدیک یہ فروعات دین اور عملی احکامات میں سے شمار ہوتی ہے۔واضح ہے کہ امامت کے مسئلہ کے بارے میں ان دو گروہوں کا نکتہ نظر ایک نہیں ہوسکتا اور نہ ہی امامت کی تعریف میں دونوں متحد ہو سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک سنی عالم امامت کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

"اَلْاِمَامَةُ رِئَاسَةٌ عامةٌ فِي اُمورِ الدِّينِ وَالدُّنيا ،خَلافَةً عَنِ النبّي (ص)"

''امامت، نبی اکرمؐ کے جانشین کے طور پر دین اور دنیا کے امور میں ایک عمومی سر پرستی اور سر براہی ہے۔''[۱]

اس تعریف کے مطابق امامت ،حکومت کی سر براہی کی حد تک ایک ظاہری ذمہ داری ہے البتہ ایک ایسی حکومت جو اسلامی ہے اور رسول اکرمؐ کی جانشینی (حکومت کے مسئلہ میں رسول خداؐ کی نیابت) کے عنوان سے ہے۔طبیعی طور پر ایسا امام لوگوں کی طرف سے منتخب ہوسکتا ہے۔

بعض افراد نے امامت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ امامت کسی شخص کا رسول اللہ ﷺ کے جانشین اور نائب کی حیثیت سے احکام شریعت کو نافذ کرنا اور دین کے امور کی حفاظت کرنا ہے؛اس طرح سے کہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری تمام امت پر واجب ہو[۲] یہ تعریف اول الذکر تعریف سے زیادہ مختلف نہیں ہے، بلکہ اسی مفہوم اور مطلب اور اثرات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ابن خلدون نے بھی اپنے مشہور مقدمہ تاریخ میں مذکورہ معنی کو ہی بیان کیا ہے۔[۳] شیخ مفید اپنی کتاب ''اوائل المقالات'' میں عصمت کی بحث میں یوں بیان کرتے ہیں:

"ان الا ئمة القائمين مقام الا نبيا ء فی تنفيذ الا حكام و اقامة الحدود و حفظ الشر ايع و تاديب الانام معصومون كعصمة الانبياء"

''وہ آئمہ جو احکام کے نفاذ، حدود کے اجرا، شریعت کی حفاظت اور لوگوں کی تربیت میں انبیاؑ کے قائم مقام اور جانشین ہیں وہ انبیاء ہی کی طرح معصوم (گناہ اور خطا سے پاک) ہیں۔''[۴]

---

[۱] شرح تجرید قوشچی ،ص ۴۷۳۔

[۲] (شرح تجرید قدیم) شمس الدین اصفہانی اشعری (بنا بر نقل توضیح المراد تعلیقہ بر شرح تجرید عقائد: تالیف،سید ہاشم حسینی تہرانی ،ص ۶۷۲

[۳] مقدمہ ابن خلدون ،ص ۱۹۱

[۴] اوائل المقالات ،ص ۷۴، چھاپ ،کتبہ الداوری۔

اس تعریف کے مطابق جو کہ مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے عقیدے سے سازگار ہے، امامت لوگوں کی سربراہی اور حکومت سے بالاتر ہے بلکہ (وحی وغیرہ وصول کرنے کے علاوہ) انبیاء کی دیگر تمام ذمہ داریاں، اماموں کے لیے (بھی) ثابت ہیں اور اسی دلیل کی بنیاد پر جس طرح انبیاء کے لیے معصوم ہونا ضروری ہے اسی طرح امام کے لیے بھی معصوم ہونا ضروری ہے۔ (غور کیجیے گا) لہٰذا احقاق الحق کی شرح میں شیعوں کے نزدیک امامت کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

"هِيَ مَنْصَبٌ اِلٰهِي حَائِزٍ لِجَمِيْعِ الشؤون الكريمه والفضائل اِلَّا النبوّة و ما يُلازِمِ تِلْكَ المَرْتَبَةَ السَامِيَةَ"

''امامت ایک الٰہی اور خداداد منصب ہے اس میں نبوت اور اس کے لوازمات کے علاوہ تمام اعلیٰ اور بلند امور اور فضائل شامل ہیں۔''[1]

اس تعریف کی رو سے امام، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ رسولؐ مقرر ہوتا ہے اور (مقام نبوت کے علاوہ) رسولؐ کے تمام فضائل اور خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور اس کا کام صرف اسلامی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے میں منحصر نہیں ہے۔ اس دلیل کی بنا پر امامت اصول دین کا جزء ہے، فروعات دین اور عملی احکام میں سے کوئی ایک فرع یا حکم نہیں ہے۔

۲۔ امامت اصول میں سے ہے یا فروع میں سے؟

گزشتہ بحث کی روشنی میں اس سوال کا جواب واضح ہے۔ کیونکہ امامت کے موضوع میں آراء و نظریات مختلف ہیں، اہل سنت کے متعصب عالم فضل بن روز بھان، جو کہ ''نہج الحق'' کے مصنف ہیں کہ جس کے جواب میں ''احقاق الحق'' لکھی گئی ہے، یوں لکھتے ہیں:

"اِنَّ مَبْحث الامامة عِنْدَ الاشاعرة ليس من اصول الديانات و العقايد بل هي عند الاشاعرة من الفروع المتعلقة بِأَفْعال المكَلَّفِيْنَ۔"

''اشاعرہ کے نزدیک امامت کی بحث عقائد اور دین کے اصولوں میں سے نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اس کا تعلق فروع اور مکلفین کے افعال سے ہے۔[2]

اہل سنت کے دیگر فرقوں کا اس نکتہ نگاہ سے اشاعرہ کے ساتھ کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ سب نے اسے عملی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے جسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ صرف مکتب اہل بیتؑ کے پیروکار شیعوں نے اور اہل سنت کے چند افراد جیسے قاضی بیضاوی اور ان کے

[1] احقاق الحق، ج ۲، ص ۳۰۰

[2] احقاق الحق، ج ۲ ص ۲۹۴، دلائل الصدق، ج ۲، ص ۴۔

بعض پیروکاروں نے امامت کو اصول دین میں سے قرار دیا ہے۔[1]

اس کی دلیل انتہائی واضح ہے کیونکہ شیعوں کے نزدیک امامت ایک منصب الٰہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین ہونا ضروری ہے اور اس کی بنیادی ترین شرائط میں سے ایک شرط امام کا معصوم ہونا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی کی عصمت سے با خبر نہیں ہے۔

بانی شریعت حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کی طرح اماموں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ البتہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ امامیہ، امامت میں اپنے مخالفین کو کافر سمجھتے ہیں بلکہ وہ تمام اسلامی فرقوں کو مسلمان سمجھتے ہیں اور انہیں مسلمان بھائی کے طور پر دیکھتے ہیں؛ اگر چہ وہ امامت کے متعلق ان کے عقیدے کو قبول نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پانچ اصول دین کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے تین اصولوں، یعنی توحید، نبوت اور قیامت کو اصول دین قرار دیتے ہیں اور آئمہ ÷ کی امامت کے عقیدے اور عدل الٰہی کو اصول مذہب قرار دیتے ہیں۔ ہم اپنی بات کو امام علی بن موسیٰ رضا -کی مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے لیے مسئلہ امامت میں ایک الہام بخش حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"اِنَّ الأَمامَةَ زِمامُ الدّينِ وَنِظامُ المُسْلِمينَ وَ صَلاحُ الدُّنيا وَ عِزُّ المؤمنينَ، اِنَّ الأَمامَةَ اُسُّ الاِسْلامِ النّامي وَ فَرعُهُ السّامي، بِالأِمامِ تَمامُ الصَّلاةِ وَ الزَّكاتِ وَ الصِّيامِ وَ الحَجِّ وَ الجِهادِ وَتوفيرُ الفَيئِ وَ الصَّدَقاتِ وَاِمضاءُ الحُدودِ وَ الاَحكامِ وَ مَنْعُ الثُّغُورِ وَ الأطرف. اَلإمامُ يُحِلُّ حَلالَ اللهِ و يُحَرِّمُ حَرامَ اللهِ وَ يُقيمُ حُدُودَ اللهِ وَ يَذُبُّ عَنْ دينِ اللهِ وَ يَدْعو اِلى سَبيلِ رَبِّهِ بِالحِكْمَةِ وَ المَوْعِظَةِ الحَسَنَةِ وَ الحُجَّةِ البالِغَةِ" [2]

''امامت دین کی باگ دوڑ، مسلمانوں کے لیے نظام، دنیا کی اصلاح اور مومنین کی عزت ہے۔ بے شک امامت، رشد ونمو پاتے اسلام کی اساس اور اس کی بلند شاخ ہے۔ امام کے ذریعے نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد کامل ہوتے ہیں؛ بیت المال کے اموال میں اضافہ ہوتا ہے اور ضرورت مندوں پر انفاق اور خرچ فراوان ہوتا ہے۔ احکام کا نفاذ، حدود کا اجراء، اسلامی سرحدوں اور سرحدی علاقوں کی حفاظت، امام ہی کے توسط سے انجام پاتی ہے۔ امام حلال الٰہی کو حلال اور حرام الٰہی کو حرام قرار دیتے ہوئے (ان کا نفاذ کرتا ہے) اور حدود الٰہی کو قائم کرتا ہے، اللہ کے دین کا دفاع کرتا ہے اور اپنے رب کی طرف علم ودانش، بہترین موعظہ اور محکم اور رسا دلیل کے ذریعے دعوت دیتا ہے۔''

---

[1] دلائل الصدق، ج ۲، ص ۸۔

[2] اصول کافی، جلد اول، ص ۳۰۰۔

۳۔ امامت کی بحث کب چھڑی؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آنحضرتؐ کی خلافت پر بحث کا آغاز ہوا۔ ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر نہیں فرمایا اور اس کی ذمہ داری امت کے سپرد کی ہے کہ وہ مل بیٹھ کر اپنے درمیان سے کسی کو اپنا رہبر اور راہنما چن لیں؛ ایسا رہبر جو حکومت کی باگ ڈور سنبھالے اور عوام کے نمائندے کے طور پر لوگوں پر حکمرانی کرے۔ اگرچہ اس طرح کی نمائندگی ہرگز وقوع پذیر نہ ہوئی۔ البتہ اس کے پہلے مرحلے میں صحابہ کے ایک چھوٹے سے گروہ نے خلیفہ کا انتخاب کیا، دوسرے مرحلے میں خلیفہ کو نامزد کیا گیا اور تیسرے مرحلے میں خلیفہ بنانے کی ذمہ داری ایک چھ رکنی شوریٰ (کمیٹی) کے سپرد کی گئی جو سب کے سب نامزد ارکان تھے۔ اس نظریے کے حامل افراد کو اہل سنت کہا جاتا ہے۔

دوسرے گروہ کا نظریہ تھا کہ امام اور خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا چاہیے، کیونکہ اُسے رسول خدا کی طرح گناہ اور غلطی سے پاک اور غیر معمولی علم کا حامل ہونا چاہیے تاکہ وہ امت کی مادی اور معنوی لحاظ سے راہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے، اسلام کی بنیادوں کی حفاظت کر سکے، اسلام کے پیچیدہ مسائل کو واضح طور پر بیان کر سکے، قرآن کے دقائق کی تشریح کر سکے اور اسلام کو دوام عطا کر سکے۔

اس نظریے کے حامیوں کو امامیہ یا شیعہ کہا جاتا ہے اور اس لفظ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور احادیث سے لیا گیا ہے۔ تفسیر ''الدر المنثور''، جو کہ اہل سنت کے مشہور مآخذ میں سے ہے، اس میں قرآن کریم کی آیت ''**أُولٰئِكَ هُمْ خيرُ الْبَرِيّه**'' کی تفسیر میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے یوں نقل ہوا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں:

كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ فَأَقْبَلَ عَلِيٌّ فَقَالَ النَّبِيُّ: وَ الَّذِي نفسي بِيَدِهِ إِنَّ هٰذا و شيعَتَهُ لَهُمُ الفائِزُونَ يَوْمَ الْقِيامَةِ و نَزَلَتْ: "إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُو و عَمِلُو الصَّالِحاتِ أُولٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ." فكانَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِذَا أَقْبَلَ عَلِيٌّ قالُو: "جاءَ خَيْرُ الْبَرِيَّه."

''ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے کہ اتنے میں علیؑ ہمارے پاس تشریف لائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک یہ اور ان کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب ہوں گے۔'' اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی: ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیے، وہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں۔'' اس کے بعد جب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی محفل میں علیؑ تشریف لاتے تو صحابہ کہتے: ''خدا کی بہترین مخلوق آ گئی۔''[1]

---

[1] الدر المنثور، جلد ۶، صفحہ ۳۷۹۔

اس بات کو پانچویں صدی ہجری کے اہل سنت کے ایک مشہور عالم حاکم نیشاپوری نے اپنی شہرت یافتہ کتاب ''شواہد التنزیل'' میں مختلف حوالوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے اور اس کی احادیث کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک روایت انہوں نے ابن عباس سے بیان کی ہے کہ جب آیت: ''اِنَّ الّذِینَ آمَنُو وعَمِلُو الصَّالِحَاتِ اُولئِكَ هُم خیر البَرِیَّة'' نازل ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ سے فرمایا: ''هُوَ اَنْتَ وَشِیْعَتُكَ...'' یعنی: ''اس سے مراد آپ اور آپ کے شیعہ ہیں۔''[1] ایک اور حدیث میں ابو برزہ سے منقول ہے کہ جب آنحضرتؐ نے اس آیت کی تلاوت کی تو فرمایا: ''هُمْ اَنْتَ وشِیْعَتُكَ یا علیّ'' یعنی: ''یا علی! وہ آپ اور آپ کے شیعہ ہیں۔''[2] بہت سے دیگر علمائے اسلام اور علمائے اہل سنت جیسے ابن حجر نے اپنی کتاب صواعق میں اور محمد شبلنجی نے نور الابصار میں مذکورہ حدیث کو ذکر کیا ہے۔[3]

ان احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت علیؑ کے پیروکاروں اور طرف داروں کے لیے شیعہ کا نام اور عنوان، خود رسول اللہؐ نے انتخاب کیا ہے، اس کے باوجود کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ بعض افراد اس نام اور عنوان سے چڑھتے ہیں اور برا سمجھتے ہیں اور اس لفظ کے شروع میں حرف ''شین'' سے شر جیسے غلط معنی مراد لیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ ایک ایسے محقق کے لیے حیران کن ہیں جو ہمیشہ منطقی دلائل کی روشنی میں سفر کرتا ہے جب کہ معلوم ہے کہ حروف تہجی میں سے ہر حرف بلا استثنا اچھے اور بُرے سب معانی اور کلمات کیلئے انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

پس شیعہ کے وجود میں آنے کی تاریخ کا آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد نہیں، بلکہ ایک معنی میں خود آنحضرتؐ کی زندگی میں ہوا ہے اور اس لفظ کو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کے پیروکاروں اور دوستوں کے لیے استعمال کیا ہے اور جو شخص بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مرضی اور خواہشات کو بنیاد بنا کر کچھ نہیں بولتے تھے: ''وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَویٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُوحٰی''۔ پس اگر انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اے علیؑ آپ اور آپ کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب اور سعادت مند ہوں گے تو یہ ایک حقیقت ہے۔

۴۔ امام کا لفظ لغت اور قرآن میں

جیسا کہ اہل لغت نے کہا ہے ''امام'' کا لفظ ''کتاب'' کے وزن پر ہے اور یہ اسم مصدر ہے اور ہر اُس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کی طرف انسان توجہ کرے اور وہ اس کا ہدف قرار پائے۔ یہ لفظ اپنے مختلف استعمالات، مختلف پہلوؤں اور کیفیات کے اعتبار سے

---

[1] شواہد التنزیل، ج ۲۸، ص ۳۵۷

[2] شواہد التنزیل، ج ۲۸، ص ۳۵۷

[3] الصواعق، ص ۹۶، نور الابصار، ص ۷۰، ۱۰۱۔ اس حدیث کے روایوں اور جن کتابوں میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے ان کے بارے میں مزید معلومات کیلئے دیکھیں: احقاق الحق، ج ۳، صفحہ ۲۸۷ کے بعد اور ج ۱۴، صفحہ ۲۵۸۔

مختلف معانی دیتا ہے۔امام جمعہ،امام جماعت، ہدایت کا امام اور گمراہی وضلالت کا امام وغیرہ،اس لفظ کے مختلف استعمالات ہیں۔[1]

یہ لفظ اصل میں ''اَمّ'' کے مادہ سے ہے اور ارادہ اور قصد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ ''اُمّ'' کا معنی جڑ، سرچشمہ، جماعت اور دین ہے اور امام ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی اقتداء اور پیروی کی جائے اور وہ اعمال وافعال میں پیشوا ہو۔ امام ''آگے'' کے معنی میں بھی آیا ہے۔

''لسان العرب'' میں امام کے لفظ کے کئی معانی ذکر ہوئے ہیں۔ جیسے پیشوا، معلم، شاقول (معماری کا وہ آلہ جس کے ذریعے معمار دیوار کی سیدھ دیکھتے ہیں)، راستہ اور اگلا حصہ وغیرہ۔لیکن ہماری دانست کے مطابق، جیسا کہ ''التحقیق'' کے مصنف نے بھی قبول کیا ہے، ان تمام معانی کی بنیاد، وہی خاص توجہ کے ساتھ کسی چیز کا قصد کرنا ہے۔اور اگر ماں کو اُمّ کہتے ہیں یا ہر چیز کی اصل اور بنیاد پر اُمّ کا لفظ اطلاق ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان ان چیزوں کا قصد کرتا ہے اور یہ چیزیں انسان کا مقصود ہوتی ہیں اور اس کی توجہ کا باعث بنتی ہیں۔اسی طرح امام کو اس لیے امام کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کی اقتداء کرتے ہیں اور اس کے پاس خاص توجہ اور قصد وارادے کے ساتھ آتے ہیں۔

یہاں اس نکتہ کو یاددلانا بھی ضروری ہے کہ امام کا لفظ اور اس کی جمع ''آئمہ'' ٹھیک بارہ مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے!(سات مرتبہ مفرد صورت میں اور پانچ مرتبہ جمع کی صورت میں) ایک مقام پر یہ لفظ لوح محفوظ کے معنی میں آیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿١٢﴾

''ہم نے ہر چیز کو امام مبین (لوح محفوظ) میں جمع کر دیا ہے''(یٰس/۱۲)

یہاں لوح محفوظ کو ''امام'' قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ لوح محفوظ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال کی قدر وقیمت پرکھنے کے لیے فرشتوں کے لیے رہبر اور رہنما ہے اور سب اس سے الہام اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔امام کا لفظ ایک اور جگہ پر قرآن میں راستے اور جادہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾

''قوم لوط اور قوم شعیب کے دونوں تباہ شدہ شہر تمہارے (شام کی طرف) راستے پر واضح ہیں''(حجر/۷۹)

اس آیت میں راستے کو ''امام'' قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے راستوں کو مدنظر رکھتے ہیں۔
امام کا لفظ دو مرتبہ توریت کے لیے استعمال ہوا ہے جو کہ یہودیوں کے لیے رہنما اور پیشوا تھی۔چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ

''اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب ان کے لیے پیشوا اور رحمت تھی''(احقاف/۱۲؛ ہود/۱۷)

پانچ جگہوں پر امام کا لفظ صالح اور الٰہی پیشواؤں اور راہنماؤں پر بولا گیا ہے۔جیسے:

---

[1] التحقیق، مادہ اُمّ

قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

اللہ تعالٰی نے (ابراہیم سے) فرمایا: میں نے تمھیں لوگوں کے لیے امام اور پیشوا قرار دیا ہے۔

(بقرہ/ ۱۲۴)

ایک اور مقام پر چند انبیاء ورسل کو امام کہا گیا ہے:

وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَٮِٕمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا

''اور ہم نے انہیں امام اور پیشوا قرار دیا جو ہمارے امر سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے'' (انبیاء/ ۷۳)

یہی جامع اور کلی مفہوم سورہ فرقان کی آیت/ ۷۴، قصص کی آیت/ ۵ اور سورہ سجدہ کی آیت/ ۲۴ میں بھی آیا ہے۔ ایک جگہ پر یہ لفظ کفر اور ضلالت کے پیشواؤں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے:

فَقَاتِلُوۡۤا اَٮِٕمَّةَ الۡكُفۡرِ ۙ

''پس کفر کے اماموں سے جنگ کرو'' (توبہ/ ۱۲)

ایک اور مقام پر یہ لفظ ہدایت اور گمراہی دونوں کے اماموں کیلئے جامع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوا:

يَوۡمَ نَدۡعُوۡا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمۡ ۚ

''اس دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے (بنی اسرائیل/ ۷۱)

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں امام کا لفظ فقط بارہ مختلف موارد میں استعمال ہوا ہے۔

۵۔ قرآن مجید میں امامت کے مقام کی عظمت

جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے امامت اور رہبریت کا موضوع صرف ایک دینی اور تشریعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی وسعتوں نے تمام کائنات اور عالم تکوین کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ خداوند بزرگ و برتر عالم ہستی اور اس کے مختلف مجموعوں کا امام ہے۔ وہ ان سب کی ہدایت و رہنمائی اور تدبیر فرماتا ہے۔ خداوند تعالی قرآن مجید بھی امامت کو خاص اہمیت دیتا ہے اور اسے انسان کے ارتقائی سفر کا آخری مرحلہ قرار دیتا ہے جس پر صرف اولوالعزم پیغمبر فائز ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت/ ۱۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذِ ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم کو ان کے رب نے مختلف کلمات سے آزمایا اور وہ ان آزمائشوں پر پورے اترے تو ارشاد ہوا: میں تمھیں لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: میری اولاد سے (بھی امام قرار دے) اللہ نے فرمایا: میرا عہد (یعنی امامت) ہرگز ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ (تیری اولاد سے

صرف وہ افراد اس مقام ومنصب کے اہل ہوں گے جو پاکیزہ اور معصوم ہوں گے۔)''

اس آیت میں پہلے تو بطور مجمل ارشاد ہوا کہ ''اس وقت کو یاد کریں جب پروردگار نے ابراہیم کو کلمات سے آزمایا۔'' یہ کلمات کیا تھے اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے اور تفسیر ''روح المعانی'' کے مطابق اس کے متعلق تیرہ اقوال ذکر کیے گئے ہیں۔[۱]

لیکن جو بات زیادہ صحیح نظر آتی ہیں وہ یہ ہے کہ ان کلمات سے مراد وہی مختلف ''اوامر اور نواھی'' تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے کاندھوں پر بھاری اور مشکل فرائض کی صورت میں عائد ہوئے تھے تا کہ امتحان کی کٹھالی میں ان کی خوب آزمائش ہو اور وہ بت پرستوں کے خلاف جراتمندی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں۔ بتوں کو توڑنا، آتش نمرود میں ڈالے جانا اور ان تمام مراحل میں ثابت قدمی دکھانا تھا۔ اسی طرح اپنے لخت جگر کو قربان کرنے کے لیے تیار ہونا، اُسے قربان گاہ تک لے جانا اور اس کے گلے پر چھری رکھنا، نیز اپنے بیٹے اور بیوی کو اپنے سے جدا کر کے مکہ کی خشک اور جلا دینے والی سرزمین پر چھوڑنا اور وہ بھی اس وقت جب کوئی آدم زاد وہاں نہیں رہتا تھا۔ اور آخر کار بت پرستوں کی سرزمین سے ہجرت کرنا، اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے کاروبار زندگی کو ٹھکرا دینا، سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک سخت اور سنگین آزمائش تھی۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ ایمان اور صبر و استقامت کی طاقت سے ان تمام امتحانات میں کامیاب اور سرخرو ہوئے۔

بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم کے امتحانی نصاب کے تیس سے زائد موضوعات کو شمار کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ قرآن کی تین سورتوں میں یہ تیس موضوعات ذکر کیے گئے ہیں۔ سورہ توبہ کی آیت ۱۱۲ میں (دس چیزوں کا ذکر ہوا ہے) سورہ احزاب کی آیت ۳۵ میں (دس چیزوں کا ذکر ہوا ہے) اور سورہ مومنون کی ایک سے نو تک کی آیات میں بھی دس چیزیں بیان ہوئی ہیں۔ یوں مجموعی طور پر تیس اوصاف یا تیس امتحانی موضوعات بن جاتے ہیں۔[۲]

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ ان میں سے بہت سے اوصاف یا اشیاء مکرر بیان ہوئی ہیں، اس لحاظ سے ان کی تعداد تیس تک نہیں پہنچتی۔ لہٰذا یہ قول زیادہ قابل قبول نہیں ہے۔ بہر حال عظیم بت شکن مخلص اور ایثار و قربانی کا مجسمہ پیغمبر، حضرت ابراہیمؑ ان تمام سخت اور بھاری امتحانوں میں کامیاب و کامران ہوا تو اس موقعہ پر امامت کا لباس ان کے زیب تن کرنے کے لیے موزوں سمجھا گیا اور اللہ و تبارک وتعالیٰ نے اِس خطاب کے ذریعے یہ افتخار اور اعزاز انہیں بخشا اور فرمایا:

اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

''میں نے تمہیں لوگوں کا امام اور پیشوا بنایا ہے۔''

یہ کون سا مقام اور مرتبہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کو نبوت و رسالت کے مرتبے اور ان تمام کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد آخری عمر

---

[۱] روح المعانی، ج اول، ص ۳۷۲

[۲] روح المعانی، ج اول، ص ۳۷۵۔ بعض مفسرین نے یہاں سورہ سئل سائل (معارج) کا بھی اضافہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کلمات قرآن بھی چار سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔

میں عطا کیا گیا؟ یقینا یہ ان تمام مقامات سے اعلیٰ اور بلند ترین مرتبہ تھا! جسے حضرت ابراہیمؑ ان سب امتحانات کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے دریافت کرنے کے قابل ہوئے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو امامت کا جو منصب ملا اس سے کونسا منصب مراد ہے؟

تو یہاں امامت کی تفسیر میں مفسرین نے بہت زیادہ بحث کی ہے چونکہ ان میں سے بعض نہ چاہنے اور بعض نہ جاننے کی وجہ سے اس لفظ کے اعلیٰ معنی کی تہہ تک نہ پہنچ سکے، لہٰذا وہ عجیب وغریب سرگرادنی میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ چند مفسرین نے یہاں امامت کی تفسیر نبوت سے کی ہے؛ حالانکہ یقینا اس وقت حضرت ابراہیمؑ پیغمبر تھے اور ان کی نبوت ورسالت کے کئی سال گزر چکے تھے اور آپ صاحب اولاد ہو چکے تھے اور آیت کے درمیان میں انہوں نے اپنے بیٹوں اور نسل کے لیے امامت کے عہدے کا تقاضا بھی کیا

بہت سارے مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو جن کلمات کے ذریعے آزمایا وہ ان تعلیمات کا ایک مجموعہ تھا جو انہوں نے خداوند تعالیٰ کی طرف سے دریافت کی تھیں، یا پھر وہ کلمات بت پرستوں کے خلاف قیام، خانہ کعبہ کی تعمیر اور بیٹے کی قربانی تھے ۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے امامت کو نبوت کے معنی میں لیا ہے، جب کہ یہ تمام احکامات اور یہ تمام ایثار وقربانی کے واقعات حضرت ابراہیمؑ کے منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد وقوع پذیر ہوئے۔ لہٰذا ان مفسرین کے کلام میں: ''اِنّی جاعِلُكَ للنّاس اماماً'' کے اس جملے کی یہ تفسیر ناقابل فہم ہے۔

امامت کا ایک اور معنی جو بیان کیا گیا ہے وہ ''واجب الاطاعت'' ہونا ہے، جبکہ ہر پیغمبر اور نبی واجب الاطاعت ہے یعنی اس کی اطاعت واجب ہے اور اُسے (نبوت کے علاوہ) کسی اور منصب پر فائز ہونے کی ضرورت نہیں ہے [1] بعض نے امامت کا ایک تیسرا معنی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد، دین ودنیا کے امور میں سربراہی اور حاکمیت ہے۔ باالفاظ دیگر حکمران ہونا مراد ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر پہلی دو سے بہتر ہے لیکن پھر بھی امامت کے معنی کی گہرائی کو واضح نہیں کرتی۔ قرآن مجید کی دیگر آیات جو امامت کے مسئلہ کو بیان کرتی ہیں، ان کی روشنی میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت میں امامت سے مراد، وہ سب سے اعلیٰ وارفع اور بلند مقام ہے اور وہ الٰہی پروگرام اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ہے جو کہ حکومت، الٰہی احکام کے نفاذ اور نفس انسانی کی ظاہری اور باطنی تربیت اور نشوونما جیسے سب امور کو شامل ہے۔

اس امر کی وضاحت یہ ہے کہ انبیاء کی بعثت اور رسولوں کے بھیجنے کا ہدف انسانی معاشرہ کی ہدایت ہے اور یہ ہدایت دو طرح سے انجام پاتی ہے۔ ایک ''اراۂ طریق'' یعنی راستہ دکھانے کے معنی میں۔ یعنی وہی کام جو انبیاء الٰہی میں سے ہر ایک کا فریضہ اور ذمہ داری تھا۔ اور دوسری ''ایصال بہ مطلوب'' یعنی مطلوب ومقصود تک پہنچانا۔ کہ ایسی ہدایت کی پھر آگے دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ہدایت تشریعی اور دینی تعلیمات اور نظام کو علمی جامہ پہنانا؛ خواہ یہ حکومت تشکیل دینے کے ذریعے، حدود اور احکام الٰہی کے نفاذ اور عدالت اجتماعی کے قائم کرنے سے ہو یا پھر عملی طور پر انسانوں کی تربیت اور پرورش کے ذریعے سے ہو۔ یہ دونوں چیزیں پیغمبروں کے مقاصد اور اہداف کے حصول کے عوامل ہیں۔ ہدایت کا یہ عمل انتہائی مشکل، سخت اور علم وتقویٰ، شجاعت اور انتظامی صلاحیتوں

---

[1] تفسیر روح البیان نے ابراہیم کی دس معروف عادات اور کشاف اور مراغی نے اوامر ونواہی اور قرطبی اور المنار نے ان اوامر کا ایک مجموعہ بیان کیا ہے۔

جیسی بہت زیادہ خصوصیات کے حامل ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

دوسری قسم: ہدایت تکوینی ہے اور اس سے مراد معنوی اور روحانی نفوذ اور اثر ڈالنے کے ذریعے اور آمادگی رکھنے والے انسانوں کے دلوں میں ہدایت کی شمع روشن کر کے اُنہیں منزل مقصود تک پہنچانا ہے۔ یہ ایک باطنی اور معنوی سفر ہے اور یہ اُس سفر سے مختلف ہے جو عظیم پیغمبروں اور الٰہی پیشواؤں کے پیروکاروں کے حوالے سے ظاہری اور بیرونی لحاظ سے تھا۔ یقیناً ہدایت کے اس عمل کے لیے بہت زیادہ صفات اور خصوصیات، نیز بیشتر آمادگی کی ضرورت ہے۔

ہدایت کی ان دونوں اقسام کے میسر ہونے سے مذہب کے مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کے مقررہ اہداف پورے ہوتے ہیں اور آمادگی رکھنے والے انسان مادی و معنوی اور ظاہری و باطنی کمال تک پہنچتے ہیں اور کمال تک پہنچتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں امامت سے مراد یہی ہے۔ جب تک حضرت ابراہیم کو ان تمام صلاحیتوں اور خصوصی صفات کے حوالے سے آزمانہیں لیا گیا، انہیں اس مقام و منصب کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ کئی مقامات پر امامت اور نبوت کا منصب اکٹھے ہو جاتے ہیں اور حضرت ابراہیم جیسے اولوالعزم پیغمبر، منصب امامت پر بھی فائز ہوتے ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر خود حضرت رسول اکرم ﷺ کی ذات ہے کہ جن میں نبوت، رسالت اور امامت جمع ہو گئی تھیں۔

یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ امامت، نبوت اور رسالت ایک دوسے سے الگ الگ ہوں۔ جیسا کہ بارہ معصومین، امام ہیں جن کا فریضہ فقط امامت تھا لیکن ان پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی اور وہ نبی یا رسول نہیں تھے۔ بہرصورت مذکورہ آیت کے ابتدائی جملے ''قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ'' سے امامت کے مقام و مرتبہ کی عظمت اور امام کا اللہ کی طرف سے منسوب ہونا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔ اور آیت کا درمیانی جملہ: ''قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ'' مذکورہ مطلب پر اور زیادہ تاکید کرتا ہے۔ کیونکہ جب حضرت ابراہیمؑ اس منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے درخواست کی کہ پروردگار! امامت کو میری نسل میں بھی قرار دے۔

اس وقت خطاب ہوا کہ میرا یہ عہد (امامت و ولایت) ہرگز ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ یعنی تمہاری اولاد میں سے فقط وہ افراد اس منصب کے لائق اور اہل ہوں گے جو ہر قسم کے ظلم سے پاک اور معصوم ہوں گے: ''قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جملے میں ظلم سے مراد، فقط دوسروں پر ستم نہیں، بلکہ یہاں ظلم اپنے وسیع معنوں میں مراد ہے جو کہ عدل کا متضاد ہے۔ عدل کا وسیع معنی ہر چیز کو اس کے اپنے مقام پر رکھنا ہے اور ظلم کسی چیز کو نامناسب جگہ پر رکھنا ہے۔ اس لیے قرآن مجید حضرت لقمان کی زبانی بیان فرماتا ہے کہ وہ اپنے فرزند سے کہتے ہیں:

يٰبُنَىَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۳﴾

''اے میرے بیٹے! کسی کو اللہ کے ساتھ شریک قرار نہ دو؛ بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

(لقمان۔ ۱۳)

یہ بات بھی انتہائی واضح ہے کہ یہاں پر عدل سے مراد ہر لحاظ سے مکمل عادل ہونا یا دوسرے الفاظ میں عصمت کا مرتبہ مراد ہے جو امامت کے ساتھ موزوں اور ہم آہنگ ہے ورنہ وہ عدالت جو برقرار نہ رہے یا گناہ سے مخلوط ہو وہ کبھی بھی امامت کے مذکورہ معنی میں اس مقام و منصب سے سازگار نہیں ہے۔ بنابریں، مذکورہ آیت سے امام کے معصوم ہونے پر بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عادل ہونے کا مطلب ساری عمر ہر قسم کے گناہوں کا ترک کرنا ہے یا جب امامت کے منصب پر فائز ہو فقط اس وقت گناہوں کو ترک کرنا کافی ہے؟

علم اصول میں ایک بحث ہے کہ مشتق کا ''مَنْ تَلَبَّسَ بِالْمَبْدَءِ'' میں استعمال حقیقت ہوتا ہے۔ (اس کی وضاحت یہ ہے کہ صفات میں سے ہر صفت کو جب کسی فرد سے نسبت دی جاتی ہے تو ضروری ہے کہ اُس نسبت کی حالت میں وہ صفت اس شخص میں موجود ہو۔ مثلاً قائم (کھڑا) اُسے کہا جاتا ہے جو اس وقت واقعاً کھڑا ہو جب اس کی طرف قائم یا کھڑا ہونے کی نسبت دی جارہی ہے۔ لہٰذا جو شخص پہلے کھڑا تھا اور اب بیٹھا ہے، اُسے ''قائم'' کہنا حقیقت نہیں ہے۔) اس بحث کے پیش نظر بعض افراد کا نظریہ ہے کہ امامت کے دوران، امام میں ظلم کی صفت نہ ہو؛ نہ وہ مشرک ہو اور نہ گناہگار اور نہ ہی کسی اور معصیت میں مبتلا ہو۔ لہٰذا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام کیلئے اس کی امامت سے پہلے کی زندگی میں عادل ہونا اور عصمت ضروری نہیں ہے۔

لیکن ہم احادیث میں دیکھتے ہیں کہ آئمہ اہل بیتؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں اس آیت سے امام کے عمر بھر عادل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ جناب عبداللہ بن مسعود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا:

لَا أُعْطِيكَ عَهْداً لِلظَّالِمِ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ"

''میں (امامت کا) عہد تیری اولاد میں سے انہیں عطا نہیں کروں گا جو ظالم ہوں گے۔''

"قَالَ يَا رَبِّ وَمَنِ الظَّالِمُ مِنْ وُلْدِي الَّذِي لَا يَنَالُ عَهْدَكَ؟"

''حضرت ابراہیم نے عرض کی: اے میرے رب! میری اولاد میں سے کون ہیں وہ ظالم جن تک تیرا یہ عہد (امامت) نہیں پہنچے گا؟''

ارشاد ہوا:

"قَالَ مَنْ سَجَدَ لِصَنَمٍ مِنْ دُونِي لَا أَجْعَلُهُ إِمَاماً أَبَداً وَلَا يَصْلَحُ أَنْ يَكُونَ إِمَاماً"

''(جواب میں) فرمایا: جس کسی نے میرے سوا کسی بت کو سجدہ کیا ہوگا اُسے میں کبھی بھی امام نہیں بناؤں گا اور بت کو سجدہ کرنے والا امام بننے کے لائق نہیں ہے۔''[۱]

اس مطلب کو اہل سنت کے جید عالم دین، ابن مغازلی نے اپنی کتاب ''مناقب'' میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ ''ابن مسعود'' کے ذریعے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ

[۱] امالی شیخ مفید (تفسیر برہان جلد ۱، ص ۱۵۱، حدیث ۱۳ کے مطابق)

تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے فرمایا: ''مَنْ سَجَدَ لِصَنَمٍ مِنْ دُونِی لَا اَجْعَلُهُ اِمَاماً''، یعنی: ''جو شخص میرے سوا کسی بت کو سجدہ کرے گا میں اُسے امام نہیں بناؤں گا۔'' اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا: ''آخرکار حضرت ابراہیم کی دعا کا اثر میرے اور میرے بھائی علیؑ پر ہوا اور ہم میں سے کسی نے بھی کسی بت کے سامنے پیشانی نہیں جھکائی۔''[۱]

اس بارے میں اور بھی روایات آئمہ اہل بیتؑ کے سے معتبر کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ درحقیقت ان تمام روایات میں ایک ہی نکتہ موجود ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ اس بات سے دوسروں سے زیادہ آگاہی اور بصیرت رکھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان افراد کے لیے امامت کی دعا کریں جو مشرک ہوں یا ظلم وستم میں مشغول رہے ہوں۔ اس حالت میں انہیں یہ جواب دینے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ عنایت اور عطا ظالموں کو شامل نہیں ہوگی؛ کیونکہ یہ انتہائی واضح بات ہے۔ لہٰذا اگر اُنہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی دعا میں امامت طلب کی ہے تو یقیناً ان افراد کے لیے کی ہے جو کسی کچھ عرصہ ظالم یا مشرک رہے، پھر توبہ کر لی اور عادل بن گئے۔ اسی حوالے سے انہوں نے یہ جواب سنا کہ عہدہ امامت ایسے افراد کو نہیں ملے گا۔ یعنی ان میں کسی قسم کا ظلم اور شرک کا سابقہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے مشہور مفسر، علامہ طباطبائی اپنی تفسیر ''المیزان فی تفسیر القرآن'' میں لکھتے ہیں:

یہ آیت امام کے (تمام عمر) معصوم ہونے کی ضرورت پر کس طرح دلالت کرتی ہے؟ جب یہ سوال ہمارے ایک استاد سے ہوا تو انہوں نے اس کا یوں جواب دیا کہ حضرت ابراہیم- کی اولاد کی ایک عقلی اور منطقی تقسیم کے لحاظ سے چار قسمیں بنتی ہیں:

۱۔ وہ لوگ جو ساری زندگی ظالم اور گناہگار رہے۔

۲۔ وہ لوگ جن کی تمام زندگی ہر قسم کے ظلم اور گناہ سے پاک رہی۔

۳۔ وہ لوگ جو اپنی عمر کے پہلے حصے میں تو ظالم اور گناہگار تھے لیکن آخری حصے میں نہیں۔

۴۔ اوپر کے برعکس، یعنی وہ لوگ جو پہلے تو عادل اور معصوم تھے لیکن بعد میں ظالم اور گناہگار بن گئے۔

یقیناً حضرت ابراہیمؑ کا مقام ومرتبہ اس سے بلند وبرتر ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد میں سے پہلی اور چوتھی قسم کے لیے امامت کا مطالبہ کیا ہو۔ اس لیے باقی دو قسمیں بچ جاتی ہیں۔ یقیناً حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے ان دو قسموں کے لوگوں کیلئے امامت کا منصب مانگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دو قسموں میں سے ایک قسم (وہ لوگ جو زندگی کے پہلے حصے میں ظالم اور گناہگار تھے پھر نیک اور عادل بن گئے) کیلئے اس منصب کے دیے جانے کی نفی فرمادی۔ لہٰذا حضرت ابراہیم - کی اولاد میں سے امامت کے لائق، صرف ایک ہی قسم باقی رہ جاتی ہے اور وہ ان افراد کی ہے جو ساری زندگی ہر قسم کے ظلم وگناہ (شرک) سے پاک وپاکیزہ رہے ہوں۔[۲] (غور فرمائیے)

فخر رازی اپنی تفسیر میں اس حد تک تو اعتراف کرتے ہیں کہ یہ آیت پیغمبروں کے معصوم ہونے پر دلالت کرتی ہے اور دلچسپ

---

[۱] مناقب ابن المغازلی (تفسیر المیزان ج۱، ص ۲۷۸، کے نقل کے مطابق)

[۲] المیزان، جلد ۲، ص ۲۷۴۔

بات تو یہ ہے کہ وہ اسی امر کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کرتا ہے کہ امام کو لازمی طور پر معصوم ہونا چاہیے اور یہ کہ ہر پیغمبر امام ہوتا ہے۔[1] (غور کیجیے گا)

البتہ اس آیت سے امامت کے متعلق، امام کے معصوم ہونے اور امام کے منصوص من اللہ ہونے کے علاوہ دیگر نکات بھی ثابت ہوتے ہیں جن پر گفتگو کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال، اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے قرآن مجید کی روشنی میں امامت کی عظمت وجلالت اجاگر ہوجاتی ہے اور یہاں پر ہمارا مقصد اسی نکتے کو بیان کرنا ہی تھا۔

۶۔ امام کے وجود کا رمز وراز

اگرچہ گزشتہ گفتگو میں حضرت ابراہیمؑ کی امامت سے متعلق آیت سے امام کے وجود کا فلسفہ اجمالی طور پر واضح ہوا ہے لیکن اس موضوع کی اہمیت کی پیش نظر ضروری ہے کہ اسے جداگانہ پر زیر بحث لایا جائے۔ یہاں بطور کلی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت ساری باتیں جو انبیاء کی بعثت کے مقاصد یا ان کے وجود کی ضرورت کے حوالے سے کہی جاتی ہیں وہ بعینہ امام کے وجود کے لیے بھی ثابت ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں انہی دلائل کی بنیاد پر امام کا وجود بھی ضروری ہے۔

خواجہ نصیر الدین طوسی (قدس سرہ) نے اپنی کتاب ''تجرید الاعتقاد'' میں نبوت کی فصل میں انبیاء کی بعثت کے فلسفہ کو بیان کیا ہے اور علامہ حلّی جیسی بزرگ ہستی نے اس کی شرح میں بعثت کے مجموعاً نو مقاصد کی طرف اشارہ کیا ہے جنہیں ہم یہاں قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ان مقاصد میں کافی باتیں امام کے بارے میں بھی درست ہیں۔

۱۔ نقلی بیان کے ذریعے عقلی معرفت کی تقویت، ان معنوں میں کہ انسان عقل کی قوت سے دین کے بہت سارے حقائق، خواہ ان کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے، سمجھ پاتا ہے۔ لیکن گاہے بگاہے اس کے دل میں وسوسے اور شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں اور یہی شکوک و شبہات، ان حقائق پر اعتماد اور ان پر عمل کرنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن جب ان عقلی باتوں کی تائید اور تصدیق معصوم پیشواؤں کی زبانی ہوتی ہے تو پھر ہر قسم کے وسوسے اور شکوک وشبہات دور ہوجاتے ہیں اور انسان پوری قوت کے ساتھ انہیں انجام دینے لگتا ہے۔

۲۔ کبھی انسان بعض کاموں کو انجام دینے سے ڈرتا ہے، اس لیے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے برخلاف اس کی حاکمیت میں دخل اندازی نہ کر بیٹھے، الٰہی پیشواؤں کے بیان سے یہ خوف اور ڈر جاتا رہتا ہے۔

۳۔ انسان کے تمام اعمال ''حسن وقبح عقلی'' کے دائرے میں نہیں آتے، بہت سارے امور ایسے ہیں کہ انسانی عقل ان کے حسن وقبح کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہاں پر الٰہی نمائندوں کے دامن سے وابستہ ہونا پڑے گا اور ان اعمال کی اچھائی یا برائی کو سمجھنا ہوگا۔

۴۔ بعض چیزیں مفید ہیں اور بعض نقصان دہ، انسان صرف اپنی عقل وفکر کے ذریعے اور الٰہی ہادیوں کے بغیر ان کے نفع اور نقصان کو نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا یہاں پر اُسے انبیاء الٰہی کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

۵۔ انسان ایک معاشرتی اور اجتماعی مخلوق ہے، وہ دوسروں کے تعاون اور مدد کے بغیر اپنی زندگی کی مشکلات اور مسائل کو حل نہیں کرسکتا اور یہ

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۴، ص ۴۳۔

بات بھی مسلم ہے کہ کوئی بھی معاشرہ ایسے قوانین کے بغیر قائم اور ترقی نہیں کر سکتا جن میں تمام افراد کے حقوق کی ضمانت نہ ہو اور وہ انہیں صحیح سمت میں نہ لے جائیں۔ ایسے قوانین کی صحیح طور پر تشخیص اور پھر ان پر عمل درآمد آگاہ، معصوم اور پاکیزہ افراد کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۶۔ کمالات تک پہنچنے، فضائل کے حصول اور علوم و معارف کے سیکھنے میں انسانوں کی سطح مختلف ہے اور سب برابر نہیں ہیں۔ بعض اس راستے پر چلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض اس راستے پر چلنے سے عاجز و ناتواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نمائندے اور ہادی پہلی قسم کے انسانوں کو تقویت پہنچاتے ہیں اور دوسری قسم کے افراد کی مدد کرتے ہیں تاکہ دونوں قسم کے افراد ممکنہ کمال اور ترقی تک پہنچ سکیں۔

۷۔ بنی نوع انسان کو وسائل و ذرائع، ٹیکنالوجی اور علوم و فنون کی ضرورت ہے۔ ہادیانِ برحق اس ہدف کے حصول میں انسانوں کے لیے محرک اور ان کے موجد اور بانی بن سکتے ہیں۔

۸۔ اخلاقی اعتبار سے انسانوں کے مختلف درجات ہیں۔ ان اخلاقی فضائل کو پروان چڑھانے کے لیے راہ حل صرف ایک ہے اور وہ ہے معصوم، پاک و پاکیزہ اور الٰہی رہبروں کا موجود ہونا اور ان کی راہنمائی۔

۹۔ الٰہی رہبرو رہنما، اطاعت و گناہ کے طور پر الٰہی جزا و سزا اور ثواب و عذاب سے مکمل آگاہی اور علم رکھتے ہیں۔ جب وہ دوسروں کو ان امور سے آگاہ کریں گے تو فرائض و واجبات کی ادائیگی کے لیے ان کے اندر ایک طاقتور محرک پیدا ہو جائے گا۔[1]

اب چونکہ امامت، نبوت ہی کا تسلسل ہے، لہٰذا اوپر بیان شدہ انبیاء کی بعثت کے مقاصد میں سے اکثر مقاصد، آئمہ معصومین ÷ کے لیے بھی ثابت ہیں۔ (لہٰذا اگر انبیاء کی بعثت ضروری ہے تو معصوم اماموں کی موجودگی بھی ضروری ہے۔)

قرآن مجید میں ان امور کو بلکہ ان سے بھی بالاتر چیزوں کو تین موضوعات میں بطور خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تین موضوعات عبارت ہیں: تعلیم، تربیت اور عدل و انصاف کے قیام سے۔ بہت سی آیات میں ان تین موضوعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد کے طور پر ان تینوں کو یکجا بیان کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍۙ‏ ﴿۲﴾ (جمعہ۔۲)

''وہ وہی ذات ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے؛ جب کہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔''

مذکورہ آیت میں انبیا ÷ اور آئمہ معصومینؑ کے وجود کا اہم ترین مقصد ''تعلیم و تربیت'' ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن ایک اور آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] شرح تجرید، صفحہ ۲۷۱ (بطور خلاصہ)

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ

''تحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (حق اور باطل کے درمیان تمیز اور عادلانہ قوانین) کو نازل کیا تا کہ لوگ عدل قائم کریں۔'' (حدید/ ۲۵)

اس آیت میں معاشرتی عدل وانصاف کے قیام کو بیان کیا گیا ہے جو دراصل صحیح تعلیم اور تربیت کے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے عام رہبر اور رہنما سب سے پہلے اپنے مقام وحیثیت کے بچانے اور ذاتی مفادات یا اپنے گروہ کے مفادات کو حاصل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ ہمیشہ معاشرے کے مفادات کو اپنے ذاتی مفادات پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہ تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے پاک اور معصوم رہبر ورہنما اور ان کے حقیقی پیروکار ہی ہیں جو پورے معاشرے کے مفادات اور انسانی حقوق کا مکمل طور پر تحفظ کر سکتے ہیں۔ پھر اگر ہم یہ فرض کر بھی لیں کہ عام رہنما، عدل وانصاف کو قائم کرنا اور انسانی معاشروں کو ترقی وکمال کی طرف لے جانا بھی چاہیں تو بہت سارے مقامات پر ان امور کی تشخیص ان کے لیے ناممکن ہے وہ ان امور کے بارے میں ناقص تشخیص کے حامل ہوں گے جو کسی طور پر بھی مشکل کا حل نہیں ہے۔ یہ امر صرف خداوند تعالیٰ کے ان نمائندگان کے لیے ممکن ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم کے بیکراں سمندر سے متصل ہوں۔ اس حقیقت کو زمین پر بسنے والے آدھے انسانوں پر مارکسیزم کی حکومت کے ستر سالہ تجربہ نے بڑے واضح انداز سے ثابت کیا ہے۔

مارکسیزم کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے وسیع پیمانے پر جدید ترین ذرائع ابلاغ اور پروپیگنڈا مشینری کو پورے ستر سال استعمال کیا۔ اس کے متعلق سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں اور مقالے لکھے اور سینکڑوں تقریریں اور خطابات کیے اور انسانی معاشروں کی مشکلات کے حل، معاشرتی عدل وانصاف کے قیام، نوع انسانی کے تکامل، صحیح تاریخ اور معاشرتی علوم کی تفسیر کے لیے مارکسیزم کو واحد راہ حل کے طور پر پیش کیا اور اپنے مخالفین کو ہر طریقے سے سرکوب کیا۔ لیکن ہم سب نے دیکھا کہ اس کا نتیجہ بدبختی، پس ماندگی، مخالفت ودشمنی اور ڈکیٹر شپ کی صورت میں نکلا۔ آخر کار ان کے مفکرین نے مجبوراً یہ اعتراف کیا کہ جسے وہ سعادت کا اصلی راستہ سمجھ رہے تھے وہ ایک انحراف تھا اور وحشت ناک راستہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ شاید پوری تاریخ میں اس واقعہ کی کوئی مثال نہ ہو کہ مفکروں، دانشوروں اور یونیورسیٹوں کی ایک عظیم تعداد ایک مکتب اور نظریے کی حمایت اور پرچار کرے اور آخر میں وہ بے معنی اور لغو صورت میں سامنے آئے۔ کیا اس بات کی کوئی ضمانت دے سکتا ہے کہ مستقبل میں ایسا نہیں ہوگا اور انسانی افکار سے جنم لینے والے نظریاتی اور معاشرتی مکاتب ومذاہب ایسے انجام سے دوچار نہیں ہوں گے۔

اِس مقام پر انبیاء اور ائمہ معصومین ؑ کے مکتب سے استفادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جس کی ضمانت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے کہ وہ ہر قسم کی غلطی اور اشتباہ سے پاک ہیں۔ مختصر یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو کمال وسعادت تک پہنچنے کے لیے خلق فرمایا ہے تو جہاں اُسے چاہیے کہ انسان کو سعادت کی راہیں دکھانے اور سعادت تک پہنچنے کے لیے وحی اور عصمت کے حامل انبیاء کو مبعوث کرے، وہاں اس کے لیے ضروری ہے کہ پیغمبروں کی رحلت کے بعد اسی راستے کو جاری رکھنے کے لیے ان کے معصوم جانشین مقرر فرمائے جو انسانی معاشرے کو نہ تنہا سعادت کی راہیں دکھائیں بلکہ اس تک پہنچنے میں بھی ان کی مدد کریں اور یقیناً ان کے بغیر یہ ہدف ہرگز پورا نہیں ہوگا۔ کیونکہ پہلی بات

تو یہ ہے کہ انسانی عقلیں اپنے بل بوتے پر ترقی وکمال کے تمام علل واسباب کو جانچنے اور تشخیص دینے کے لیے قطعاً کافی نہیں ہیں اور اس کا عشر عشیر بھی معلوم نہیں کر سکتیں۔ اور دوسری بات یہ کہ انبیاء کی رحلت کے بعد ان کا آئین اور دین تحریفات اور انحرافات کا شکار ہو جانے کا بہت امکان ہوتا لہٰذا اس دین کو انحرافات سے بچانے کیلئے معصوم اور الٰہی پاسداروں اور محافظوں کی ضرورت ہے جو خدا کے دین کو منحرف لوگوں کی تحریفات سے بچائیں اور اسے جاہلوں کی مداخلت اور ہوا وہوس کے پجاریوں کی من گھڑت تشریحات سے بچائیں۔ اور یہ وہی حقیقت ہے جو اصول کافی کی ایک مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت امام صادق – سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"انّ فینا اهل البیت فی کل خلف عدولا ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المطلین و تاویل الجاهلین۔"

''ہم اہل بیتؑ کے درمیان ہر نسل میں ایسے عادل افراد موجود ہیں جو (دین سے) غالیوں کی تحریف کی نفی کرتے ہیں، بدعتی مذاہب گھڑنے والوں اور اہل باطل کو سرکوب کرتے ہیں اور جاہلوں کی غلط تفسیروں اور تاویلوں کا قلع قمع کرتے ہیں۔''[۱]

اس حدیث میں یقیناً معصوم امام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت علیؑ نے اپنے پُرمعنی کلام میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ بَلٰی لَا تَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظَاهِرًا مَشْهُوراً، وَ اِمَّا خَائِفاً مَغْمُوراً لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰهِ وَبَيِّنَاتِهِ"

''اے اللہ! ہاں، زمین کبھی بھی ایسی ہستی سے خالی نہیں ہوتی جو حجت الٰہی کے ذریعے قیام کرے خواہ وہ ظاہر وآشکار ہو یا مخفی اور خوفزدہ ہو؛ یہ اس لیے تاکہ اللہ تعالیٰ کے واضح دلائل اور نشانیاں مٹنے نہ پائیں۔[۲]

تیسری بات یہ ہے کہ الٰہی حکومت کی تشکیل جو انسان کی تخلیق کے مقاصد تک اُسے پہنچاتی ہے، معصوم ہستیوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے عام انسانوں کی حکومتیں ہمیشہ ان کے مادی مفادات یا کسی خاص گروہ کے مفادات کے لیے سرگرم عمل رہی ہیں۔ ان کی تمام کوششوں کا محور ومرکز یہی مادی مفادات تھے۔ اور جیسا کہ ہم نے کئی مرتبہ تجربہ کیا ہے کہ جمہوریت، عوام پر عوام کی حکومت یا انسانی حقوق جیسے نعرے بڑی آسانی سے شیطانی اہداف اور مقاصد تک پہنچنے کے لیے ایک آلہ کے طور پر استعمال ہوئے۔ انسانیت کا استحصال کرنے والوں نے اسی منطق اور انہی نعروں کے ذریعے اپنے مذموم اور خفیہ مقاصد اور اہداف لوگوں پر مسلط کیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ تین اصول یعنی سعادت کی راہیں دکھانا (اراۂ الطریق) جہاں عقل تشخیص سے عاجز اور ناتواں ہے، انبیاء کی میراث کی حفاظت اور عادلانہ حکومت کا قیام، درحقیقت معصوم

---

[۱] اصول کافی، ج۱، صفحہ ۳۲ (باب صفۃ العلم، حدیث ۲)

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۱۴۷۔

امام کی ضرورت اور فلسفہ کے بنیادی ستونوں کی تشکیل دیتے ہیں۔ہم اس گفتگو کو فلسفہ امامت کے متعلق حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا –سے منقول جامع ترین بیان اور امیر المومنین علیؑ کے نہج البلاغہ میں ایک کلام پر ختم کرتے ہیں۔حضرت امام رضا –نے بروز جمعہ ''مرو'' کی جامع مسجد میں لوگوں کے اجتماع میں جو خطاب فرمایا وہ کئی گھتیاں سلجھاتا ہے۔ہم اس خطاب سے فقط ایک اقتباس یہاں بیان کرتے ہیں:

"اِنَّ الِامَامَةَ هِيَ مَنْزِلَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَ اِرْثُ الْاَوْصِيَاءِ. اِنَّ الِامَامَةَ خِلَافَةُ اللهِ و خِلَافَةُ الرَّسولِ ... الِامامُ البَدْرُ الْمِنِيرِ و السِّراجُ الزاهِرُ و النُّورُ السّاطِعُ و النَّجْمُ الهادِي فِي غَياهِبِ الدُّجىٰ ... الِامَامُ الماءُ العَذْبُ عَلَى الظَّمَاءِ وَ الدَّالُّ عَلَى الهُدىٰ و المُنْجِي مِنَ الرَّدى... الِامامُ السّحابُ المَاطِرُ وَ الْغَيْثُ الهاطِلُ و الشَّمْسُ المُضِيئَةُ... الامامُ اَمِينُ اللهِ فِي خَلْقِهِ و حُجَّتُهُ عَلى عِبَادِهِ وَ خَلِيفَتُه فِي بِلادِهِ... نِظامُ الدِّين و عِزُّ المُسلِمِينَ وَ غَيْظُ الْمنَافِقِينَ وَ بوارُ الكافِرِينَ" [1]

''بے شک امامت، انبیاء کی منزلت اور اوصیاء کی وراثت ہے۔ بے شک امامت اللہ اور رسول کی جانشینی اور خلافت ہے۔۔۔امام درخشاں مہتاب، روشن آفتاب، تابندہ نور اور ظلمت و تاریکی میں ہدایت کا ستارہ ہوتا ہے۔۔۔امام پیاس میں گوارا پانی اور ہدایت کا راستہ دکھانے والا اور ہلاکت سے بچانے والا ہوتا ہے۔۔۔امام بارش برسانے والا بادل اور موسلا دھار بارش اور چمکتا سورج ہوتا ہے۔۔۔امام اللہ کی مخلوق میں اللہ کا امین، اس کے بندوں پر اس کی حجت اور اس کی سرزمین پر اس کا جانشین ہوتا ہے۔۔امام دین کے استحکام کا سرمایہ، مسلمین کی عزت، منافقین کے لیے باعث غیض وغضب اور کافروں کے لیے باعث ہلاکت ہوتا ہے۔''

حضرت امیر المومنین علیؑ نے اپنے ایک مختصر جملے میں امامت کو مجسم کرتے ہوئے فرمایا:

"ومَكَانُ الْقِيّمِ بِالْاَمْرِ مَكَانُ النِّظامِ مِنَ الخَرْزِ يَجْمَعُهُ وَ يَضُمُّهُ فَاِذَا انْقَطَعَ النِّظامُ تَفَرَّقَ الخَرْزُ وَ ذَهَبَ ثُمَّ لَمْ يَجْتَمِعْ بِحَذافِيرِهِ اَبَداً" [2]

''مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار شخص کی حیثیت مہروں کے اجتماع میں دھاگے کی ہوتی ہے کہ وہی سب کو جمع کیے رہتا ہے اور اگر وہ ٹوٹ جائے تو سب مہرے بکھر جاتے ہیں اور پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔'' (اسی طرح اگر امام لوگوں کے درمیان نہ ہو تو معاشرے کا شیرازہ بھی بکھر جاتا ہے)

---

[1] اصول کافی، ج اول، صفحہ ۲۰۰ (باب نادر جامع فی فضل الامام)

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۶۔

قرآن مجید میں عمومی ولایت اور امامت

ولایت کے حوالے سے دو بحثیں جدا جدا ہیں:

ا۔ عمومی ولایت

یعنی ہر دور اور ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے درمیان ایک امام اور پیشوا ہونا ضروری ہے خواہ وہ نبوت و رسالت کے منصب پر فائز ہو یا صرف ولایت کا حامل ہو۔

۲۔ خصوصی ولایت اور امامت:

اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد اس منصب الٰہی پر کون فائز ہوا؟
بالفاظ دیگر جس طرح نبوت کی بحث کو دو حصوں نبوت عامہ اور نبوت خاصہ میں تقسیم کیا گیا ہے اس طرح امامت کے بھی یہ دو حصے ہیں۔ قرآن مجید میں ولایت عامہ کے بارے میں چند اشارے ہوئے ہیں جن پر یہاں نگاہ ڈالی جارہی ہے۔

۱۔ اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ (رعد۔ ۷)
۲۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ ''(براۃ۔ ۱۱۹)
۳۔ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ (نساء۔ ۵۹)

ترجمہ

ا۔ ''آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے''
۲۔ ''اے ایمان لانے والو اللہ (کی مخالفت) سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ''
۳۔ ''اے صاحبان ایمان! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو''

پہلی آیت (آیۂ انداز و ہدایت)

پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خطاب ہو رہا ہے: کہ آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم و ملت کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہے۔

اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ

اس آیت کی تفسیر میں فخر رازی نے تین قول نقل کیے ہیں:

اول: منذر اور ہادی دونوں کا ایک ہی معنی ہے، اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف ڈرانے والے اور ہر قوم کی ہدایت کرنے والے ہیں۔

دوم: ڈرانے والے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہدایت کرنے والا، خدا ہے۔

سوم: ڈرانے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہدایت کرنے والے علیؑ ہیں، کیونکہ ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دست مبارک کو اپنے سینے پر رکھ کر فرمایا ''انا المنذر'' اور پھر علیؑ کے کندھے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

''اَنْتَ الهادِیُ یا علی ! بِكَ یَهْتَدِی المُهْتَدُونَ مِنْ بَعْدِی !''

''اے علی ! آپ ہدایت کرنے والے ہیں اور میرے بعد تیرے ذریعے ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے''[1]

ان تین اقوال کو بعض دوسرے مفسرین نے بھی ذکر کیا ہے اور بعض اہل سنت کے مفسرین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ پہلے دو اقوال میں سے کوئی ایک تفسیر درست ہے۔ کیونکہ تیسری تفسیر ان کے تعصب آمیز طرز فکر سے مطابقت نہیں رکھتی، حالانکہ پہلی تفسیر یقینا آیت کے ظاہری معنی کے ہرگز مطابق نہیں ہے کیونکہ اگر دونوں صفتیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مقصود ہوتیں تو پھر یوں ارشاد ہوتا: 'انما انت منذر وهاد لکل قوم' دوسرے الفاظ میں 'لکل قوم' جو کہ جار و مجرور ہے وہ ''ھادی'' پر ہرگز مقدم نہ ہوتا اور اگر اسے مقدم ہونا ہوتا پھر دونوں صفتوں پر مقدم ہوتا اور کہا جاتا: 'اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ' مختصر یہ کہ 'لِکُلِّ قومٍ' کا ایک وصف پر مقدم ہونے اور دوسرے وصف سے متاخر ہونے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی یا تو یہ دونوں پر مقدم ہو یا پھر دونوں کے بعد ذکر ہو۔ (غور کیجیے گا)

دوسری تفسیر اور قول بھی انتہائی نامناسب اور غیر معقول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہادی ہونے میں کوئی شک و تردید ہی نہیں ہے کہ اس کو بیان کرنے کی ضرورت پیش آئے، علاوہ ازیں جملے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر دور اور زمانے میں ایک خاص ہدایت کرنے والا ہے جب کہ خداوند تو یکتا اور یگانہ ہے، یہ یگانگی 'لِكُلِّ قوم هاد'' سے ثابت ہونے والے تعدد (تعداد) کے منافی ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت کے لیے جو تفسیر قابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ہر دور اور زمانے میں ایک ہادی ہے۔

کیا اس ہادی سے مراد ہر قوم کے علماء اور دانشور ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی منفی ہے کیونکہ ہر زمانے اور دور میں متعدد علماء اور دانشور موجود ہوتے ہیں نہ ایک ہدایت کرنے والا، جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک فرد تھے، اسی مطلب کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈرانے کے اعتبار سے دین کے بانی ہیں اور امام ہدایت کے ذریعے ان کے مشن کو جاری رکھنے والا ہے۔

یہ نکات وہ ہیں جو خود اس آیت سے ثابت ہوتے ہیں اگر ہم اس بارے میں شیعہ اور سنی روایات کا مطالعہ کریں تو مطلب اور

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱۹، صفحہ ۱۴۔

زیادہ واضح ہوجائے گا۔اہل سنت کی مشہورترین تفسیر الدر المنثور (اس کے مصنف جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۰ ہجری ہیں جس میں آیات کی تفسیر روایات کی روشنی میں لکھی گئی ہے) میں اس آیت کی تفسیر میں متعدد احادیث نبوی ﷺ نقل کی گئی ہیں۔

۱۔ابن جریر، ابن مردویہ، ابونعیم، دیلمی، ابن عساکر اور ابن نجار سے نقل کرتے ہیں۔

"لَمَّا نَزَلَتْ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قوم هادٍ .وَضَعَ رَسُولُ اللّٰهُ (ص) يَدَهُ عَلٰى صَدْرِهٖ فَقَالَ اَنَا الْمُنْذِرُ وَ اَوْمَأَ بِيَدِهٖ اِلٰى مَنْكَبِ عَلِيٍّ فَقَالَ: اَنْتَ الهادِيُ يا عَلِيّ بِكَ يَهْتَدِي الْمُهْتَدُونَ مِنْ بَعْدِي" [1]

"جب (انما انت منذر ولکل قوم ھاد) والی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر فرمایا: "میں ہوں منذر اور اپنے ہاتھ سے علیؑ کے کاندھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ہادی تم ہو اے علیؑ! میرے بعد ہدایت پانے والے تیرے ذریعے ہدایت پائیں گے۔"

۲۔ابو برزہ اسلمی بیان کرتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اکرم ﷺ کو اس آیت کے بارے میں (اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر) فرماتے ہوئے سنا "اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ" اور علی کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرماتے ہوئے سنا: "لِكُلِّ قوم هادٍ" [2]

۳۔عبد اللہ بن احمد، ابن ابی حاتم، طبرانی، حاکم، ابن مردویہ اور ابن عساکر نے علیؑ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے آیت "انما انت منذر ولکل قوم ھادٍ" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: "رسولُ الله المنذِرُ وَ اَنَا الهادی" یعنی: "رسول خدا منذر ہیں اور میں ہوں ہادی" [3]

۴۔ایک اور حدیث میں ابن عباس رسول خدا ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا!

"اَنَا المنذِرُ و عَلِيٌّ الهادی و بِكَ يا عَلِيُّ يَهْتَدِي الْمُهْتَدُونَ"

"منذر میں ہوں اور ہادی علی ہیں اور اے علی! تیرے ذریعے سے ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے۔"

اس حدیث کو اہل سنت کے مشہور معروف حفاظ اور مفسرین نے اپنی اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ان میں سے حاکم نے مستدرک میں، ذہبی نے تلخیص میں، فخر رازی اور ابن کثیر نے اپنی تفسیروں میں، ابن صباغ مالکی نے الفصول المھمہ میں، گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب میں، علامہ طبری نے اپنی تفسیر میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں حموینی نے فرائد السمطین میں اور چند دیگر

---

[1] الدار المنثور، ج ۴، ص ۴۵

[2] الدار المنثور، ج ۴، ص ۴۵

[3] الدار المنثور، ج ۴، ص ۴۵

علماء نے اپنی تفاسیر میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے[1]

۵۔کتاب ''حبیب السّیر'' کے مصنف ''میر غیاث الدین'' یوں لکھتے ہیں:

"قَدْ ثَبَتَ بِطُرُقٍ مُتَعَدِّدَةٍ اَنَّهُ لَمَّا نَزَلَ قَوْلُهُ تَعَالٰی اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ قَالَ: يَا عَلِيُّ اَنَا المنذرُ وَ اَنْتَ الهادِيُ بِكَ يَا عَلِيُّ يَهْتَدِي الْمُهْتَدُونَ مِنْ بَعْدِي." [2]

ترجمہ: ''کئی حوالوں سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ جب یہ آیت ''انما انت منذر ولکل قوم ھاد'' نازل ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ سے فرمایا: اے علی! میں منذر ہوں اور تم ہادی ہو۔ میرے بعد ہدایت پانے والے تمہارے ذریعے سے ہدایت یافتہ ہوں گے۔''

۶۔اس حدیث کو حموینی نے بھی ابو ہریرہ کے ذریعے علیؑ سے نقل کیا ہے۔[3]

۷۔مستدرک حاکم میں یہ حدیث ابو بریدہ اسلمی سے قدرے تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ منقول ہے:

"دَعَا رسولُ اللهِ بِالطَّهُور و عِنْدَهُ عَلِيُّ ابن ابي طالبٍ فَأَخَذَ رسولُ اللهِ بِيَدِ عَلِيٍّ بَعْدَ ما تَطَهَّرَ فَأَلْعَقَهَا بِصَدْرِهِ ثُمَّ قَالَ: "اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ" يعني نَفْسَهُ ثُمَّ رَدَّهَا اِلٰى صَدْرِ عَلِيٍّ ثُمَّ قَال وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ. ثُمَّ قَالَ لَهُ اَنْتَ مَنَارُ الْاَنَامِ وغايةُ الهدى وَ اَمِيرُ الْقُرَّاءِ اَشْهَدُ عَلٰى ذٰلِكَ اِنَّكَ كَذٰلِكَ." [4]

''علیؑ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے کہ آپؐ نے وضو کے لیے پانی طلب فرمایا۔ وضو کرنے کے بعد آپؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے سینے سے لگا کر فرمایا: 'انّما انت منذرٌ' مراد آپ کی اپنی ذات اقدس تھی۔ پھر علیؑ کے ہاتھ کو اُن کے سینے پر رکھ کر فرمایا: ''و لکل قوم ھاد'' (یعنی علیؑ) پھر اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''لوگوں کے لیے درخشاں چراغ، ہدایت کی انتہا اور قرآن کے قاریوں (اس آسمانی کتاب سے آگاہ افراد) کے امیر آپ ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان صفات اور شان و منزلت کے مالک ہو۔''

---

[1] اس حدیث کے منابع اور مدارک سے مزید آگاہی کیلئے کتاب احقاق الحق، جلد ۴، صد ۸۸ تا ۹۲ پر رجوع کریں۔

[2] حبیب السّیر، جلد نمبر ۲، ص ۱۲

[3] احقاق الحق، جلد ۳، ص ۹۲۔

[4] تفسیر المیزان، جلد ۱۱، ص ۳۲۷

یہاں بعید نہیں ہے کہ رسول خدا ﷺ نے اس بات کو متعدد مقامات پر مختلف انداز سے بیان فرمایا ہو اور مندرجہ بالا احادیث کے مختلف الفاظ اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کی کتب میں بھی اس بارے میں متعدد احادیث نقل ہوئی ہیں، یہاں پر ان سب کو ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے فقط ان کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔تفسیر نور الثقلین میں اس بارے میں پندرہ احادیث مذکورہ ہیں[1]

ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر -اور حضرت امام جعفر صادق -سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ”کُلُّ اِمامٍ ھادٍی کُلِّ قَوۡمٍ فِی زَمَانِہٖ “یعنی: ”ہر امام اپنے زمانے میں ہر قوم کا ہادی ہوتا ہے۔“ دیگر الفاظ یوں بیان ہوئے ہیں: ”کُلُّ اِمَامٍ ھادٍ لِلۡقَرۡنِ الّذِی ھُوَ فِیۡہِ “یعنی: ”ہر امام اس صدی کا ہادی ہوتا ہے جس میں وہ ہوتا ہے۔“[2]

یہاں حیرت اس بات پر ہے کہ بعض مفسرین نے ان تمام احادیث کو نظر انداز کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے منقولہ بعض صحابہ کے اقوال پر اعتماد کرتے ہوئے مذکورہ آیت کے اور معانی بیان کیے ہیں۔ان میں سے ایک مجاہد سے منقولہ قول ہے۔وہ کہتے ہیں: منذر سے مراد محمدؐ ہیں اور لِکُلِّ قومٍ ھادٍ سے مراد یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک نبی ہوتا ہے جو انہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے۔یہ تفسیر بہت بعید دکھائی دیتی ہے۔ایک اور تفسیر سعید بن جبیر سے نقل ہوئی ہے وہ بیان کرتے ہیں: ”منذر محمدؐ ہیں اور ھادی خدا ہے“ حالانکہ آیت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ہر قوم کا اپنا اپنا الگ ہادی ہے۔جبکہ اللہ تعالیٰ تو تمام قوموں کا ایک ہی ہادی ہے۔اسی طرح کی دیگر نامناسب تفسیریں بھی بیان ہوئی ہیں۔لیکن کیا یہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی کثیر احادیث کو محض اس لیے نظر انداز کر دیا جائے کہ مبادا یہ احادیث شیعہ کے لیے دلیل بن جائیں اور ان سے ہٹ کر غیر صحیح تفسیروں کا سہارا لیا جائے!؟

۲۔دوسری آیت (آیہٴ صادقین)

دوسری آیت میں مومنین کو مخاطب قرار دے کر انہیں تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت دینے کے بعد انہیں حکم دیا گیا ہے کہ ہمیشہ سچوں کے ساتھ رہیں (تاکہ انحراف کا شکار نہ ہوں)۔چنانچہ ارشاد ہوا: ”یَاۤاَیُّھَاالَّذِینَ آمَنُوااتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُونُوا مَعَ الصَّادِقِینَ“ یعنی: ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ صادقین (سچوں) سے مراد کون ہیں؟ اس کے متعلق بھی مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

بعض افراد کے خیال میں صادقین سے مراد، خود پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے اور یہ آیت فقط آپؐ کے دور کے ساتھ مختص ہے۔حالانکہ انتہائی واضح ہے کہ قرآن کے دیگر فرامین کی طرح یہ فرمان بھی عام ہے اور ہر دور اور ہر علاقے کے مومنین کو شامل ہے۔بعض دوسرے افراد کا کہنا ہے کہ یہاں پر ”مع“ وہی معنی دے رہا ہے جو ”من“ دیتا ہے۔یعنی ”تم سچوں میں سے ہو جاؤ“ سے مراد یہ ہے

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲، صد ۴۸۲ تا ۴۸۵

[2] نور الثقلین، جلد ۲، صد ۴۸۳، حدیث ۱۹، ۲۰۔

کہ: ''تم بھی سچے بن جاؤ۔'' حالانکہ اس قسم کی تاویلوں اور توجیہات کی ہرگز ضرورت نہیں ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ عربی ادب اور ادباء کی عبارتوں میں ''مَع ''من کے معنی میں استعمال ہوا ہے یا نہیں۔

ظاہری طور پر آیت یہ بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں سچوں کے راستے پر اور ان کے ساتھ رہیں اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے صادقین اور سچے موجود ہیں جن کے ساتھ لوگوں کو تقویٰ کے راستے پر چلنے کے لیے ہمیشہ رہنا چاہیے۔لہٰذا بہتر یہ ہے کہ صادقین کے معنی کو سمجھنے کے لیے خود قرآن کی طرف رجوع کیا جائے اور دیکھا جائے کہ قرآن نے صادقین کے کون سے اوصاف بیان کیے ہیں۔ایک جگہ پر قرآن فرماتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵ (حجرات/۱۵)

''مومنین وہ افراد ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس کے بعد وہ شک وشبہ میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی جانوں اور اموال کے ذریعے خدا کی راہ میں جہاد کیا؛ یہ لوگ صادق (سچے) ہیں۔''

اس آیت میں صدق وسچائی کو ایسے مجموعہ کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے جو ایمان اور عمل پر مشتمل ہے اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر اور پاک ہے۔سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں، نیکی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ سبحانہ، روز آخرت، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان، اسی طرح اللہ کے راستے میں اور کمزور افراد اور غلاموں کو نجات دلانے کے لیے اموال کو خرچ کرنا، نیز نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، عہد کو نبھانا، مشکلات اور مصائب میں صبر کرنا اور جہاد کے وقت ثابت قدم رہنا، نیکی ہے۔اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ''اُولٰئِكَ الَّذِين صَدَقُوا''یعنی: ''ان صفات کے حامل افراد صادق اور سچے ہیں۔''

یوں صادقین کی اصلی نشانی تمام مقدسات پر ایمان کامل اور زندگی کے تمام میدانوں میں اطاعت الٰہی خصوصاً نماز، زکوۃ، انفاق اور جہاد اور سختیوں میں استقامت دکھانا ہے۔اسی طرح کا مطلب سورہ حشر کی آیت ۸ میں بھی بیان ہوا ہے، ان تمام آیات سے اور زیر بحث آیت کے اطلاق یعنی بغیر کسی قید وشرط کے صادقین کے ساتھ ہو جانے کے حکم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ایسے افراد کے ساتھ ہو جائیں جو ایمان اور تقویٰ کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوں اور علم وعمل کے لحاظ سے اور استقامت اور جہاد کے اعتبار سے بلند ترین سطح پر ہوں۔

(غور فرمائیں کہ آیت یہ نہیں کہہ رہی کہ صادقین میں سے ہو جاؤ بلکہ یہ کہہ رہی ہے کہ ان کے ہمراہ ہو جاؤ۔لیکن جہاں پرہیز گاری کی بات ہوئی ہے وہاں قرآن یہ فرماتا ہے کہ پرہیز گاروں میں سے ہو جاؤ۔تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صادقین کا مرتبہ ان مراتب سے بلند وبالا ہے جس مرتبے اور درجے پر لوگ پہنچتے ہیں اور اس معنی کا واضح ترین مصداق وہی معصوم ہستیاں ہیں)

اس کے علاوہ سچوں کے ساتھ ہو جانے کے حکم کا بلا قید وشرط ہونا اور ان سے کسی صورت میں بھی جدا نہ ہونے کا حکم، ان کے معصوم ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔کیونکہ معصوم کے سوا کسی اور کسی کی قید وشرط کے بغیر پیروی کرنے کا حکم نا قابل تصور ہے۔(غور فرمائیں)

فخر رازی اس آیت کے بارے میں چند مقدمات کا ذکر کرنے کے بعد اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آیت یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص جائز الخطا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اس کی اقتداء اور پیروی کرے جو معصوم ہے، اور معصومین وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے صادقین شمار کیا ہے، پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ جائز الخطاء افراد پر واجب اور ضروری ہے کہ وہ خطا سے معصوم ہستیوں کے ساتھ ہو جائیں تا کہ خطاء سے پاک افراد جائز الخطاء کی خطاؤں میں رکاوٹ بن جائیں اور یہ بات ہر زمانے میں ثابت ہے۔ لہذا ہر زمانے میں ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس نکتے کو بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: ''ہم مانتے ہیں کہ ہر زمانے میں ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ معصوم تمام امت ہے، جبکہ تم شیعہ یہ کہتے ہو کہ معصوم فقط ایک ہے۔''[1]

فخر رازی آیت کا مطلب واضح ہونے کی بنا پر ہر زمانے میں ایک معصوم ہستی کے پائے جانے پر اس کی دلالت سے تو انکار نہ کر سکے لیکن مذہب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے عقیدے کو بھی قبول کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ لہذا انہیں تمام امت کے معصوم ہونے یا امت کے اجماع کی بات درمیان میں لانا پڑی۔ حالانکہ ایسے اجماعی مسائل جن پر تمام اُمت کا اتفاق ہے، وہ محدود ہیں، جب کہ سچوں کے ساتھ ہونے کا فریضہ عمومی ہے ہر جگہ اور ہر چیز میں یہ فریضہ ہے۔ (غور کریں)

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت کسی اہل عرب نے لفظ صادقین سے تمام امت کا معنی مراد نہیں لیا۔ پس کیسے یہاں پر اس کا معنی یہ لیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم یہ اعتراف کر لیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک ایسا صادق موجود ہوتا ہے جس کی باتوں میں نہ کوئی غلطی ہے نہ خطاء اور نہ کوئی خلاف حقیقت چیز ہے اور ہمیں اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'صادقین' جمع کا لفظ ہے پس ہر زمانے اور دور میں ایک سے زیادہ معصوم موجود ہونے چاہیں، یہ چیز تو مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے عقیدے کے بھی منافی ہے۔ اس سوال کا جواب ایک نکتہ کے پیش نظر نہایت واضح ہے اور وہ یہ کہ اس جمع سے مقصود تمام ادوار اور زمانوں کا مجموعہ ہو، کیونکہ صادقین ایک ایسا گروہ ہے جو مجموعی طور پر تمام زمانوں پر مشتمل ہے۔ بالکل اسی طرح جب یہ کہا جائے کہ ہر زمانے کے لوگوں کو انبیاء الٰہی کی پیروی کرنا چاہیے تو اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہر دور میں کئی انبیاء موجود ہیں؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر دور کے لوگ اپنے دور کے پیغمبر کی اتباع اور پیروی کریں۔ یا جب یہ کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے تعین کے لیے علماء کی طرف رجوع کریں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے دور کے عالم اور مرجع تقلید کی پیروی کرے۔

اس بات کا منہ بولتا ثبوت یہ ہے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ کے دور میں ان کے علاوہ کوئی اور واجب الا طاعت موجود نہ تھا حالانکہ مذکورہ آیت قطعی طور پر آپ کے زمانے کو بھی شامل ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ اس جمع سے ایک ہی وقت اور ایک دور کے صادقین مراد نہیں ہیں بلکہ ان کا مجموعہ ہے جو مختلف ادوار اور زمانوں میں موجود رہے ہیں، یہ تو خود آیت کا تجزیہ و تحلیل تھا۔

جہاں تک اسلامی روایات کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اہل سنت کے بہت سارے مفسرین اور محدثین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیت علی ابن ابی طالب- کے بارے میں نازل ہوئی۔ جیسا کہ علامہ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ ابن

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۶، صفحہ ۲۲۱۔

عباس نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ: "مَعَ الصَّادِقِيْنَ يَعنِى عَلِى بنِ اَبى طالبٍ وَ اَصْحَابِهٖ" (صادقین کے ساتھ سے مراد یہ ہے کہ علی بن ابی طالب اور ان کے اصحاب کے ساتھ۔)[1]

اسی طرح علامہ گنجی نے "کفایۃ الطالب" میں اور علامہ سبط بن الجوزی نے "تذکرہ" میں چند علماء سے یوں بیان کیا ہے: "قال علماء السير معناه كونوا مع على و اهل بيته۔ قال ابن عباس على سيد الصادقين۔" یعنی: "سیرت نگاری کے علماء نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ علیؑ اور ان کے خاندان کے ساتھ ہو جاؤ۔ ابن عباس مزید کہتے ہیں: علی سچوں کے سید و سردار ہیں۔"[2]

اہل بیتؑ سے نقل ہونے والی متعدد روایات بھی اسی مطلب پر تاکید کرتی ہیں۔ ان میں ایک روایت جابر بن عبداللہ انصاری کی ہے جو انہوں نے حضرت امام محمد باقر - سے بیان کی ہے۔ انہوں نے "كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" کی تفسیر میں فرمایا: "ای آل محمد" یعنی: "اس سے مراد، آل محمد ہیں۔"[3] ایک اور روایت میں برید بن معاویہ نے حضرت امام محمد باقر - سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: "ايّانا عنى" یعنی: "خداوند تعالی نے اس سے ہمیں مراد لیا ہے۔"[4] تفسیر برہان میں نہج البلاغہ سے نقل کیا گیا ہے:

"روى ان النبى سئل عن الصادقين۔ فقال: هم على و فاطمة و الحسن و الحسين وذريتهم الطاهرون الى يوم القيامة۔"[5]

"مروی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچوں کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: "علی، فاطمہ، حسن، حسین اور قیامت تک ان کی معصوم اولاد، سچے ہیں۔"

واضح ہے کہ یہ تمام روایات مصداق کو بیان کر رہی ہیں اور آیت کے کلی مفہوم سے منافی نہیں ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے یہ آیت خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صادق آتی ہے۔ اس کے بعد ہر دور کے معصوم اماموں کو شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت "ولایت عامہ" اور "ولایت خاصہ" دونوں کو ثابت کرتی ہے۔

---

[1] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۹۷۔

[2] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۹۷۔

[3] نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۲۸۰، حدیث ۳۹۲، ۳۹۳

[4] نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۲۸۰، حدیث ۳۹۲، ۳۹۳

[5] تفسیر برہان، جلد ۲، صفحہ ۱۷۰

۳۔ تیسری آیت (آیۂ اولی الامر)

تیسری آیت میں اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کی بات کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو۔''

یہاں ''اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا واجب ہونا تو واضح ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ''اولی الامر'' سے مراد کون ہیں جن کی اطاعت، اللہ اور رسول کی اطاعت کے ہمراہ ذکر کی گئی ہے؟ یہ موضوع مفسرین کے درمیان قابل بحث ہے۔ مکتب اہل بیتؑ کے پیروکار اور شیعہ علماء اور مفسرین سب اس بات پر متفق ہیں کہ ''اولی الامر'' سے مراد آئمہ معصومینؑ ہیں جو زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی معاشرے کے روحانی اور ظاہری قائد و رہبر ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور اولی الامر میں شامل نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں جس بلا قید و شرط اطاعت کا ذکر ہے اور جسے خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ صرف معصومین کے بارے میں ہی قابل تصور ہے۔ دیگر افراد جن کی اطاعت لازمی ہے اُسے ہمیشہ حدود قیود کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اطاعت مطلق ان کے بارے میں کسی صورت میں بھی موجود نہیں ہے اور یہ مسئلہ واضح ہے۔

اہل سنت کے علماء اور مفسرین کے درمیان ''اولوالامر'' کے معنی میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے ''صحابہ'' مراد لیے ہیں۔ بعض نے فوج کے کمانڈر اور بعض دوسروں نے چار خلفاء مراد لیے ہیں۔ البتہ انہوں نے ان کے متعلق کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی۔ کچھ دیگر افراد نے 'اولوالامر' کا مطلب علماء او دانشور بیان کیا ہے اور اس کی دلیل کے طور پر سورہ نساء کی آیت / ۸۳ کو پیش کیا ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ

''اور جب فتح اور شکست کی کوئی خبر ان تک پہنچتی ہے تو وہ (بغیر تحقیق کیے) اُسے پھیلا دیتے ہیں؛ حالانکہ اگر وہ اُسے رسول ﷺ اور اپنے میں سے اولی الامر کی طرف پلٹا دیں تو وہ افراد جو مسائل کی جڑوں سے واقف ہیں، وہ اُسے جان لیں گے۔''

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ مذکورہ آیت بلا قید و شرط اطاعت کے متعلق ہے اور سورہ نساء کی ۸۳ نمبر آیت سوال اور تحقیق کے بارے میں ہے اور یہ دو مختلف باتیں ہیں، لہٰذا ان دونوں کو ایک ہی معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ عالم سے پوچھنا اور سوال کرنا ایک معنی اور مطلب ہے جب کہ ''اولوالامر'' کی بلا قید و شرط اطاعت ایک اور معنی ہے اور ثانی الذکر صرف معصومین کے لیے قابل تصور ہے لیکن اول الذکر کا ایک

وسیع معنی اور مفہوم ہے۔

اہل سنت کے بعض مفسرین نے ایک پانچواں احتمال بھی بیان کیا ہے کہ ''اولوالامر'' سے عوام کے نمائندگان، حکمران، صاحبان منصب واقتدار علماء اور زندگی کے مختلف شعبہ جات کے سربراہان مجموعی طور پر مراد ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اہل حل وعقد کا گروہ مراد ہے کہ جب بھی وہ کسی مسئلہ اور امر پر متفق ہو جائیں تو ان کی بلا چون وچرا اطاعت واجب ہے (شرط یہ ہے کہ وہ ہم میں سے ہوں چونکہ آیت نے 'منکم' کے ذریعے اس شرط کو بیان کیا ہے، وہ سنت رسولؐ کی مخالفت نہ کریں، اپنی ابحاث میں کسی دباؤ کا شکار نہ ہوا اور انہیں مجبور نہ کیا گیا ہو ایک رائے پر متفق ہو جائیں اور مسئلہ بھی عمومی ہو)۔ یہ گروہ اور جماعت ان مسائل میں واجب الاطاعت ہے جن میں شارع مقدس کی طرف سے نص نہ آئی ہو۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ گروہ من حیث المجموع معصوم ہے اس لیے ان کی بلاقید وشرط اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔[1]

اس لحاظ سے بعض مفسرین نے علماء دانشوروں اور اہل حل وعقد کے مجموعے کو جس میں پانچ شرائط موجود ہوں، اولی الامر شمار کیا ہے:

۱۔ مسلمان ہونا ۲۔ سنت کے مخالفت نہ کرنا ۳۔ رائے کے اظہار میں مجبور نہ ہونا

۴۔ ''مالانص فیہ'' کے بارے میں رائے کا اظہار کرنا ۵۔ آراء کا متفق ہونا

ان مفسرین کی نظر میں ایسے مجموعے کو معصوم شمار کیا جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی آیت میں اولوالامر کا مطلب یہی ہے؟ کیا واقعی، جب اصحاب پیغمبر صلى الله عليه وآله وسلم اور اہل عرف نے اس آیت کو سُنا تو انہوں نے یہی معنی سمجھا؟ یا یہ کہ اس معنی کو بہت زیادہ تکلف کے ساتھ آیت پر مسلط کیا گیا ہے تا کہ آیت کی وہ تفسیر سامنے نہ آئے جو شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اولی الامر، آئمہ معصومین ہیں؟!

ظاہر یہ ہوتا کہ 'المنار' کے بیان کی بنیاد فخر رازی کا کلام ہے چنانچہ فخر رازی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ آیت (تعبیر اُولی الامر منکم) دلالت کرتی ہے کہ اجماع امت حجت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اولوالامر کی اطاعت کا حکم قطعی طور پر (بلاقید وشرط) دیا ہے۔ اور جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ یوں حکم دے اُسے معصوم از خطاء ہونا چاہیے، کیونکہ اگر معصوم نہیں ہوگا تو کبھی کبھار خطا اور غلطی کا مرتکب ہوگا، ایک طرف اس کے فرمان پر عمل کرنا واجب ہے تو دوسری طرف غلط اور خطا ہونے کی وجہ سے اس پر عمل کرنا حرام ہے جو کہ محال ہے، پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اولوالامر کی مطلق اطاعت کا حکم اس کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

یہ معصوم یا تمام امت اسلامی ہے یا امت اسلامی کے بعض افراد دوسرا احتمال قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ہمیں ان بعض افراد کے بارے میں علم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہیں وہ ہماری دسترس میں ہوں اور ہم ان سے استفادہ کرسکیں جب کہ اس دور میں ہم معصوم امام کی پہچان، اس تک پہنچنے اور استفادہ کرنے سے عاجز ہیں، لہٰذا وہ معصوم جس کی بلاقید وشرط اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہ کوئی خاص فرد یا گروہ نہیں ہے۔ اس بنا پر اس سے مقصود اجماع امت ہی ہوسکتا ہے۔[2]

---

[1] تفسیر المنار، جلد ۵ ص ۱۸۱

[2] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۰، صد ۱۴۴۔

جس چیز نے فخر رازی، المنار کے مصنف اور ان کی طرح کے دیگر افراد کو ایسی تفسیر کرنے پر مجبور کیا جو یقیناً حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے یار و اصحاب میں سے کسی نے بھی آیت کے نزول کے وقت نہ سمجھا، وہ وہی پہلے سے ذہنوں میں موجود نظریات اور افکار ہیں جو رکاوٹ بن جاتے ہیں کہ آیت کے مفہوم کو اہل بیتؑ کے معصوم اماموں میں تلاش کیا جائے، ایک طرف تو اولوالامر کے معصوم ہونے پر آیت کی دلالت معلوم اور واضح ہے جب کہ دوسری طرف کسی شخص کو بعنوان معصوم ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ آیت کی ایسی تفسیر بیان کی جائے گی جو آیت کے نزول کے وقت کسی صحابی رسولؐ کے ذہن میں نہ آئی ہوگی اور نہ انہوں نے اس سے یہ بات سمجھی ہوگی۔

اور ان سب سے زیادہ عجیب و غریب تفسیر وہ ہے جو اہل سنت کے بعض مفسرین نے بیان کی ہے۔ ان کی رائے کے مطابق اولوالامر، حکمران، بادشاہ اور سربراہان مملکت ہیں، مسلمانوں پر حکومت کرنے والے ہر حکمران کی اطاعت اور پیروی واجب ہے، وہ عادل یا ظالم، صحیح راستہ پر ہو یا منحرف ہو، اللہ کی اطاعت کا حکم دے یا اس کی مخالفت اور نافرمانی کا ہر صورت میں اس کی بات ماننی چاہیے۔ چنانچہ تفسیر المنار نے اجمالی طور پر اس قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"وبَعْضُهُم اَطْلَقَ فِي الحُكام فَأَجَبُوا اطاعَةَ كُلِّ حاكِمٍ۔"

"بعض افراد نے تمام حکمرانوں کی اطاعت پر اس کی تطبیق کی ہے اور انہوں نے ہر حاکم کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے۔"[1]

اس سے بھی زیادہ حیران کن امر وہ جعلی اور مشکوک روایات ہیں جو اس تفسیر کو ثابت کرنے کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ حدیث کہ یزید جعفی نے آنحضرتؐ سے سوال کیا: "يا نبي الله اَرَاَيْتَ اِنْ قامَتْ عَلَيْنَا اُمَرَاءُ يَسْئَلُونا حَقَّهُم و يَمْنَعُونَا حَقَّنا فَمَا تَأْمُرُنا؟" یعنی: "اے اللہ کے نبی! اگر ہم پر ایسے حکمران مسلط ہوجائیں جو ہم سے اپنا حق تو وصول کریں لیکن ہمارا حق ہمیں نہ دیں تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟" پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جواب دیا: "اِسْمَعُوا و اَطِيْعُوا۔" یعنی: "ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو۔"[2]

اسی کتاب میں ایک اور حدیث حضرت ابوذر سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: "اِنَّ خَلِيلِي اَوْصَانِي اَنْ اَسْمَعَ وَ اُطِيْعَ وَ اِنْ كانَ عَبْداً مُجَدِّعُ الاَطْرافِ۔" یعنی: "میرے دوست (رسول خدا) نے مجھے وصیت فرمائی ہے کہ میں (حکمرانوں) کے حکم کو سنوں اور اطاعت کروں؛ اگرچہ وہ لولہ لنگڑا غلام ہی کیوں نہ ہو۔" (بعض نے کہا ہے کہ مجدع الاطراف اُسے کہتے ہیں جو گندے اور گھٹیا

---

[1] تفسیر المنار، جلد ۵ ص ۱۸۱

[2] صحیح مسلم، جلد ۳، کتاب الامارہ، باب طاعۃ الامراء وان منعوا الحقوق، صفحہ ۱۴۷۴

گھرانے میں پیدا ہوا ہو)[۱]

یقیناً رسول اللہؐ کی ذات اقدس اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ عقل و منطق اور شریعت کے برخلاف اس طرح کا کوئی حکم دیں جب کہ خود آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ ''خالق کی معصیت اور نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔'' اِس قسم کی احادیث کے جعلی ہونے کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابوذر جس سے حدیث نقل کی گئی ہے اُس نے اپنی زندگی میں ایسا ہرگز نہیں کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے وقت کے حکمرانوں اور حاکموں کے انحراف کے خلاف کلمہ حق ادا کیا اور اسی راستے میں اپنی جان دے دی۔

بہرحال یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات اسی طرح کی باتوں سے پاک اور مبرا ہے۔ کوئی بھی عقلمند انسان یہ بات اپنی زبان پر نہیں لاسکتا کہ حکمران کی اطاعت ہر صورت میں ضروری ہے وہ جو کام چاہے کرے، جو حکم چاہے صادر کرے اور جو کوئی بھی ہو۔ بالخصوص اس حدیث کی موجودگی میں جو شیعہ اور سنی تمام علماء کے درمیان مشہور ہے کہ:

"لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ"

''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔''[۲]

"وَلَا طَاعَةَ لِبَشَرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ"

''اور اللہ تعالی کی نافرمانی میں کسی انسان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔''[۳]

پس نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ اس آیت کی بہترین تفسیر معصوم اماموں کی اطاعت ہے۔ ہاں! یہاں درج ذیل دو سوالوں پر گفتگو کی ضرورت باقی ہے:

۱۔ اگر اولی الامر کا معنی معصوم امام ہے تو یہ لفظ 'اولی' کے مطابق نہیں ہے؛ کیونکہ اُولی کا مطلب جمع ہے اور شیعہ عقیدے کے لحاظ سے ہر دور میں ایک ہی معصوم امام ہوتا ہے۔

گذشتہ بحث کی روشنی میں اس سوال کا جواب انتہائی واضح ہے یہ بات درست ہے کہ ہر زمانے میں امام معصوم ایک فرد ہے لیکن چونکہ آیت میں زمانے کے اعتبار سے عمومیت ہے یعنی تمام زمانوں کو شامل ہے، لہٰذا تمام ادوار میں موجود معصوم امام مجموعی طور پر ایک گروہ کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَعَلٰى اَرْوَاحِكُمْ وَاَجْسَادِكُمْ: یعنی، آپ پر سلام ہو آپ کی روحوں اور جسموں پر سلام ہو۔'' تو اس سلام پر ہرگز یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ ہر انسان کی روح اور جسم ایک سے زیادہ نہیں ہے تو پھر کیوں ارواح اور اجسام کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے، کیونکہ اس کے جواب میں

---

[۱] صحیح مسلم، جلد ۳، کتاب الامارہ، باب وجوب طاعة الامراء وان منعوا الحقوق، صفحہ ۱۴۸

[۲] نہج البلاغہ کلمات قصار، جملہ ۱۶۵

[۳] الدر المنثور، جلد ۳، صفحہ ۱۷۷

کہا جا سکتا ہے کہ جمع سے مراد مجموعہ ہے۔ اس بنا پر اگر چہ ہر زمانے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ہی معصوم جانشین تھا۔لیکن مجموعی طور پر مختلف زمانوں میں وہ متعدد افراد تھے لہٰذا ان کے لیے جمع کا لفظ ہی استعمال ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں امام معصوم تو موجود ہی نہیں تھا پھر کس طرح اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے؟

اس سوال کا جواب تقریباً وہی ہے جو پہلے بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ آیت صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور اور زمانے کی بات کررہی ہوتی تو یہ اعتراض بجا تھا جب کہ آیت تمام مسلمانوں کے لیے، قیامت تک کے لیے ایک کلی حکم بیان کررہی ہے اس لیے کوئی مشکل درپیش نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں خود آنحضرت ولی الامر تھے اور آپؐ کے بعد دیگر ادوار میں دیگر معصوم امام تھے، جیسے یوں کہا جائے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ رسول خدا اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کریں۔ اس بات کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان کے جانشین ان کے دور میں موجود بھی ہوں۔

آخر میں ہم اس آیت کے متعلق شیعہ وسنی کتب میں نقل ہونے والی ان احادیث کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہیں جو بتاتی ہیں کہ اس سے مراد علیؑ اور باقی آئمہ معصومینؑ ہیں۔ شیخ سلیمان قندوزی حنفی اپنی کتاب ''ینابیع المودۃ'' میں مجاہد کا قول نقل کرتے ہیں کہ: ''**اَطِيْعُوْ اللّٰهَ و اَطِيْعُوا الرَّسُولَ وَ اُوْلِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ**'' کی آیت اس موقع پر علیؑ کی شان میں نازل ہوئی جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں (جنگ تبوک پر جانے سے پہلے) مدینے میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ نیز وہ بیان کرتے ہیں کہ مہاجرین وانصار سے بحث کرتے ہوئے علیؑ نے اسی آیت سے استدلال کیا اور انصار ومہاجرین نے پھر کوئی اعتراض نہیں کیا۔[1]

شواہد التنزیل میں ''**اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اُولی الامر منکم**'' کی آیت کے حوالے سے حاکم حسکانی سے نقل کیا گیا ہے کہ علیؑ نے فرمایا: میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: ''**يَا نَبِيَّ اللّٰهِ مَنْ هُمْ؟ قَالَ اَنْتَ اَوَّلُهُمْ**'' یعنی: ''اے اللہ کے نبی! یہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم ان میں سے پہلے فرد ہو۔''[2] آئمہ اہل بیتؑ کے حوالوں سے بھی کافی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں اس آیت کی تفسیر آئمہ معصومین سے کی گئی ہے۔ اُن روایات کی تعداد دس سے زیادہ ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ اولوالامر سے مراد، آئمہ معصومینؑ ہیں۔[3]

---

[1] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶۔

[2] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۱۴۸، طبع بیروت

[3] مزید آگاہی کے حصول کیلئے تفسیر برہان جلد ۱ صفحہ ۳۸۱ تا ۳۸۷ اور تفسیر کنز الدقائق جلد ۳ صفحہ ۴۳۷ تا ۴۵۲ کا مطالعہ فرمائیں۔

ولایت وامامت عامہ، سنت کی روشنی میں

احادیث نبوی اور سنت پیغمبر اکرم ﷺ کا یہ حصہ بہت ہی وسیع ہے۔ اس بارے میں رسول خدا ﷺ سے بہت ساری احادیث مشہور ومعروف اسلامی کتب میں نقل ہوئی ہیں جن کا باریک بینی، انتہائی توجہ اور غیر جانبدارنہ مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس مسئلے پر سالہا سال سے پڑے پردے علم واخلاص کے نور کے پرتو میں اور انصاف پر مبنی گفتگو کے ذریعے ہٹ جائیں اور تعصب سے پاک اس علمی مسئلہ کا حقیقی چہرہ آشکار ہوجائے اور اس اہم ترین اسلامی امر کے حوالے سے ہمارا الٰہی افریضہ واضح ہوجائے۔

یہاں پر صرف ان چند احادیث کو ذکر کیا جائے گا جو امامت وولایت کے بارے میں بطور عام گفتگو کرتی ہیں اور ہم ان کے معنی و مفہوم کی مختصر تشریح پر اکتفا کریں گے اور ہم تمام قارئین سے مخلصانہ عرض کریں گے کہ وہ ان احادیث، ان کے منابع اور حوالوں کا دوبارہ مطالعہ کریں اور پھر ان کے مفہوم پر بھی غور کریں۔ وہ ان سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں، یہ ہم خود ان پر چھوڑتے ہیں۔ ہمارا نظریہ ہے کہ ان تمام حدیثوں کے باوجود کسی نتیجہ تک نہ پہنچنا، ان سے سرسری طور پر گزر جانا، یا حقائق سے چشم پوشی کر لینے سے ہماری ذمہ داری میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

۱۔ حدیث ثقلین

اس حدیث کو حدیث ثقلین اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا: ''**اِنّی تارِکٌ فیکم الثقلین**...[1]

رسولخدا ﷺ سے یہ حدیث بڑے وسیع پیمانے پر شیعہ اور سنی کی مشہور اور درجہ اول کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے اس طرح سے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے صدور میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ مجموعی طور پر اس حدیث سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے صرف ایک مرتبہ بیان نہیں فرمایا کہ حدیث ایک ہو اور اس کے روای بہت زیادہ ہوں بلکہ اسے مختلف مقامات پر ارشاد فرمایا اور یہ بالکل متعدد روایات ہیں۔ یہاں پر اس حدیث کے چند راویوں اور جن مشہور اسلامی کتب میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ صحیح مسلم جو کہ اہل سنت کے منابع کی درجہ اول کی کتاب ہے اور صحاح ستہ کی اہم ترین کتاب شمار ہوتی ہے۔ اس میں زید بن ارقم سے

---

[1] لفظ ''ثقلین'' کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے کبھی ''حَرَمَین'' کے وزن پر جس کا مفرد ''ثَقَل'' (بروزن حَرَم) ہے جس کا معنی ہے گرانقدر اور قدر وقیمت والی چیز۔ اور متاع مسافر کے معنی مین بھی استعمال ہوا ہے (اور دوسرا اعم ہے) یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ثَقَل (بروزن حَرَم) صفت مشبہہ ہے جب کہ ثِقْل (بروزن سِبْط) اسم مصدر ہے۔

منقول ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہے۔

قَامَ رَسُولُ اللهِ یَوماً فِینَا خَطِیباً بِماءٍ یُدعی خُمّاً بَینَ مَکَّةَ و المَدِینَة فَحَمَدَ اللهَ وَ اَثنٰی عَلَیهِ وَ وَعَظَ وَ ذَکَرَ ثُمَّ قَالَ: اَمَا بَعدُ ألا اَیُّهَا النَّاسُ فَاِنَّما اَنَا بَشَرٌ یُوشَکُ اَن یَأتِیَ رَسُولُ رَبِّی فَاُحبیبُ وَ اِنِّی تارِکٌ فِیکُم ثِقلَینِ: اَوَّلُهُما کِتابُ اللهِ فِیهِ الهُدیٰ و النُّورُ فَخُذُوا بِکتابِ اللهِ وَ استَمسِکُوا بِهِ فَحَثَّ عَلیٰ کِتابِ اللهِ و رَغَّبَ فِیهِ ثُمَّ قَالَ و اَهلِبَیتی، اُذَکِّرُکُمُ اللهَ فِی اَهلِبَیتی، اُذَکِّرُکُمُ اللهَ فِی اَهلِبَیتی، اُذَکِّرُکُمُ اللهَ فِی اَهلِبَیتی۔۔۔" [1]

رسول اللہ ﷺ مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی والی جگہ جسے خُم [2] کہا جاتا ہے ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بجالانے کے بعد وعظ ونصیحت فرمائی اس کے بعد فرمایا: ''اے لوگو! میں ایک بشر ہوں ممکن ہے بہت جلد اللہ کا بھیجا ہوا میری طرف آئے اور میں اس کی دعوت پر لبیک کہوں، میں تمہارے درمیان دوگرانقدر اور اہم چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، پہلی اللہ کی کتاب جس میں ہدایت اور روشنی ہے، پس کتاب الٰہی کو پکڑلو اور اس سے متمسک ہوجاؤ'' آپؐ نے قرآن کے بارے میں بہت زیادہ تشویق اور ترغیب دلائی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''اور میری اہل بیت اور تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ خدا کے لیے میری اہل بیت کو فراموش نہ کرنا، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ خدا کے لیے میری اہل بیت کو نہ چھوڑنا، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ خدا کے واسطہ میری اہلبیت کو ترک نہ کرنا۔''

دوگرانقدر چیزوں کے عنوان سے اہل بیت کو قرآن کے ساتھ ذکر کرنا، اور ان کے بارے میں الٰہی ذمہ داری کا یاد دلانا اور اس پر تین مرتبہ تاکید کرنا، ظاہر کرتا ہے کہ اس چیز کا مسلمانوں کی تقدیر، ان کی ہدایت اور اسلام کے اصولوں کی حفاظت کے ساتھ تعلق اور ربط ہے اگر یوں نہ ہوتا تو اسے قرآن کے ساتھ بیان نہ کیا جاتا۔

۲۔ مذکورہ کتاب میں اُسی راوی سے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک اور روایت بھی بیان ہوئی ہے۔ [3] قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب اسی حدیث کے آخر میں زید بن ارقم سے سوال ہوا کہ: ''**کیا اہل بیت سے مراد آنحضرتؐ کی ازواج ہیں؟**'' تو انہوں نے جواب دیا: ''**اہل بیت**

---

[1] صحیح مسلم، جلد ۴، صفحہ ۱۸۷۳

[2] صحیح مسلم کے حاشیہ میں آیا ہے کہ غدیر خم جحفہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔

[3] صحیح مسلم، جلد ۴، صفحہ ۱۸۷۳

سے مراد آپؐ کے نسبی رشتہ دار ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔''

۳۔سنن ترمذی جو''صحیح ترمذی'' کے نام سے بھی مشہور ہے، اس میں ''مناقب اہل بیت'' کے باب میں جابر بن عبداللہ سے منقول ایک حدیث ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ حج کے موقعہ پر عرفہ کے دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے مخصوص اونٹ پر سوار ہوکر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا وہ فرما رہے تھے:

"یاَاَیُّها النّاسُ اِنّی قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مااِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّو کتابَ اللهِ وعِتْرَتی اَهْلَبَیْتی"[۱]

''اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑی ہیں اگر تم نے انہیں پکڑے رکھا (اوران کے دامن کو تھامے رکھا) تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، کتاب الٰہی اور میری عترت واہل بیت ÷ ''

اس کے بعد امام ترمذی کہتے ہیں کہ اسی مطلب کو حضرت ابوذر، حضرت ابوسعید خدری، حضرت زید بن ارقم اور حضرت حذیفہ نے بھی نقل کیا ہے۔

۴۔اسی کتاب میں کچھ صفحات بعد جناب ابوسعید اور جناب زید بن ارقم سے نقل ہوا ہے کہ ان دونوں نے کہا:

"قالَ رَسُولُ اللهِ اِنّی تارِكٌ فِیکُمْ ما اِن تَمَسَّکْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدی : اَحَدُ هُما اَعْظَمُ مِنَ الاٰخَرِ، کتابُ اللهِ حَبْلٌ مَمْدُودٌ مِنَ السَّماءِ اِلَى الارضِ وَعِتْرَتی اَهْلُبَیْتی وَلَنْ یَفْتَرِقا حَتّٰی یَرِدا عَلَیَّ الحَوْضَ،فانْظُرُوا کَیْفَ تُخْلِفُونی فِیهِما"[۲]

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تمہارے درمیان ایک چیز یادگار کے طور پر چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے اس سے تمسک رکھا تو میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے، ان میں سے ایک دوسری سے عظیم ہے، کتاب الٰہی ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک کھنچی ہوئی ہے (اور دوسری) میری عترت اہل بیت ÷ ہے، اور یہ دونوں کبھی آپس میں جدا نہیں ہوں گے، یہانتک کہ میرے پاس حوض (کوثر) پر پہنچ جائیں گے، پس دیکھو خیال رکھنا میرے بعد تم ان کے ساتھ کیا سلوک کروگے۔''

۵۔سنن دارمی، یہ بھی حدیث کی بڑی مشہور کتاب ہے، زید بن ارقم کی حدیث کی طرح کی، حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ہے۔جس میں بڑی صراحت کے ساتھ ثقلین اور کتاب اللہ اور اہل بیت ÷ کا نام ذکر ہوا ہے[۳] یاد رہے کہ بعض محققین کے مطابق جناب

---

[۱] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۶۳، باب مناقب اہل بیت النبی حدیث ۳۷۸۶

[۲] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۶۳، باب مناقب اہل بیت النبی حدیث ۳۷۸۸

[۳] سنن دارمی، جلد ۲، صفحہ ۴۳۲ (طبع دارالفکر بیروت)

''دارمی'' امام مسلم، امام ابوداود اور امام ترمذی کے بھی استاد ہیں، کتاب ''سنن دارمی'' اہل سنت کی مشہور صحاح الستہ میں سے ایک ہے (اگر چہ بعض نے اسکی جگہ پر سنن ابن ماجہ کو ذکر کیا ہے)

٦۔ امام احمد، اہل سنت کے چار مشہور اماموں میں سے ایک ہیں ان کی کتاب مسند احمد میں ایک حدیث حضرت زید بن ثابت سے نقل ہوئی ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ خَلِيفَتَيْنِ: كتاب اللهِ حَبْلٌ مَمْدُودٌ ما بَيْنَ السَّماءِ إلَى الارضِ وَ عِتْرَتِي اَهْلُبَيْتِي وَلَنْ يَفْتَرِقا حَتَّى يَرِدا عَلَيَّ الحَوْضَ". [۱]

''میں تمہارے درمیان دو خلیفہ (جانشین) چھوڑ کر جارہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب جو ایسی رسی ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان بندھی ہوئی ہے اور دوسری میری عترت اور اہل بیت ÷ ہیں۔ یہ دو آپس میں کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض (کوثر) تک پہنچ جائیں گے''

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ان میں سے بعض روایات میں ''ثقلین'' کا لفظ ذکر ہوا ہے (جیسے صحیح مسلم کی روایت میں) اور بعض میں ''خلیفتین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (جیسے آخری روایت جو مسند احمد سے نقل ہوئی ہے) اور بعض میں ان دو میں سے کوئی لفظ بیان نہیں ہوا لیکن ان دو کا معنی اور مفہوم ضرور بیان ہوا ہے۔ درحقیقت ان سب کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہوتی ہے۔

۷۔ احمد بن شعیب نسائی کا شمار اہل سنت کے بزرگان میں ہوتا ہے اور ان کی کتاب سنن نسائی صحاص الستہ میں سے ایک ہے، وہ اپنی کتاب ''خصائص'' میں حضرت زید بن ارقم سے بیان کرتے ہیں، جب رسول اکرم ﷺ حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خُم کے مقام پر پہنچے تو آپ ؐ نے ایک سایبان بنانے کا حکم دیا اور اس کے نیچے جگہ کو صاف ستھرا کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپ ؐ نے ارشاد فرمایا:

كَاَنِّي دُعِيتُ فَاَجَبْتُ وَاِنِّي تارِكٌ فِيكُمُ الثَّقْلَيْنِ اَحَدُهُما اَكْبَرُ مِنَ الآخَرِ كِتابَ اللهِ وَعِتْرَتِي فَانْظُرُوا كَيْفَ تُخْلُفُونِي فِيهِما ،فَاِنَّهُما لَنْ يَفْتَرِقا حتى يَرِدا عَلَيَّ الحَوْضَ،ثُمَّ قالَ اِنَّ اللهَ مَوْلايَ وَاَنَا مَوْلى كُلِّ مُؤمِنٍ ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِ عَلِيٍ عليه السَّلامُ فَقالَ مَنْ كُنْتُ مَوْلاهُ فَهَذا وَلِيُّهُ اَللّهُمَّ والِ مَنْ وَالاهُ وعادِ مَنْ عاداهُ [۲]

''گویا مجھے (اللہ کی طرف سے) بلایا گیا ہے اور میں نے لبیک کہا ہے (بہت جلدی تمہارے درمیان سے چلا جاؤں گا) میں تمہارے درمیان دو گرانقدر اور قیمتی چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ان میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، کتاب اللہ، اور میری عترت واہل بیت پس خیال رکھنا میرے بعد ان سے کیا سلوک کرتے

[۱] مسند امام احمد، جلد ۵، صفحہ ۱۹۲، (طبع دار الصادر بیروت)

[۲] خصائص نسائی، صفحہ ۲۰، (طبع التقدم) مصر میں (مطابق نقل فضائل الخمسہ) جلد ۲، صفحہ ۵۴۔

ہو، کیونکہ یہ دونوں آپس میں جدا نہیں ہوں گے یہانتک کہ میرے پاس حوض (کوثر) پر پہنچ جائیں گے، پھر فرمایا: اللہ میرا مولی اور سرپرست ہے اور میں ہر مومن کا ولی اور سرپرست ہوں اس کے بعد آپؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑا کر فرمایا: جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہیں، اے اللہ تو اُسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمنی رکھ اُس سے جو اس سے دشمنی کرے۔''

حدیث کے آخر میں مذکور ہے کہ اس حدیث کے دوسرے راوی جناب ابوطفیل کہتے ہیں کہ میں نے زید بن ارقم سے پوچھا کیا تم نے اپنے کانوں سے رسول اللہ ﷺ کی بات سنی ہے؟ اس نے کہا جو کوئی بھی اُس سائبان کے نیچے تھا اُس نے اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا بھی اور دونوں کانوں سے سنا بھی۔ یہ حدیث واضح طور پر بتا رہی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس بات کو مجمع عام میں اور لوگوں کی کثیر تعداد کی موجودگی میں غدیر خم کے میدان میں بیان فرمایا اور سب نے اپنے کانوں سے اسے سُنا۔

۸۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک بڑے عالم حاکم نیشاپوری کی ایک کتاب ''مستدرک الصحیحین'' ہے۔ جس میں انہوں نے ان حدیثوں کو نقل کیا ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بیان نہیں ہوئیں لیکن ان دونوں کے معیار اور اصولوں پر پوری اترتی ہیں۔ یہ کتاب اہل سنت کی اہم ترین کتب میں سے ہے۔ اس میں حاکم نیشاپوری ابن واصلہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا کہ میں نے زید بن ارقم سے سُنا ہے کہ رسول اکرم ﷺ مکہ اور مدینے کے درمیان ایسے درختوں کے پاس پہنچے جہاں پانچ سایہ دار درخت موجود تھے۔ وہاں پر آپ سواریوں سے اتر پڑے۔ لوگوں نے درختوں کے نیچے صفائی کر دی، اس کے بعد پیغمبرؐ نے عصر کی نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالانے کے بعد بہت زیادہ وعظ و نصیحت کی پھر فرمایا:

"اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا اِنِ اتَّبَعْتُمُوهُمَا وَهُمَا كِتَابُ اللهِ وَاَهْلُبَيْتِي عِتْرَتِي"

''اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں اگر تم نے ان کی پیروی کی تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت و اہل بیت''[۱]

اس کے بعد حاکم مزید لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔[۲]

۹۔ ابن حجر ہیثمی، حجاز کے مفتی اور شیعہ کے سخت مخالف تھے، وہ اپنی کتاب ''الصواعق المحرقہ'' میں لکھتے ہیں:

---

[۱] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۰۹۔

[۲] ان دو افراد کی شرط سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف اس حدیث کو نقل کرتے تھے جس کی سند کا سلسلہ پیغمبرؐ سے متصل ہو، اس کے راوی ان کی نظر میں قابل اعتماد اور غیر مہتم ہوں، اس وجہ سے کہ انہوں نے ان تمام احادیث کو نقل نہیں کیا جو ان کی شرائط پر پوری اترتی تھیں، حاکم نیشاپوری نے ان کی شرائط پر پوری اترنے والے احادیث کو اپنی کتاب ''مستدرک'' میں جمع کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ''مستدرک'' کو صحیح مسلم اور صحیح بخاری کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

"فِي رِوايَةٍ صَحِيحَةٍ كانى قَدْ دُعيتُ فَاَجَبْتُ اِنِّى قَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمُ الثَّقْلَيْنِ اَحَدُهُما آكَدُ مِنَ الآخَرِ كتابَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَعِتْرَتِي فَانْظُرُوا كَيْفَ تُخْلِفُونِي فِيهِما فَاِنَّهُمالَنْ يَفْتَرِقا حَتّى يَرِدا عَلَيَّ الحَوْضَ"

''صحیح روایت میں ہے کہ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا) گویا مجھے بلایا گیا ہے اور میں نے لبیک کہا ہے میں دو قیمتی اور وزنی چیزیں تمہارے درمیان چھوڑے جارہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت ہے پس خیال رکھنا میرے بعد تم ان کا حق کس طرح ادا کرتے ہو، یہ دو آپس میں کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض (کوثر) پہنچ جائیں گے۔''

وہ مزید بیان کرتے ہیں: ایک اور روایت میں یہ اضافی بات بھی نقل ہوئی ہے:

"سَئَلْتُ رَبِّي ذَلِكَ لَهُما فَلا تَتَقَدَّمُوهُما فَتَهْلُكُوا وَلَا تَقْصُرُوا عَنْهُما فَتَهْلُكُوا وَلَا تُعَلِّمُوهُمْ فَاِنَّهُمْ اَعْلَمُ مِنْكُمْ"

''میں نے اس مقام کو اپنے پروردگار سے ان کے لیے مانگا ہے پس تم ان سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہ جانا پھر بھی ہلاک ہو جاؤ گے، انہیں کوئی چیز سکھانے کی کوشش مت کرنا کیونکہ وہ تم سے زیادہ عالم ہیں''

اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے طرق اور راوی بہت زیادہ ہیں ان کی تعداد بیس (۲۰) تک پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی تفصیل اور تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔[۱] اس حدیث کے وسعت دامن (تواتر کی حد تک) کا واضح اعتراف قابل توجہ ہے اور وہ بھی اُس شخص کی طرف سے جس نے مسئلہ امامت میں شیعہ پر سخت ترین اعتراضات کیے ہوں۔

۱۰۔ ابن ایثر (محمد بن عبدالکریم) مشہور و معروف کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی کتاب 'اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ' ہے اس میں وہ عبداللہ بن حنطب کے حالات میں بیان کرتے ہیں کہ اُس نے نقل کیا ہے:

"خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ بِالْجُحْفَه فَقَالَ اَلَسْتُ اَوْلىٰ بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ ؟ قالُو بلىٰ يا رسول اللهِ! قال اِنِّي سائِلُكُمْ عَنْ اِثْنَتَيْنِ عَنِ الْقُرآن، وَعَنْ عِتْرَتِي"[۲]

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جحفہ کے مقام (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ) پر ہمارے لیے ایک خطبہ دیا

[۱] صواعق، صفحہ ۲۲۶، طبع عبدالطیف مصر۔

[۲] اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ، جلد ۳، صفحہ ۱۴۷، (طبع مصر و بیروت)

اور فرمایا: کیا میں تم پر تمہارے سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ سب نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ ﷺ! آپؐ نے فرمایا: میں (قیامت کے دن) تم سے دو چیزوں کے بارے میں سوال کروں گا، ایک قرآن اور دوسری میری عترت''

۱۱۔ جلال الدین عبد الرحمن سیوطی، اہل سنت کے بزرگ علما میں سے ہیں اور بہت ساری کتب کے مصنف ہیں [۱] انہوں نے اپنی کتاب ''احیاء المیت'' میں اُسی بات کو بیان کیا ہے جو ابن اثیر نے اُسد الغابہ میں ذکر کی ہے۔ [۲]

۱۲۔ ابوبکر احمد بن الحسین بیہقی، وہ شخصیت ہیں کہ جن کے بارے میں زمخشری کہتے ہیں: ''مذہب شافعیہ کے امام شافعی، تمام شافعیوں کی گردن پر حق رکھتے ہیں؛ لیکن بیہقی کا اپنی تصنیفات کی وجہ سے خود امام شافعی اور تمام شافعی مذہب رکھنے والوں پر احسان ہے۔'' [۳] اسی ابوبکر احمد بن الحسین نے بھی اس حدیث کو اپنی اہم ترین کتاب ''السنن الکبریٰ'' میں ذکر کیا ہے۔ (اس نے تقریباً وہ بات کی ہے جو صحیح مسلم میں آئی تھی کہ جس میں خصوصیت کے ساتھ اہل بیت کا ذکر تین بار ہوا ہے) [۴]

۱۳۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے حافظ طبرانی اہل سنت کے بہت بڑے محدث ہیں اور بعض افراد کے بقول انہوں نے حدیث میں ایک ہزار سے زیادہ اساتیذ سے استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''المعجم الکبیر'' میں اپنی سند سے رسول اکرم ﷺ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ثقلین کی پیروی کرنے کی دعوت دی تو ایک شخص کھڑا ہوا اور اُس نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! ثقلین کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا:

''اَلاَکْبَرُ کِتابُ اللّٰہِ سَبَبٌ طَرَفُہُ بِیَدِ اللّٰہِ وَ طَرَفُہُ بِاَیْدِیْکُمْ فَتَمَسَّکُوا بِہِ لَنْ تَزَالُو وَ لاَتَضِلُّوا، وَ الاَصْغَرُ عِتْرَتِی وَ انَّھُما لَنْ یَفْتَرِقا حَتّیٰ یَرِدا عَلَیَّ الْحَوْضَ''

''ثقل اکبر، اللہ کی کتاب ہے، جس کا ایک سرا اللہ کے دست (قدرت) میں ہے اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے، پس اس سے وابستہ رہو تو کبھی نابود نہ ہو گے اور نہ گمراہ ہو گے اور ثقل اصغر میری عترت ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں گے۔''

اس کے بعد آنحضرتؐ نے مزید فرمایا: میں نے اس چیز کو ان دو کے بارے میں اپنے رب سے طلب کیا ہے۔ پس ان سے آگے

---

[۱] کہا گیا ہے کہ اس نے پانچ سو زیادہ کتب تالیف کی ہیں (الکنی والالقاب، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۴)

[۲] احیاء المیت جو کہ الاتحاف کے حاشیہ پر چھپی ہے، ص ۱۶۔

[۳] الکنی والالقاب، جلد ۲، صفحہ ۱۱۴

[۴] سنن بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۴۔

نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے اور انہیں کوئی بات سکھانے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ یہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔[1]

۱۴۔ابن تیمیہ (احمد بن عبدالحلیم حنبلی، جس کی وفات ۷۲۸ھ میں ہوئی) جو کہ وہابی مذہب کے بانی ہیں، انہوں نے اپنی کتاب منھاج السنہ میں اس حدیث کو بالکل اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح وہ صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے۔[2]

اہل سنت کے جانے پہچانے اور مشہور و معروف چند دیگر دانشمندوں نے بھی حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

۱۵۔ابن مغازلی (علی بن محمد، شافعی مذہب کے فقہاٴ میں سے ہیں اور پانچویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں) نے حدیث ثقلین کو پوری تفصیل کے ساتھ زید بن ارقم سے نقل کیا ہے۔[3]

۱۶۔چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم، فقیہ، محدث، خطیب اور شاعر خوارزمی نے اس حدیث کو اپنی کتاب ''مناقب'' میں ذکر کیا ہے۔[4]

۱۷۔ذھبی (محمد بن احمد بن عثمان دمشقی شافعی) ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں، اپنے مذہب میں تعصب میں مشہور ہیں۔ان کے بارے میں تاج الدین سبکی ''طبقات الشافعیہ'' میں کہتے ہیں: ''وہ اپنے زمانے کے نامور محدث، خاتم حفاظ، مذہب اہل سنت والجماعت کے علمدار اور ہمارے دور کے لوگوں کے پیشوا تھے۔'' انہوں نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب ''تلخیص المستدرک'' میں بیان کیا ہے۔[5]

۱۸۔مشہور مؤرخ علی بن برھان حلبی، جن کا شمار گیارہویں صدی ہجری کے علماء میں ہوتا ہے انہوں نے اپنی کتاب ''انسان العیون'' جو کہ سیرہ حلبی کے نام سے معروف ہے، میں حدیث ثقلین کو حدیث غدیر کے بیان کے ضمن میں صریح الفاظ میں اسی طرح نقل کیا ہے جیسے گذشتہ کتب میں بیان ہوئی ہے۔اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد وہ بڑی صراحت سے کہتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے جو کہ صحیح اور حسن اسناد کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔[6]

۱۹۔ابن حیان مالکی نے اپنی کتاب ''المقتبس فی احوال الاندلس'' میں صحیح مسلم کی حدیث کے ساتھ ملتی جلتی حدیث بیان کی ہے، لیکن مکہ و مدینہ کے درمیان جس جگہ پر رسول خدا ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اُسے ''حصائن'' کا نام دیا ہے جس کا معنی قلعے ہوتا ہے۔[7]

---

[1] المعجم الکبیر، صفحہ ۱۳۷ (احقاق الحق، ج۹ ص ۳۲۲ کے مطابق)

[2] منہاج السنۃ، جلد ۴، صفحہ ۴۳۸، چاپ قاہرہ۔

[3] احقاق الحق، جلد ۴، صفحہ ۴۳۷ (ان کے خطی نسخے کے مطابق)

[4] مناقب، صفحہ ۹۳۔

[5] یہ کتاب مستدرک حاکم کے حاشیہ پر حیدر آباد دکن میں چھپی ہے، جلد ۳، ص۱۰۹۔

[6] سیرۃ حلبی، جلد ۳، صفحہ ۲۷۴، طبع قاہرہ۔

[7] المقتبس، صفحہ ۱۶۷، (طبع پیرس)

۲۰۔علاء الدین علی بن محمد بغدادی المعروف ''خازن'' آٹھویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔انہوں نے بھی اپنی تفسیر میں اُسی حدیث کونقل کیا ہے جو صحیح مسلم اور صحیح ترمذی میں منقول ہے۔[۱]

۲۱۔ابن ابی الحدید معتزلی (عزالدین عبدالحمید) کا شمار ساتویں صدی ہجری کے مشہور علماء میں ہوتا ہے،انہوں نے شرح نہج البلاغہ میں اس حدیث کونقل کرتے ہوئے کہا ہے:''قَدْ بَیَّنَ رسولُ اللهِ(ص) عِتْرَتَهُ مَنْ هِیَ؟ لما قال اِنّی تارِكٌ فِیكُمُ الثَقْلَیْنِ فقال عِتْرَتِی اَهْلُبَیْتِی۔'' یعنی: ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عترت کی تشریح فرمائی ہے آپؐ نے فرمایا ہے کہ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں پھر فرمایا: میری عترت یعنی میرے اہل بیتؑ۔''

اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ ایک اور مقام پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیت کی بھی وضاحت فرمائی ہے جب آپؐ نے ان پر چادر ڈالی اور جب آیت: ''انما یرید الله لیذهب........'' نازل ہوئی، آپؐ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا: اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیتؑ پلیدی اور رجس کو ان سے دُور فرما۔[۲]

۲۲۔ذینی دحلان شافعی (سید احمد) مکہ کے مفتی اور تیرھویں صدی کے علماء میں سے ہیں،ان کی تالیفات بہت ساری ہیں،اپنی کتاب ''سیرہ نبویہ''جو کہ سیرہ حلبی کے حاشیہ پر چھپی ہے، میں انہوں نے بعینہ اُسی طرح اس حدیث کو بیان کیا ہے جس طرح صحیح مسلم میں منقول ہے اور جس طرح مسند احمد حنبل میں ابو سعید خدری سے مروی ہے۔[۳]

خلاصہ کلام

یہ تھے اسلام کی پہلی صدی سے لے کر آخری صدی تک کے نامور اور مشہور علماء جنہوں نے اپنی اہم ترین کتب میں حدیث ثقلین کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔لیکن اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس حدیث کے ناقلان میں سے یہ ایک معمولی تعداد ہے۔عبقات الانوار کے خلاصہ کے مطابق میر حامد حسین ہندی مرحوم نے ایک سو چھبیس (۱۲۶) مشہور کتابوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے ہر کتاب کی بعینہ عبارت کو کتاب کی جلد اور صفحہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔[۴]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کونقل کرنے والے صرف جابر بن عبداللہ انصاری یا ابو سعید خدری اور زید بن ارقم نہیں بلکہ اِسے کم از کم تیئس (۲۳) اصحاب رسول نے بلا واسطہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

جن کے نام درج ذیل ہیں۔

---

[۱] تفسیر خازن جلد ۱، صفحہ ۴ (طبع قاہرہ)

[۲] شرح نہج البلاغہ، جلد ۲، صفحہ ۴۳۷، طبع قاہرہ اور جلد ۶، صفحہ ۳۷۵، طبع حلبی بیروت خطبہ ۸۶

[۳] سیرۃ نبویہ، جلد ۲، صفحہ ۳۰۰، اور سیرۃ حلبی کی جلد ۳، صفحہ ۳۳۳ پر بھی آئی ہے جو مصر میں چھپی ہے۔

[۴] عبقات الانوار کے خلاسہ کے نقل کے مطابق، ج ۲، صفحہ ۱۰۵ تا ۲۴۲، چاپ مؤسسۃ البعثہ۔

۱۔زید بن ارقم
۲۔ابوسعید حذری
۳۔جابر بن عبداللہ انصاری
۴۔حذیفہ بن اُسَیْد
۵۔خُزیمہ بن ثابت
۶۔زید بن ثابت
۷۔سھل بن سعد
۸۔ضُمرۃ الاسلمی
۹۔عامر بن لیلی
۱۰۔عبدالرحمن بن عوف
۱۱۔عبداللہ بن عباس
۱۲۔عبداللہ بن عمر
۱۳۔عدی بن حاتم
۱۴۔عقبۃ بن عامر
۱۵۔علی ابن ابی طالب
۱۶۔ابوذری غفاری
۱۷۔ابورافع
۱۸۔ابی شریح خزاعی
۱۹۔ابوقدامہ انصاری
۲۰۔ابوھریرہ
۲۱۔ابی ہیثم بن تیھان
۲۲۔اُمّ سلمہ
۲۳۔اُمّ ھانی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر حدیث ثقلین کا تکرار

یہ بات بھی انتہائی قابل توجہ ہے کہ اس حدیث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط ایک مرتبہ ارشاد نہیں فرمایا (حدیث غدیر کی طرح جسے آپؐ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا اور بہت زیادہ لوگوں نے اُسے سنا اور نقل کیا) بلکہ حدیث ثقلین کو آپؐ نے مختلف مواقع پر اور مختلف حوالوں سے بیان فرمایا ہے۔ اہل سنت کی کتب کے مطابق جن مقامات پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ غدیر خم پر جب آنحضرتؐ حجۃ الوداع سے واپس آرہے تھے۔ آپؐ نے اس مقام پر قیام فرمایا اور اپنے تفصیلی خطبے میں اس حدیث کو بیان فرمایا۔ یہ وہی بات ہے جو ہم نے اس سے قبل صحیح مسلم اور خصائص نسائی سے اسناد اور حوالوں کے ساتھ ذکر کی ہے۔

۲۔ حج کے دوران عرفہ کے دن، جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونٹ پر سوار تھے اور آپؐ نے خطبہ دیتے ہوئے اس حدیث کو بیان فرمایا۔ اسی بات کو ترمذی نے صحیح ترمذی میں جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے اور سلسلہ حدیث کے نمبر ۲ میں بیان ہوئی۔

۳۔ جحفہ کے مقام پر جو کہ حج کا ایک میقات ہے اور مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے آپؐ نے اس حدیث کو ذکر فرمایا۔ جیسا کہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں عبداللہ بن خطیب کے حالات زندگی میں اِسے بیان کیا ہے اور اس سے پہلے ہم نے اِسے سلسلہ حدیث کے نمبر ۸ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

۴۔ جب آنحضرتؐ نے مرض الموت میں اپنی آخری وصیتیں فرمائیں تو اس میں ثقلین کے بارے میں وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

اَیُّھا النّاسُ یُوشِكُ اَنْ اُقْبَضَ قَبْضًا سَرِیعاً فَیُنْطَلَقُ بِی و قَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمُ القَوْلَ مَعْذِرَۃً اِلَیْکُمْ اِلَّا اِنِّی مُخَلِّفٌ فِیکم کِتَابَ رَبِّی عَزَّ وَ جَلَّ وَ عِتْرَتِی اَھْلَبَیْتِی ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِ عَلِیٍّ فَرَفَعَھا، فقالَ ھذا عَلِیٌّ مع القرآن و القرآن مَعَ عَلِیٍّ لایَفْتَرِقانِ حتّی یَرِدا عَلَیَّ الحوضَ فاسْئَلُوھُما ما خَلَّفْتُ فِیہِمَا"۔

''اے لوگو! میں بہت جلد تمہارے درمیان سے جانے والا ہوں اور میں نے تم سب کے لیے حجت تمام کر دی ہے۔ آگاہ رہو میں تمہارے پاس خدائے بزرگ و برتر کی کتاب اور اپنی عترت واہل بیت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ پھر آپؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور بلند کیا اور فرمایا: ''یہ علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ ہے اور یہ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض (کوثر) پر پہنچ جائیں گے ان دونوں سے پوچھو اُس چیز کے بارے میں جو میں نے ان دو میں بطور یادگار چھوڑی ہے۔''[1]

اس حدیث میں دقیق اور ظریف نکات ہیں جو معنی آشنا لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

---

[1] الصواعق المحرقہ، ص ۷۵۔

۵۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر مسجد خیف میں ارشاد فرمایا:

الا و انی سائلکم عن الثقلین، قالو یا رسول اللہ و ما الثقلین؟ قال کتاب اللہ الثقل الاکبر، طرف بید اللہ و طرف بایدیکم، فتمسکوا بہ لن تضلوا و لن تزلوا و عترتی و اھلبیتی، فانہ قد نبأنی الطیف الخبیر انھما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض کاصبعی ھاتین۔"

"آگاہ رہو میں تم سے ثقلین کے بارے میں پوچھوں گا! لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ثقلین کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ثقل اکبر قرآن مجید ہے جس کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے دست (قدرت) میں ہے اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ پس اس سے وابستہ رہو، کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور ہمیشہ ثابت قدم رہو گے۔ دوسری گرانقدر چیز، میری عترت و اہل بیتؑ ہیں۔ تحقیق لطیف وخبیر اللہ نے مجھے آگاہ فرمایا ہے کہ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر نہ پہنچ جائیں؛ یہ دونوں میری ان ملی ہوئے دو انگلیوں کی طرح ایک ساتھ رہیں گے۔"[۱]

۶۔ (فتح مکہ کے بعد) طائف سے واپسی پر آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ حدیث بیان فرمائی اور انہی نکات کو ذکر کیا۔[۲]

اس حدیث کا بار بار بیان کرنا اور مختلف جگہوں، مدینہ میں، حج کے ایام میں، عرفہ کے دن، مسجد خیف (منی کے دِنوں) میں، مکہ اور مدینہ کے درمیان اور دیگر مقامات پر اس کی اس قدر تاکید اس بات کا بین ثبوت اور واضح دلیل ہے کہ ان دو گرانقدر چیزوں سے تمسک اور وابستگی کا مسئلہ تقدیر ساز اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ رسول خدا ﷺ نے مسلمانوں کو ان دو کی اہمیت سے حتی المقدور آگاہ کرنے کی سعی فرمائی تا کہ مسلمان ہدایت پر قائم رہیں اور گمراہ نہ ہوں۔ حیرت کی بات ہوگی اگر ہم اس مکرر بیان اور بار بار تاکید کے باوجود ان کے دامن کو چھوڑ دیں اور اپنے آپ کو گمراہی میں ڈال دیں یا غلط تاویلات کے ذریعے اس کی اہمیت کو کم کریں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ایک ایسی حدیث سے سرسری طور پر گزر جائیں جسے رسول اکرم ﷺ کے بیس سے زیادہ اصحاب نے نقل کیا ہو، درجہ اول کی اسلامی کتب میں وہ مذکور ہو، تقریباً دو سو مشہور اسلامی کتب میں اس کا تذکرہ ہو، نہ اس کی سند میں کوئی شک وشبہہ ہو اور نہ اس کی دلالت میں کوئی ابہام موجود ہو، ایسی روایت کو معمولی اور سرسری لینا، قطعاً انسان کے کاندھوں پر ایک بھاری ذمہ داری عائد کر دیتا ہے۔

---

[۱] الصواعق المحرقہ، ص ۷۵۔

[۲] تفسیر علی بن ابراہیم بحارالانوار کے نقل کے مطابق، جلد ۲۳، ص ۱۲۹، حدیث ۶۱۔

جو شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبین اور امین وحی کے طور پر پہنچانتا ہے اور ان کی طرف سے ان دو گرانقدر چیزوں سے تمسک اور وابستہ رہنے پر بہت زیادہ تاکید کو واضح طور پر دیکھتا ہو اس طرح کہ آپؐ نے عدم گمراہی کو ان دو کی پیروی میں حساب کیا ہو تو اُسے جان لینا چاہیے اس بات میں اہم ترین راز پوشیدہ ہے اور اسلام کے اصولوں میں سے کوئی اہم اصول یہاں پر موجود ہے۔(غور کیجیے گا)

حدیث ثقلین سے حاصل ہونے والے اہم ترین نکات

یہ حدیث شریف جن اہم ترین خطوط کی طرف مسلمانوں کی راہنمائی کرتی ہے، ذیل میں ہم اُن میں سے بعض کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کرتے ہیں:

۱۔قرآن اور اہل بیتؑ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ان میں جدائی نہیں ہوسکتی۔وہ افراد جو قرآن کے حقائق کے طالب ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اہل بیتؑ کے دامن کو تھام لیں۔

۲۔جس طرح قرآن کی پیروی اور اطاعت بلا قید و شرط مسلمانوں پر لازم اور واجب ہے، اسی طرح اہل بیتؑ کی پیروی اور اطاعت بھی بلا قید و شرط واجب ہے۔

۳۔اہل بیتؑ معصوم ہیں کیونکہ ایک طرف تو قرآن سے جدائی نہیں ہوسکتی، دوسری طرف بغیر قید و شرط ان کی پیروی لازم ہے۔یہ ان کی غلطی، خطا اور گناہ سے پاک ہونے اور ان کی عصمت کی دلیل ہے۔کیونکہ اگر ان میں غلطی یا گناہ کا اندیشہ ہوتا تو وہ قرآن سے جدا ہو جاتے اور ان کی پیروی مسلمانوں کو ضلالت اور گمراہی سے بچانے کی ضمانت نہ بنتی۔اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ان کی پیروی سے گمراہیوں سے محفوظ رہو گے، ان کی عصمت کی واضح دلیل ہے۔

۴۔ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ لائحہ عمل قیامت تک آنے والے تمام ادوار کے مسلمانوں کے لیے ترتیب دیا ہے۔آپؐ نے فرمایا:''یہ دونوں اکھٹے رہیں گے اور حوض کوثر پر ایک ساتھ میرے پاس پہنچیں گے۔''اس سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام ادوار میں اہل بیتؑ میں سے ایک فرد معصوم پیشوا کے طور پر موجود رہے گا، جس طرح قرآن ہمیشہ چراغ ہدایت ہے وہ بھی ہمیشہ چراغ ہدایت ہیں، پس ہمیں ہر زمانے اور ہر دور میں انہیں تلاش کرنا چاہیے۔

۵۔اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیتؑ سے جدا ہونا یا ان سے آگے بڑھ جانا، گمراہی کا باعث ہے اور کسی انتخاب کو بھی ان کے انتخاب پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

۶۔وہ سب سے افضل، اعلم اور برتر ہیں۔

ہاں! مذکورہ حدیث سے مندرجہ بالا نکات اخذ کرنے میں کوئی ابہام موجود نہیں۔دلچسپ امر یہ ہے کہ نویں اور دسویں

ہجری کے عالم ''سمھودی''[1] شافعی جو کہ کتاب ''وفاء الوفا'' کے مصنف ہیں وہ حدیث ثقلین کے متعلق لکھی گئی اپنی کتاب ''جواہر العقدین'' میں لکھتے ہیں:

اِنَّ ذلك يُفْهِمُ وُجُودَ مَنْ يَكُونُ اَهْلاً لِلتَّمَسُّكِ بِهٖ مِنْ اَهْلِ البَيْتِ و العِتْرَةِ الطّاهِرَةِ فِي كُلِّ زمانٍ وُجِدُوا فِيه الى قيام السَّاعَةِ حَتّٰى يَتَوَجَّهُ الحَثُّ المَذْكُورُ اِلَى التَّمَسُّكِ بِهٖ كَمَا اَنَّ الكتابَ العزيز كذٰلِكَ۔

''یہ حدیث ہمیں سمجھاتی ہے کہ قیامت تک ہر زمانے میں اہل بیتؑ میں سے کوئی ایسا فرد موجود ہونا چاہیے جو تمسک اور پیروی کے لائق ہوتا کہ حدیث ثقلین میں جو امر کی ترغیب دی گئی ہے وہ ترغیب بجا قرار پائے؛ جیسا کہ قرآن مجید کے حوالے سے بھی حقیقت حال یہی ہے۔''[2]

ایک سوال

ایک سوال اپنی جگہ پر باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض روایات (اگرچہ وہ بہت کم ہیں) میں ''عترتی واہل بیتی'' کی جگہ ''وسنتی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سنن بیہقی میں دو جگہوں پر ایسا ہوا ہے، ایک مقام پر ابن عباس رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقعہ آنحضرتؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑی ہے اگر اس سے وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ پھر فرمایا: ''كتاب اللهِ وسُنَّةَ نَبِيِّهٖ۔'' یعنی: ''اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔''[3] اور دوسری سند میں ابوھریرہ سے بھی یہی بات منقول ہے۔[4]

لیکن واضح بات ہے کہ یہ حدیث ان تمام حدیثوں کے مقابلے میں قابل اعتناء نہیں ہے جن میں اہل بیت وعترت کا ذکر نہایت صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں تین مرتبہ اہل بیت کا تکرار ہوا ہے اور ان کے بارے میں تاکید کی گئی ہے۔ بعض احادیث میں صریحاً حضرت علیؑ کا نام ذکر ہوا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کا تعارف کرایا ہے۔ لگتا یوں ہے کہ ارباب اقتدار اس حدیث کے حوالے سے لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کے لیے اس تبدیلی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لیکن اسے رائج کرنے میں وہ ناکام رہے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ دو حدیثیں (صحیح حدیث اور سنتی والی حدیث) آپس میں منافی نہیں ہیں، ایک مقام پر اللہ کے رسولؐ نے

---

[1] سمھود، دریائے نیل کے کنارے ایک بہت بڑی بستی ہے۔

[2] خلاصہ عبقات الانوار، جلد ۲ صفحہ ۲۸۵۔

[3] سنن بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۴۔

[4] سنن بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۴۔

کتاب وسنت کی وصیت کی ہے اور دوسرے مقام پر کتاب اور عترت کی وصیت کی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ رسول خداؐ نے اس حدیث کو متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے (اہل سنت کی کتابوں میں مختلف روایات کے مطابق) کبھی آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر کبھی مسجد خیف میں عرفہ کے دن اور کبھی حجفہ میں تو کبھی غدیر خم کے مقام پر کہیں طائف سے واپسی پر تو کبھی مدینہ میں منبر پر تو کبھی زندگی کے آخری ایام میں بستر علالت پر۔[1]

اس میں کیا مانع ہے کہ کئی بار آپ ﷺ نے فرمایا ہو" کتاب اللہ وعترتی" اور ایک دفعہ فرمایا ہو" کتاب اللہ وسنتی"۔ اصولی طور پر کوئی بھی اس بات کا منکر نہیں ہے کہ سنت رسول بھی ان کی چھوڑی ہوئی اہم چیز ہے۔ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مسلمان ہو اور سنت نبوی کو نظر انداز کر دے اور اس سے بے اعتنائی برتے جس کے بارے میں قرآن مجید نے بہت تاکید کی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے: "مَاآتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَانَهَاکُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوا۔" یعنی: "جو کچھ پیغمبر تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں، اس سے رک جاؤ۔"

لہٰذا کسی طور پر بھی عترت اور اہل بیتؑ کی پیروی اور ان سے تمسک پر زور دینا اور تاکید کرنا، دوسری چیزوں کے منافی نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ ان دو میں سے کسی ایک روایت کا انتخاب کرنا اس وقت ہے جب ان دو میں تعارض اور تضاد موجود ہو جب کہ ان دو میں بالکل تضاد نہیں ہے۔ اصولی طور پر اہل بیتؑ کی ہدایت سے تمسک کرنا، سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونے کا واضح مصداق ہے۔ جس کسی نے اہلبیت ÷ کی اطاعت کی ہے اُس نے سنت رسول ﷺ پر عمل کیا ہے اور جو انہیں قبول نہ کرے اور ان سے منہ پھیر لے اور اپنے انتخاب کو رسول اللہ ﷺ کے انتخاب پر ترجیح دے اُس نے رسول ﷺ کی اطاعت سے سرپیچی کی ہے۔ بہرحال ان حیلوں اور بہانوں سے اُس سنگین ذمہ داری سے ہم نہیں بھاگ سکتے جو حدیث ثقلین ہمارے کاندھوں پر ڈالتی ہے۔ یہ حدیث بلا شک وشبہہ، حدیث متواترہ میں سے ہے اور سند اور دلالت کے اعتبار سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

یہاں ہم اس بحث کو امام شافعی کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں جو انہوں نے اس بارے میں کہے ہیں:

وَ لَمَّا رَاَیۡتَ النّاسَ قد ذَهَبَتۡ بِهِمۡ
مَذَاهِبُهُم فِی اَلۡبحُرِ الغیِّ وَ الۡجَهۡلِ
رَکِبۡتُ علی اسۡمِ اللهِ فِی سُفُنِ النّجاة
وَ هُمۡ آلُ بَیۡتِ المُصۡطَفٰی خَاتَمِ الرُّسُلِ
وَ اَمۡسَکۡتُ حَبۡلَ اللهِ وَ هُوَ وِلاَ ئُهُمۡ
کما قَدۡ اُمِرۡنا بِالتَّمَسُّكِ فِی الحَبۡلِ

"جب میں نے دیکھا کہ لوگوں کو ان کے مذاہب اور طور طریقوں نے گمراہی اور جہالت کے سمندر میں

---

[1] اس سے پہلے ان مقامات کو ذکر کیا جا چکا ہے، یاد رہے کہ سید شرف الدین مرحوم نے اپنی کتاب المراجعات کے خط نمبر ۸ میں ان مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

غرق کر دیا ہے تو میں اللہ کے نام سے نجات کی کشتیوں پر سوار ہو گیا (اور ان کی پناہ لے لی) اور وہ ختم الرسل حضرت مصطفیٰ کے اہل بیت ہیں۔ میں نے اللہ کی رسی جو کہ ان کی ولایت ہے، مضبوطی سے تھام لی؛ جس طرح ہمیں حبل اللہ (قرآن) کو تھامنے کا حکم ملا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سب لوگ اہل بیت اطہار ÷ کو تمام امور میں اپنی پناہ گاہ سمجھتے اور حق کو ان سے لیتے۔"[1]

گذشتہ بہت سی روایات میں حوض کوثر پر زور دیا گیا ہے۔ ظاہراً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حوض کوثر بہشت کے دروازے پر ہے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے پہلا قدم اس پر ہے اور نیک وصالح افراد وہاں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیتؑ سے ملاقات کریں گے۔

[1] ذخیرۃ المال (خلاصہ عبقات الانوار ج ۲، صفحہ ۲۷۷، کے نقل کے مطابق)

۲۔حدیث سفینہ نوح

اہل بیتؑ اور آئمہ معصومینؑ کے بارے میں مشہور احادیث میں سے ایک حدیث، ''حدیث سفینہ'' ہے جو وسیع پیمانے پر شیعہ اور سنی کی بڑی بڑی کتب میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں پر ہم مختصر انداز میں اس کے متن، اسناد اور مصادر کے بارے میں گفتگو کریں گے:

اس حدیث کو کم از کم آٹھ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے (ابوذر غفاری، ابوسعید خدری، ابن عباس، انس بن مالک، عبداللہ بن زبیر، عامر بن وائلہ، مسلمہ بن الاکوع اور حضرت علیؑ)۔ [۱]

مذکورہ حدیث، اہل سنت کی دسیوں مشہور و معروف کتب میں نقل ہوئی ہے جن میں سے بعض کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔ اس کی تفصیلات کے لیے ''احقاق الحق'' کی جلد ۹ اور ''خلاصۃ عبقات الانوار'' کی جلد ۴ اور دیگر کتب مطالعہ فرمایئے۔

۱۔ حضرت ابوذر غفاریؓ خانہ کعبہ کے دروازے کے کڑا پکڑ کر کہتے تھے: جو مجھے پہچانتا ہے وہ پہچانتا ہے؛ جو نہیں پہچانتا وہ جان لے کہ میں ابوذر غفاریؓ ہوں: سَمِعۡتُ رَسُولَ اللّٰہِ یَقُولُ مَثَلُ اَھۡلَبَیۡتِی فِیکُم کَمَثَلِ سَفینَۃِ نوحٍ فِی قومِ نُوحٍ مَنۡ رَکِبَھَا نَجی وَ مَنۡ تَخَلَفَ عَنۡہَا ھَلَکَ۔'' یعنی: میں نے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے اہل بیت کی تمہارے درمیان مثال، نوح کی قوم کے درمیان ان کی کشتی کی سی ہے۔ تو جو اس کشتی پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جو اس کشتی سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہوا'' ایک اور روایت میں آیا ہے: ''وَ مَنۡ تَخَلَّفَ عنھا غَرَقَ'' یعنی: جو اس کشتی سے پیچھے رہ گیا وہ غرق ہوا۔'' [۲]

بناء برایں، اہل بیت اطہار ÷ زندگی کے طوفانوں زدہ سمندر میں نجات کی کشتی ہیں۔

۲۔ حضرت ابن عباس اور اسی طرح جناب ''سلمۃ بن الاکوع'' (ابوالحسن علی بن محمد شافعی المعروف ابن مغازلی کی کتاب مناقب کے بیان کے مطابق) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''مَثَلُ اَھۡلِ بَیۡتِی فِیۡکُمۡ مَثَلُ سَفِینَۃِ نوحٍ مَنۡ رَکِبَھا نجیٰ و مَنۡ تَخَلَّفَ عَنۡھا ھَلَکَ۔''

''میرے اہل بیت کی تمہارے درمیان مثال، نوح کی کشتی کی سی ہے؛ جو اس کشتی پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جو اس کشتی سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہوا۔''

---

[۱] اسد الغابۃ کے بقول عبداللہ بن زبیر ہجرت کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ جب یہ سات یا آٹھ سال کے تھے تو ان کے والد انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے گئے اور آنحضرتؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور انہوں نے آپ کی کی باقی عمر میں آپ سے روایات سنیں اور نقل کیں۔ (اسد الغابۃ، جلد ۳، صفحہ ۱۶۲)

[۲] اس حدیث کو حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر اور المعجم الصغیر (صفحہ ۷۸، طبع دہلی)، پر، ابن قتیبہ دینوری نے عیوان الاخبار (جلد ۱، صفحہ ۲۱۲ طبع مصر) پر، حاکم نیشاپوری نے مستدرک (جلد ۳، صفحہ ۱۵۰) پر، ذہبی نے میزان الاعتدال (جلد ۱، صفحہ ۲۲۴) پر اور سیوطی نے تاریخ الخلفاء (صفحہ ۵۷۳) میں اور بہت سے دیگر افراد نے بھی بیان کیا ہے۔

یہ عبارت ابن عباس سے منقول ہے۔ البتہ ابن الاکوع کی عبارت اس سے مختصر ہے: "مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِي فِيكُمْ مَثَلُ سَفِينَةِ نوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نجیٰ"۔ یعنی: "میرے اہل بیت کی تمہارے درمیان مثال، نوح کی کشتی کی سی ہے؛ جو اس کشتی پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا"۔

کتاب "لماذا اخترت مذهب اهل بيت" یعنی "میں نے کیوں مذہب اہل بیت اختیار کیا" کے مصنف شیخ "محمد امین انطاکی" حدیث سفینہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں: تمام علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث شریف، احادیث صحیحہ مستفیضہ (حد تواتر کے نزدیک) میں سے ہے۔ حفاظ حدیث، ائمہ حدیث، سیرت نگار اور مورخین کی ایک بڑی تعداد نے اس حدیث کو اپنی مجامع حدیث اور کتب میں نقل کیا ہے جن کی تعداد سو سے بھی زیادہ تک پہنچی ہوئی ہے؛ ان سب نے اس حدیث کو مقبول حدیث تسلیم کیا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں: "غیر مسلموں نے بھی اس حدیث کو ایک اسلامی حدیث کے طور پر نقل کیا ہے"۔ [۱]

عبقات الانور میں اس حدیث کو اہل سنت کے مشہور و معروف ۹۲ علماء کی تالیف شدہ ۹۲ کتب سے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خلاصہ عبقات الانوار کے مصنف نے اس کتاب کے ملحقات میں اس حدیث کے نقل کرنے والے آٹھ صحابہ، آٹھ تابعین دوسری صدی کے تین علما، تیسری صدی کے آٹھ علماء چوتھی صدی کے چودہ علماء اور اسی طرح ایک ایک کر کے موجودہ صدی تک کے علماء کا پوری تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ [۲]

حدیث سفینہ کا مفہوم

اس حدیث کا صحیح مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کشتی نوح -کی اہمیت کا جائزہ لیں۔ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾

"ہم نے موسلا دھار پانی سے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو چیر کر بہت سارے چشمے جاری کر دیئے اور جو مقدر ہو چکا تھا اس کے لیے دونوں پانی مل کر ایک ہو گئے۔" (قمر ۱۱/ ۱۲)

اس عالمی طوفان اور سیلاب نے تمام چیزوں کو درھم برہم کر دیا اور سب کو اپنے اندر ڈبو دیا۔ اس کے مقابلے میں نجات کا صرف ایک نقطہ موجود تھا اور وہ حضرت نوح -کی کشتی تھی جس پر سوار ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے غرق ہونے سے بچنے کی ضمانت دی تھی، یہاں تک کہ جب حضرت نوح -کے بیٹے نے سرکشی اور غرور سے کہا: "سَآوِي اِلٰى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ" یعنی: میں اس پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا (کیونکہ کوئی بھی سیلاب پہاڑوں کے اوپر سے نہیں گزرتا)۔" تو اُسے باپ کی طرف سے بڑا سخت

---

[۱] کتاب، لماذا اخترت مذهب اہل بیت، صفحہ ۱۶۶۔

[۲]

اور قطعی جواب ملا، اس نے کہا: "لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ" یعنی: "آج کے دن فرمان الٰہی کے مقابلے میں نہ کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ کوئی بچانے والا مگر جس پر وہ رحم کرے"۔ (رحمت کا یہ ذکر، دراصل، ان مومنین کی طرف اشارہ ہے جو کشتی نجات پر سوار ہو گئے تھے) اور فوراً حضرت نوح - کی بات کی سچائی نمایاں ہوگئی کیونکہ: "وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ" یعنی: "ایک بہت بڑی لہر آئی جوان دونوں کے درمیان حائل ہوگئی اور وہ غرق ہو گیا"۔ (ھود/ ۴۳)

اہل بیتؑ کو ایسی کشتی کے ساتھ ان حالات میں تشبیہ دینا بہت بڑا معنی رکھتا ہے اور اس سے ہمارے لیے بہت سارے حقائق روشن ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت اسلامی کو طوفان گھیر لیں گے اور بہت سوں کو نگل لیں گے اور اپنی موج میں بہا کر لے جائیں گے۔

۲۔ ایسے خطرات سے رہائی پانے کے لیے جو انسان کے دین وایمان اور روح وجان کے لیے خطرناک ہیں، امید کی صرف ایک کرن ہی موجود ہے جو اہل بیت کی کشتی نجات ہے؛ اس سے بچھڑ جانے اور جدا ہو جانے میں ہلاکت یقینی ہے۔

۳۔ صحرا میں کسی سواری کے بغیر رہ جانا ممکن ہے ہمیشہ موت کا موجب تو نہ بنے لیکن انسان کو سخت مشقت اور زحمت میں ڈال دے۔ لیکن تلاطم خیز سمندر میں کشتی نجات سے بچھڑ جانے کا نتیجہ سوائے ہلاکت اور موت کے کوئی اور نہیں نکلتا۔

۴۔ کشتی میں سوار ہونے کے لیے ایمان اور عمل صالح کی شرط تھی اسی لیے حضرت نوح نے اپنے بیٹے کو تجویز دی کہ وہ ایمان لے آئے اور کافروں سے الگ ہو جائے اور اس کے اور ان کے ساتھیوں کے ہمراہ کشتی میں سوار ہو جائے (ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین) بنابرایں، بلاؤں اور انحرافات کے طوفانوں سے اس امت کی نجات کی شرط اس کشتی نجات پر سوار ہونا یا دوسرے الفاظ میں اس پر ایمان و یقین ہے۔

۵۔ جو چیز نجات کا باعث ہے وہ صرف اہل بیتؑ کی محبت اور دوستی نہیں ہے جیسا کہ بعض علمائے اسلام یہ دعوی کرتے ہیں کہ سب مسلمان اہل بیتؑ سے دوستی رکھتے ہیں لہٰذا اہل نجات ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ نہیں ہے بلکہ دراصل مسئلہ جو روایات میں آیا ہے وہ اہل بیت اطہار ÷ کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا ہے۔ یوں تو حضرت نوح - کا بیٹا بھی اپنے باپ سے محبت کرتا تھا، لیکن ان کی پیروی نہیں کرتا تھا اور اس کی یہ محض محبت، اس کی نجات کا باعث نہ بن سکی۔ (غور کیجیے گا)

۶۔ جیسا کہ گذشتہ گفتگو میں بیان ہوا ہے، حدیث ثقلین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیتؑ کے دامن سے وابستگی اور تمسک قیامت تک جاری ہے اور قرآن و اہل بیتؑ ہمیشہ ایک دوسرے کے ہمراہ ہیں تا وقتیکہ بہشت کے دروازے (حوض کوثر کے کنارے) پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچ جائیں۔ اسی طرح سے "حدیث سفینہ" بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ راستہ تا قیامت جاری رہے گا، کیونکہ دنیا ہمیشہ طوفانوں کا مرکز ہے یعنی ہر دور اور زمانے میں شیطان، گمراہیوں کے علمبردار اور وادی حیرت میں گمشدگان موجود رہے ہیں اور رہیں گے۔ یہ طوفان تھمنے والے نہیں، جب تک قیامت برپا نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ نہ کر لے اور قرآن کے بقول اختلافات کو مٹا نہ

دے۔[1] لہٰذا نجات کی کشتی کا وجود بھی ہمیشہ رہے گا اور اس پر سوار نہ ہونا ہلاکت کا باعث رہے گا۔

۷۔ اہل بیتؑ سے بلا قید و شرط وابستگی اور تمسک (ان کی عدم پیروی کے برخلاف) ہر زمانے میں ایک امام معصوم کے وجود پر بہترین دلیل بن سکتا جس کی پیروی نجات کا باعث اور نافرمانی ہلاکت و نابودی کا سبب ہو۔

۸۔ یہ حدیث اس مشہور حدیث کی ایک تفسیر ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

سَتَفْتَرِقُ اُمَّتِی عَلٰی ثلاثٍ وَ سَبْعِیْنَ فِرْقَةً. فِرْقَةٌ نَاجِیَةٌ و البَاقُونَ فِی النّار [2]

''عنقریب میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی؛ ان میں سے فقط ایک فرقہ نجات پانے والا اور باقی سب جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔''

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ فرقہ ناجیہ (اہل نجات گروہ) وہ لوگ ہیں جو مکتب اہل بیتؑ کا دامن تھامے ہوئے ہوں اور ان سے وابستہ ہوں اور اسلام کے اصول و فروع میں انہی کے نور ہدایت سے روشنی حاصل کریں۔ مجموعی طور پر گزشتہ باتوں سے یہ نکتہ بھی اس مشہور حدیث سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امت اسلامی میں اہل بیتؑ کا مسئلہ بنیادی ترین مسائل میں ایک بنیادی مسئلہ ہے نہ کہ ایک معمولی مسئلہ اور نہ ہی یہ کہ مسلمان سب چیزیں عقائد، احکام، دینی تعلیمات تو غیروں سے لیں اور اہل بیتؑ کے بارے میں صرف قلبی لگاؤ پر اکتفاء کر لیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[1] قرآن مجید اپنی متعدد آیات میں وضاحت فرماتا ہے کہ قیامت وہ دن ہے جب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

[2] اس روایت کو بہت سارے شیعہ اور سنی علماء نے نقل کیا ہے اور حدیث کی طرق اور اسناد میں آیا ہے کہ علیؑ نے رسول اکرمؐ سے پوچھا کہ یہ فرقہ ناجیہ کون ہے آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اَلْتَمسُّك بما انت وشیعتك واصحابك'' وہ چیز جس پر آپ اور آپ کے شیعہ اور اصحاب میں جو اس سے وابستہ رہیں گے) (احقاق الحق، جلد ۷، صفحہ ۱۸۵)

۳۔ حدیث نجوم

اہل بیت ÷ کے بارے میں ایک اور حدیث وسیع پیمانے پر اور کثرت سے اسلامی کتب میں بیان ہوئی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وہ ہر دور اور زمانے میں لوگوں کے ہادی و راہنما ہیں، وہ حدیث نجوم ہے جسے اصحاب رسول ؐ میں سے ایک بڑی تعداد (کم از کم سات صحابہ کرام حضرت علیؑ، جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، انس بن مالک منکدر، [۱] سلمۃ بن اکوع اور ابن عباس) نے اس حدیث کو آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے اور دسیوں کتب احادیث میں سُنی محدثین اور حفاظ نے اسے ذکر کیا ہے جن میں سے بعض کا تذکرہ ہم ابھی کریں گے اور قارئین کی اطلاع کے لیے باقی کتب پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

۱۔ ''مستدرک'' میں حاکم نیشاپوری، ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"النجُومُ اَمَانٌ لِاَهْلِ الْاَرضِ مِنَ الغَرَقِ وَاَهْلُ بَيْتِي اَمانُ لِاُمَّتِي مِنَ الاخْتِلافِ فاذا خَالَفَتْهَا قَبيلَةٌ مِنَ العَرَبِ اِخْتَلَفُوا فَصَارُوا حِزْبَ اِبْلِيْس"

''اہل زمین کے لیے ستارے امان ہیں اور انہیں غرق ہونے سے بچاتے ہیں (گذشتہ زمانے میں قطب نما ایجاد نہیں ہوئے تھے تو اس وقت سمندروں میں سفر کرنے کے لیے بہترین راہنما یہی آسمان کے ستارے ہوتے تھے) اور میرے اہل بیت میری امت کو اختلاف سے بچانے کے لیے امان اور باعث نجات ہیں پس جب کوئی عرب کا قبیلہ ان کی مخالفت کرے گا تو امت میں اختلافات پیدا ہو جائیں گے اور وہ شیطان کا گروہ بن جائیں گے۔''

اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد حاکم لکھتے ہیں: ''هذا حديث صحيح الاسناد'' اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [۲] علامہ حمزاوی، مشارق الانوار میں لکھتے ہیں: اُس حدیث میں، جسے حاکم نیشاپوری نے صحیح قرار دیا ہے (۳) یوں ذکر ہوا ہے: ''النجوم امان لاهل الارض من الغرق و اهل بيتي امان لامتي من الاختلاف ...'' یعنی: ستارے اہل زمین کیلئے غرق ہونے سے امان ہیں اور میرے اہل بیت میری امت کیلئے اختلاف میں پڑنے سے امان ہیں۔'' [۳]

جن افراد نے اس حدیث کو اپنی کتب میں بیان کیا ہے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے، ابن حجر نے صواعق میں، علامہ علی متقی نے

---

[۱] اسد الغابۃ میں ابن اثیر کے بقول منکدر ابن عبداللہ جو کہ محمد منکدر کے باپ تھے، صحابی رسولؐ تھے۔

[۲] حاکم نیشاپوری: مستدرک، جلد ۳ صفحہ ۱۴۹ (مطبوعہ حیدر آباد دکن، احقاق الحق ج ۹ ص ۲۹۴ کے مطابق)

[۳] حمزاوی کے الفاظ یوں ہیں: صححها الحاكم على شرط الشيخين (اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن اصول اور معیارات پر بخاری مسلم نے احادیث کو صحیح قرار دیا ہے، انہی اصول و معیار پر یہ حدیث صحیح ہے) (مشارق الانوار، صفحہ ۹۰، طبع شرقیہ مصر)

منتخب کنز العمال میں، بدخشی نے مفتاح الجناح میں، شیخ محمد صبان مالکی نے اسعاف الراغبین میں اور علامہ نبھانی نے الشرف المويد اور جواہر البحار میں ۔[1]

یہ سب اس روایت کے متعلق ہے جسے ابن عباس نے رسول اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے کہ اس روایت کو متعدد راویوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے بیان کیا ہے جن کا تذکرہ شیعہ اور سنی کی مشہور کتب حدیث میں ہوا ہے (البتہ ان روایات کے الفاظ میں تھوڑا بہت فرق موجود ہے جس سے اصلی مطلب اور مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔)

مثال کے طور پر ''مسلمہ بن اکوع'' سے منقولہ روایت میں آیا ہے: ''قَالَ رَسُولُ اللهِ النُّجومُ امانُ لِاَهْلِ السَّماءِ و اَهل بیتی امان لِاُمَّتِی۔'' یعنی: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ستارے اہل آسمان کے لیے امن وسکون کا باعث ہیں اور میرے اہل بیتؑ میری امت کے لیے امن وامان کا باعث ہیں۔''[2]

اسی بات اور مطلب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ جابر بن عبداللہ انصاری نے پیغمبر اکرم ﷺ سے بیان کیا ہے اسی طرح منکدر، انس اور ابوسعید خدری نے آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے۔ اس بارے میں ایک اور حدیث جو حضرت علیؑ نے رسول خدا ﷺ سے نقل کی ہے، اُس میں یوں بیان ہوا ہے:

النجّومُ اَمان لاهْلِ السَّماءِ فَاِذَا ذَهَبَتِ النُّجومُ ذَهَبَ اَهلُ السَّماءِ وِ اِهْلُ بَيْتِي اَمانُ لِاَهْلِ الْاَرْضِ فَاِذا ذَهَبَ اَهْلُ بَيْتِي ذَهَبَ اَهْلُ الْاَرْضِ۔

''اہل آسمان کے لیے ستارے امن وامان کا باعث ہیں جب ستارے ختم ہو جائیں گے تو آسمان والے بھی رخت سفر باندھ لیں گے اور میرے اہل بیتؑ زمین والوں کے لیے امان اور حفاظت کا سبب ہیں، جب میرے اہل بیتؑ نہ رہیں گے تو اہل زمین کا بھی نام ونشان مٹ جائے گا۔''

اس حدیث کو محب الدین طبری نے ذخائر العقبی میں مناقب احمد حنبل سے نقل کیا ہے۔[3] بہت سارے دیگر افراد نے بھی اس حدیث کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جیسے حموینی نے فرائد السمطین میں، ابن حجر نے صواعق میں، محمد صبان نے اسعاف الراغبین میں، خوارزمی نے مقتل الحسین میں اور نبھانی نے ''الشرف المويد'' میں اسے نقل کیا ہے۔

---

[1] مزید اطلاعات کیلئے احقاق الحق ج ۹، صفحہ ۲۹۴ تا ۲۹۶ پر دیکھیں۔

[2] اس حدیث کو سیوطی نے جامع الصغیر (ص ۵۷۸ طبع مصر) محب الدین طبری نے ذخائر العقبی میں، ابن حجر نے صواعق میں اور دیگر افراد نے اپنی کتب میں اسے بیان کیا ہے۔

[3] ذخائر العقبی، صفحہ ۷، طبع قدسی قاہرہ۔

حدیث نجوم کا مفہوم

حدیث یا احادیث نجوم سے مختلف نکات حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ درحقیقت یہ حدیث قرآن مجید کی ان آیات کی طرف اشارہ ہے جو آسمانی ستاروں کے دو اہم ترین فائدے بیان کرتی ہیں:

پہلے فائدے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: **وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ** (نحل/۱۶) یعنی: ''ان کی ستاروں کے ذریعے ہدایت کی جاتی ہے۔'' اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: **وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ** (انعام/۹۷) یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ستارے بنائے تا کہ تم ان کے ذریعے خشکی اور سمندر میں راہنمائی اور ہدایت پاؤ۔''

حقیقت میں ستاروں کے اہم ترین فوائد میں سے ایک فائدہ یہاں ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ قطب نما کے ایجاد ہونے سے پہلے راستوں کی راہنمائی کے لیے بالخصوص بحری سفر میں، جہاں پہاڑوں، درختوں اور دیگر نشانیوں کا وجود نہیں ہوتا، وہاں ستاروں کے سوا راہنمائی کا ذریعہ کوئی نہ تھا۔ اسی وجہ سے جب آسمان پر بادل چھائے ہوتے تھے تو کشتیاں رک جاتی تھیں اور سفر اختیار نہیں کرتی تھیں۔ اگر وہ اپنے سفر کو جاری رکھتیں تو موت کے خطرے سے دوچار ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانچ مشہور ستاروں (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل) کے علاوہ باقی تمام ستارے ایک ایسا مجموعہ ہیں جو اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتے اور اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔ تو گویا یہ ستارے کالے رنگ کی چادر پر جڑے ہوئے موتیوں کی طرح ہیں اور اس چادر کو ایک طرف سے کھینچ کر دوسری طرف لے جایا جاتا ہے۔

اسی لیے ان ستاروں کو ''ثوابت'' کہا جاتا ہے، اس بات کے پیش نظر لوگ قطبی ستارے (جس کی جگہ کو جانتے تھے اور مختلف نقشوں کی مدد سے جو ان کے پاس ہوتے تھے، اپنی منزل مقصود کے راستوں کو پا لیتے تھے۔ ستاروں کا دوسرا فائدہ قرآن کے بقول یہ ہے کہ بعض ستارے شیاطین کے لیے ''رجوم'' ہیں یعنی وہ ایسے تیروں کی مانند ہیں جو شیطانوں کی طرف پھینکے جاتے ہیں اور انہیں آسمانوں میں داخل ہونے اور وہاں سے معلومات حاصل کرنے سے روکتے ہیں۔ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ﹰالْكَوَاكِبِ ۝۶ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝۸ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝۹

(صافات، ۶/۹)

''ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین کیا اور اُسے ہر شیطان خبیث سے محفوظ رکھا وہ ملأ اعلیٰ (کے فرشتوں کی باتیں) نہیں سن سکتے (اور جب وہ ایسا کرنے کی کوشش کریں) تو وہ ہر طرف سے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں اور شدت کے ساتھ پیچھے دھکیل دیئے جاتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔''

اس آیت اور اس طرح کی دیگر قرآنی آیات سے اہل آسمان کے لیے ستاروں کا امان ہونا سمجھا جا سکتا ہے۔ ستارے (یا شہاب) کس طرح سے راستے کو شیطانوں پر بند کرتے ہیں اور انہیں آسمانوں تک رسائی سے روک دیتے ہیں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس

پر الگ سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے اور ہم نے تفسیر نمونہ میں انہی آیات کی تفسیر میں اس مطلب کی تشریح کی ہے۔ یہاں جس بات پر توجہ دینا لازمی ہے وہ ان آیات کا اجمالی مفہوم ہے اور وہ یہ کہ ملأ اعلی، عالم ملکوت اور فرشتوں کے پاکیزہ ماحول سے شیطانوں کو دور رکھنے کا سبب ستارے ہیں اور حدیث نجوم کی تشریح کے لیے اتنا کافی ہے۔

ہاں! ایک طرف سے اہل بیت رسول ﷺ آسمان کے ستاروں کی طرح لوگوں کو کفر وفساد کی تاریکیوں گمراہیوں اور گناہوں سے نجات دیتے ہیں، انہیں مقصد تک پہنچنے کا راستہ بتاتے ہیں اور راہ خدا کے راہیوں کو گمراہی وضلالت کی موجوں میں غرق ہونے سے بچاتے ہیں۔ دوسری طرف سے جب جن وانس کے شیطان اسلام ودین کے دائرے میں نفوذ پیدا کرنے اور قرآن وسنت کے احکام میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ انہیں شہاب ثاقب کی طرح دور بھگا دیتے ہیں ایک غیبی ہاتھ ان نامحرموں کے سینوں پر مار کر انہیں راز چرانے سے روک دیتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اختلافات کی صورت میں اہل بیت کو بطور مخصوص امت کے لیے امان قرار دیا گیا ہے، ان اختلافات میں کہ اگر وہ جاری رہیں تو لوگ حزب ابلیس میں شمار ہوں (**اختلفو فصاروا حِزب اِبْلِیس**)

۲۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیت کا راہ ہدایت، دنیا کے خاتمہ تک جاری وساری ہے جس طرح سے ستاروں کا اہل زمین کے لیے امان ہونا جاری ہے۔

۳۔ اس سے اہل بیت کا غلطی اور گناہ سے پاک اور معصوم ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ان سے غلطی اور گناہ کے سرزد ہونے کا امکان ہوتو وہ (کلی اور مطلق طور پر) اہل زمین کے لیے گمراہی اور اختلاف کی صورت میں امان نہیں بن سکتے۔ (غور کیجیے گا)

۴۔ جیسا کہ آسمان کے ستاروں میں سے جب کوئی ایک غروب ہوتا ہے تو دوسرا ستارہ طلوع ہوتا ہے، جب ستاروں کا ایک مجموعہ ایک افق سے اوجھل ہوتا ہے تو دوسرے افق سے ایک اور مجموعہ ظاہر ہوجاتا ہے اہل بیت ÷ اور آل محمد ﷺ بھی اسی طرح ہیں۔ حضرت علیؑ نے اس بات کو صراحت سے نہج البلاغہ میں بیان فرمایا ہے:

اَلا اِنَّ مَثَلَ آلِ محمدٍ کَمَثَلِ نُجُومِ السَّماءِ اذا هوی نَجْمٌ طَلَعَ نَجْمٌ [1]

''آگاہ رہو کہ آل محمدؐ کی مثال آسمان کے ستاروں جیسی ہے جب ان میں سے کوئی ایک ڈوب جاتا ہے تو دوسرا ستارہ نکل آتا ہے۔''

شاید اس بات کے ذکر کی ضرورت نہ ہو کہ ان روایات میں اہل بیت کی تفسیر ازواج رسول ﷺ کے ذریعے نہیں کی جاسکتی؛ کیونکہ بات ان افراد کی ہو رہی ہے جو ہر دور اور زمانے میں امت کے لیے ذریعہ ہدایت ہیں اور انہیں گمراہی وضلالت میں غرق ہونے سے بچاتے ہیں اور تفرقہ واختلاف میں پڑنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ ازواج مطہرات ایک خاص زمانے میں موجود رہی

---

[1] نہج البلاغہ، صفحہ ۱۰۰۔

ہیں۔علاوہ ازیں،امت کو اختلافات سے روکنے میں بھی ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی خاص کردار نہیں تھا۔

سوال

ممکن ہے یہاں یہ کہا جائے کہ مختلف کتابوں میں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے: "**اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء فایّما اخذتم به اهتدیتم**۔" یعنی: "میرے اصحاب آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں جس کسی کو پکڑو گے، اسی کے ذریعے ہدایت پاؤ گے۔"[1] تو کیا اس حدیث میں اور اہل بیتؑ کے بارے میں مذکورہ احادیث میں تضاد نہیں پایا جاتا؟ تو اس سوال کے جواب میں چند نکات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ بالفرض حدیث "اصحابی کالنجوم" ایک معتبر حدیث ہے، اس کے باوجود بھی یہ حدیث اہل بیتؑ کے بارے میں روایات کے ساتھ قطعاً کوئی منافات نہیں رکھتی؛ کیونکہ اسلام کے حقائق کو بیان کرنے والے ایک محور اور مرکز کی موجودگی سے دوسرے مراکز کے موجود ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔خصوصاً جب کہ حدیث "**اهل بیتی کالنجوم**" میں قرآن کریم کی بات بالکل ہی نہیں کی گئی؛ حالانکہ قرآن مجید مسلمانوں کے لیے ہدایت کا اہم ترین منبع اور مأخذ ہے۔

۲۔ اہل سنت کے کئی بزرگ علماء کے نزدیک یہ حدیث سند کے اعتبار سے جعلی اور گھڑی ہوئی ہے یا کم از کم مشکوک ہے۔جن علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے اُن میں اہل سنت کے چار اماموں میں امام احمد حنبل، ابن حزم، ابو ابراہیم مزنی (امام شافعی کے ساتھی) حافظ بزاز، دارقطنی، ذھبی اور علماءَ کی ایک جماعت شامل ہیں۔اگر ہم یہاں ان میں سے ہر ایک کی بات کو بیان کریں تو تفسیری اسلوب سے نکل جائیں گے؛البتہ قارئین اس بارے میں مزید معلومات کے لیے "عبقات الانوار" کے خلاصہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔[2]

۳۔ اس حدیث کا مفہوم منطقی اصولوں کے مطابق نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب (اصحاب اپنے وسیع معنوں میں، یعنی وہ تمام افراد جنہوں نے آنحضرتؐ کا زمانہ پایا اور آپ کے ساتھ رہے) کے درمیان عظیم اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔اور انہی اختلافات کی بنیاد پر بہت زیادہ خون بہایا گیا اور خوفناک جنگیں لڑی گئیں۔کونسی منطق ہمیں کہتی ہے کہ دو مخالف اور ایک دوسرے کے خون پیاسے گروہوں میں سے ہر ایک کو ہدایت کا سرچشمہ قرار دیں اور لوگوں کو اختیار دیں کہ تمہارے لیے فرق نہیں پڑتا چاہے تم امیر المومنین علیؑ کے لشکر میں شامل ہو جاؤ یا معاویہ کے سپاہی بن جاؤ، جنگ جمل میں حضرت علیؑ کے ساتھی بنو یا طلحہ و زبیر ساتھ دینے والوں میں ہو جاؤ، ہر صورت میں ہدایت پاؤ گے اور بہشت میں مقام حاصل کرو گے۔کوئی بھی عقل و منطق اس بات کو قبول نہیں کرتی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام و مرتبہ اس سے بلند و بالا ہے کہ اس طرح کی بات ان سے منسوب کی جائے۔

---

[1] جامع الاصول، جلد ۹، صفحہ ۴۱۰۔

[2] خلاصہ عبقات جلد ۳، صفحہ ۱۲۴ تا ۱۶۷ (اس کتاب میں اس حدیث کے ضعف سند کو تیس (۳۰) سے زائد اہل سنت کے علماء سے ان کے حالات زندگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے)

قرائن وشواہد اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ بنی امیہ اور دیگر حکمرانوں نے اپنے نظریات اور موقف کو ثابت کرنے، حدیث نجوم کی اہمیت کو کم کرنے اور اہل بیتؑ کے مقام کو گھٹانے کے لیے اس طرح کی حدیثوں کو گھڑا اور انہیں رسول اللہؐ سے منسوب کر دیا تاکہ وہ شامیوں اور دوسروں کو یہ سمجھائیں کہ اگر علیؑ کی حکومت حق ہے اور علیؑ ہدایت کا سرچشمہ ہے تو معاویہ کی حکومت بھی حق ہے اور وہ بھی ہدایت کا باعث ہے کیونکہ وہ بھی صحابی رسول ہے؛ پس کوئی فرق پڑتا کہ علیؑ کا ساتھ دو یا معاویہ کے ساتھ رہو۔

۴۔ بارہ اماموں کی حدیث

ایک اور حدیث جو امامت وولایت کے مسئلہ میں اہل بیت ÷ کی اہمیت کو عمومی طور پر اجاگر کرتی ہے اور اس بارے میں بہت سے سوالات کا جواب دینے کے قابل ہے، وہ حدیث ''ائمہ اثنا عشر'' ہے۔ یہ بڑی مشہور ومعروف حدیث ہے اور صحاح ستہ کی اکثر کتب میں منقول ہے۔ درحقیقت یہ ایک ایسا قول ہے جس پر اکثریت کا اتفاق ہے۔ ہم سب سے پہلے اس حدیث کی اسناد کا خلاصہ پیش کریں گے اور اس کے بعد مختصر طور پر اس کا مطلب بیان کریں گے۔

یہ حدیث بہت سارے صحابہ سے نقل کی گئی ہے اس کی سب سے زیادہ اسناد جابر بن سمرہ تک پہنچتی ہیں۔ اس کے بعد عبد اللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن عاص، عبدالملک بن عمیر، ابی الجلد اور ابی جحیفہ تک پہنچتی ہیں (کم از کم تعداد سات ہے)۔ لیکن اس حدیث کے حفاظ اور ناقلین جنہوں نے اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ان کی تعداد دسیوں میں ہے کہ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

ا۔ صحیح مسلم میں جابر بن سمرہ سے بیان ہوا ہے وہ کہتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ یقولُ لایَزَالُ الاسلامُ عزیزاً اِلَی اثْنَیْ عَشَرَ خلیفَةً ثُمَّ قَالَ كَلِمَةً لَمْ اَفْهَمْها: فَقُلْتُ لاَبِی ما قالَ؟ فَقَالَ: كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ۔۔۔

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام ہمیشہ سر بلند اور سرفراز رہے گا یہاں تک کہ بارہ خلیفہ مسلمانوں پر حکومت کریں گے۔'' پھر آپؐ نے کچھ فرمایا جو میں نہیں سمجھا سکا۔ پھر میں نے اپنے باپ (جو کہ وہاں موجود تھا اور مجھ سے زیادہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب تھا) سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا فرمایا؟ تو اس نے جواب دیا: ''وہ سب قریش سے ہوں گے۔''[1]

اسی کتاب میں ایک اور سند کے ساتھ جابر سے کچھ اور الفاظ نقل ہوئے ہیں اور اس میں'' لایزال ھذا الدین عزیزا '' کی بجائے ''لایزال ھذا الامر'' آیا ہے ایک اور سند میں: ''لایزال ھذا الدین عزیزاً منیعاً'' کے الفاظ بھی ذکر ہوئے ہیں۔ چوتھی عبارت میں عامہ بن سعد بن ابی وقاص سے نقل ہوا ہے کہ میں نے جابر بن سمرہ کو لکھا کہ وہ روایات جو تم نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی ہیں وہ مجھے تحریر کر کے بھیجیں۔ تو انہوں نے یوں لکھا کہ میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لَایَزَالُ الدّینُ قائماً حتیّٰ تَقُومُ السَّاعَةُ او یَكُونُ عَلَیْكُمْ اِثْنَی عَشَرَ خَلِیفَةً كُلُّهُمْ

[1] صحیح مسلم، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵۳، مطبوعہ بیروت (دار احیاء التراث العربی)

مِنۡ قُرَیۡشٍ

''دین قیامت تک قائم رہے گا یا یہ کہ تم پر بارہ خلیفہ حکومت کریں گے اور وہ سب قریش سے ہوں گے۔''

نیز میں نے سُنا آپؐ نے فرمایا: ''عُصَیبَۃُ مِنَ المُسلِمِینَ یَفتَتِحُونَ بَیتَ اَلَبیَضَ بَیتَ کِسریٰ اَوۡ آلِ کِسریٰ۔'' یعنی: ''مسلمانوں کا ایک چھوٹا گروہ کسریٰ یا کسریٰ کی آل کے سفید محل کو فتح کرے گا۔'' میں نے یہ بھی آنحضرتؐ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ: ''اِنَّ بَیۡنَ یَدَیِ السَّاعَۃِ کَذّابِینَ فَاحۡذَرُوھم۔'' یعنی: ''قیامت سے پہلے جھوٹے افراد ظاہر ہو جائیں گے ان سے دوری اختیار کرنا۔''[1]

ایک اور طریق سے صحیح مسلم میں ہی جابر بن سمرہ سے نقل ہوا ہے: ''لَایَزَالُ ھَذا الدّینُ عزیزاً منیعاً اِلَی اِثنَی عَشَرَ خلیفۃً۔'' یعنی: ''یہ دین سربلند سرفراز اور ناقابل شکست رہے گا تا اینکہ بارہ خلیفہ حکومت کریں۔'' اور اس حدیث کے آخر میں وہی جملہ ''کُلُّھُمۡ مِنۡ قُرَیۡش'' بھی ذکر ہوا ہے[2]

۲۔ یہی حدیث صحیح بخاری میں ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ جابر کہتے ہیں میں نے رسول خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا:

یَکُونُ اِثۡنٰی عَشَرَ اَمِیراً فَقَالَ کَلِمَۃً لَمۡ اَسۡمَعۡھَا فَقَالَ اَبِی اِنَّہ قَالَ کُلُّھُمۡ مِنۡ قُرَیۡشٍ[3]

میرے بعد بارہ حکمران ہوں گے، اسکے بعد والی بات مجھے سُنائی نہ دی، میرے باپ نے بتایا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: وہ سب قریش سے ہوں گے۔

۳۔ یہی مطلب صحیح ترمذی میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے جناب ترمذی حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''ھذا حدیثُ حَسَنٌ صحیحٌ۔'' یعنی: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔[4]

۴۔ صحیح ابی داؤد میں بھی کچھ فرق کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے اور حدیث کا لہجہ یہ بتاتا ہے کہ اس حدیث کو آنحضرتؐ نے لوگوں کے مجمع میں بیان فرمایا ہے کیونکہ اس میں مذکورہ ہے کہ جب پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دین بارہ خلفاء تک ہمیشہ طاقتور اور سربلند رہے گا، تو لوگوں نے با آواز بلند تکبیر کہی۔[5]

۵۔ نیز مسند احمد حنبل میں کئی مقامات پر یہ حدیث بیان ہوئی ہے بعض محققین نے اس کتاب میں جابر تک طرق کی تعداد چونتیس

---

[1] صحیح مسلم، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵۳
[2] صحیح مسلم، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵۳
[3] صحیح بخاری، جلد ۳ حصہ نہم، صفحہ ۱۰۱ (باب اخراج الخصوم واھل ریب سے پہلے والے باب میں مذکورہ ہے) مطبوعہ درالجیل بیروت
[4] صحیح ترمذی جلد ۴، صفحہ ۵۰۱، باب ماجاء فی الخلفاء حدیث ۲۲۲۳، مطبوعہ دراحیا التراث العربی بیروت
[5] صحیح ابی داؤد، جلد ۴ مطبوعہ بیروت دراحیاء السنۃ النبویہ (کتاب المھدی)

ذکر کی ہے۔[۱]

ان میں سے ایک مقام پر ہم دیکھتے کہ مسروق بیان کرتے ہیں کہ: ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ہمارے لیے قرآن پڑھ رہے تھے کسی نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا آپ نے کبھی رسول خدا ﷺ سے پوچھا کہ اس امت پر کتنے خلفاء حکمرانی کریں گے؟ عبداللہ بن مسعود نے کہا: جب سے میں عراق آیا ہوں، تم سے پہلے کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا! اس کے بعد انہوں نے کہا: ہاں ہم نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال پوچھا تھا آپؐ نے فرمایا: ''اثنی عَشَرَ کَعِدَّۃِ نُقَبا ءِ بنی اِسْرَائیلَ۔'' یعنی: ''بنی اسرائیل کے نقیبوں کی تعداد کے برابر بارہ افراد۔''[۲]

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ سب اہل سنت کی معتبر ترین اور مشہور کتب سے تھا جن میں یہ حدیث مختلف طرق سے نقل کی گئی۔ ان کے علاوہ بھی متعدد کتابوں میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے۔ کلام کے طولانی ہونے کے خوف سے ان کتب کے ناموں کی طرف فقط اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے قارئین ''احقاق الحق''، فضائل الخمسہ، منتخب الاثر اور اس طرح کی دیگر کتب کا مطالعہ کریں۔

بارہ اماموں والی حدیث کا مفہوم

ان روایات میں مذکورہ الفاظ اور عبارتیں مختلف ہیں۔ بعض روایات میں ''اثنی عشر خلیفۃ'' بارہ جانشین کے الفاظ میں بعض میں ''اثنی عشر امیراً'' کا جملہ ہے اور کچھ روایات میں بارہ مردوں کی حکومت کی بات ہے (ما وُلّاھُم اثنی عشر رجلا) لیکن زیادہ تر میں ''خلیفہ'' کا لفظ آیا ہے اور کچھ میں تو صرف عدد کا ذکر ہے جیسے ''اثنی عشر کَعِدَّۃِ نُقَباءِ بَنی اِسْرَائیلَ'' یعنی بارہ بنی اسرائیل کے قبائل کے سرداروں کی طرح اور چند روایات میں ''بارہ نگران'' کی بات ہوئی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ یہ سب ایک ہی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ ہے۔ خلافت اور حکومت کا مسئلہ لہٰذا ان سب کا نتیجہ ایک ہے۔ دوسرے لحاظ سے دیکھیں تو بعض میں ''لا یزالُ ھذا الدّین عزیزاً منیعاً'' (ہمیشہ یہ دین شکست ناپذیر رہے گا) کے الفاظ ہیں۔ دوسری چند روایات میں ''لایزال اَمْرُ اُمّتی صالحاً''، یعنی: ''ہمیشہ میری امت کا معاملہ درست رہے گا، کے الفاظ درج ہیں۔''

بعض میں یہ جملہ ذکر ہوا ہے کہ ''لا یزال امر ھذہ الامۃ ظاھراً'' ہمیشہ اس امت کا معاملہ غالب اور کامیاب رہے گا۔ بعض میں ہے کہ ''ماضیاً''، یعنی جاری رہے گا، بعض میں آیا ہے: ''لایَضُرُّھُمْ خَذَلَھُمْ'' کوئی انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا اور انہیں ذلیل وخوار نہیں کر سکتا۔ اور اس طرح کے دیگر جملات، یہ سب بھی ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں اور وہ امت کی اصلاح و درستگی، کامیابی، طاقت وقدرت اور ان کی نجات ہے۔ ایک اور اعتبار سے ملاحظہ کریں تو مختلف طرق سے نقل ہونے والی ان روایات میں: ''کُلُّھم مِنْ

---

[۱] منتخب الاثر، صفحہ ۱۲، اور احقاق الحق، جلد ۱۳ کو دیکھیئے۔

[۲] مسند احمد، جلد ا، صفحہ ۳۹۸، مطبوعہ در الصادق، بیروت

قُرَیشٍ ''یعنی: ''یہ سب قریش سے ہوں گے۔'' کے الفاظ مذکورہ ہیں، صرف چند روایات میں جیسا کہ قندوزی حنفی نے ایک روایت ینابیع المودۃ میں ذکر کی ہے۔ جابر بن سمرہ کی روایت کو المودۃ القربی سے نقل کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کُلُّهمہ مِنْ بَنِی هاشِم ''یعنی: ''یہ سب بنی ہاشم سے ہوں گے۔'' [1]

ان احادیث میں اکثر میں یہ بات آئی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے آخری جملے کو آہستہ بیان کیا۔ گویا مخفی طور پر اس جملے کو ادا کیا اور اس سے اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت کچھ ایسے افراد موجود تھے جو رسول خدا ﷺ کے قریش یا بنی ہاشم سے بارہ خلیفے ہونے کے مخالف تھے، لہٰذا آپؐ نے اسے انتہائی آہستہ سے ذکر فرمایا۔

یہ حدیث جو کہ مشہور ماخذ اور پہلے درجے کی کتب میں منقول ہے اور تمام علمائے اسلام اس کے معترف ہیں، اس کی تفسیر مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے لیے واضح ہے اور وہ اس کا مطلب بارہ معصوم امام ہی لیتے ہیں۔ لیکن دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے لیے اس حدیث کی تفسیر ایک انتہائی پیچیدہ دشوار اور مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہ بات پورے یقین اور اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اس حدیث کی واضح اور قابل فہم تفسیر بیان نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ بھی معلوم ہے؛ کیونکہ پہلے خلفاء چار افراد تھے۔ بنی امیہ کے حکمرانوں کی تعداد چودہ تھی [2] اور بنی عباس کے حکام کی تعداد سینتیس (۳۷) تک پہنچتی ہے اور ان خلفاءٗ میں سے کوئی سلسلہ بھی بارہ اماموں پر منطبق نہیں ہوتا۔

اگر ان خلفاءٗ کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع تفریق کیا جائے تب بھی مشکل حل نہیں ہوتی؛ مگر یہ کہ ہم بیٹھ کر اپنی مرضی سے بعض حکمرانوں کو خلفائے رسول کی حیثیت سے قبول کر لیں اور بعض کو حذف کر دیں اور یوں کھینچ تان کر بارہ کا عدد پورا کریں جو از خود کسی اصول اور منطق کے تحت بھی درست نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ یہاں پر گفتگو کی باگ ڈور حافظ سلیمان بن ابراہیم قندوزی حنفی کے سپرد کریں، وہ اپنی مشہور کتاب ''ینابیع المودۃ'' میں بیان کرتے ہیں:

بعض محققین نے کہا ہے کہ وہ احادیث جو دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد بارہ خلفاء ہوں گے، وہ متعدد اور مشہور طرق سے نقل ہوئی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ اس حدیث سے آنحضرتؐ کا مقصود ان کی اہل بیتؑ اور عترت سے بارہ اماموں کا ہونا ہے۔ کیونکہ اس حدیث کو آپؐ کے بعد پہلے خلفاء پر منطبق نہیں جا سکتا کیونکہ ان کی تعداد بارہ سے کم ہے اور اسے بنی امیہ کے حکمرانوں سے بھی تطبیق نہیں دی جا سکتی کیونکہ ایک طرف تو ان کی تعداد بارہ سے زیادہ ہے اور دوسری طرف وہ سب واضح طور پر ظلم وستم کے مرتکب ہوئے ہیں، سوائے عمر بن عبدالعزیز کے، اور تیسری بات یہ بھی ہے کہ وہ بنی ہاشم نہیں تھے (جب کہ بعض احادیث کے طرق

---

[1] ینابیع المودۃ، صفحہ ۴۴۵، باب ۷۷

[2] اور وہ یہ تھے۔ معاویہ اوال ۔۲۔ یزید اول ۔۳۔ معاویہ دوم ۔۴۔ مروان اول ۔۵۔ عبدالملک ۔۶۔ ولید اول ۔۷۔ سلیمان بن عبدالملک ۔۸۔ عمر بن عبدالعزیز ۔۹۔ یزید دو۔ ۔۱۰۔ ہشام بن عبدالملک ۔۱۱۔ ولید دوم ۔۱۲۔ یزید سوم ۔۱۳۔ ابراہیم بن ولید ۔۱۴۔ مروان دو۔ اور اندلسکے امویوں کی تعداد تو اس سے بھی زیادہ ہے (دائرۃ المعارف)

میں آیا ہے کہ وہ سب کے سب بنی ہاشم سے ہوں گے) یہ روایت رسول اللہ ﷺ کے اس جملے کو آہستہ کہنے سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ ایک گروہ بنی ہاشم کی خلافت کو نہیں چاہتا تھا۔

اس طرح اس حدیث کی تفسیر بنی عباس کے بادشاہوں سے بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان کی تعداد بارہ افراد سے زیادہ ہے، علاوہ ازیں انہوں نے: "قُل لاَاَسْئَلُکُمْ علیه اَجراً اِلاَّ المَوَدَّةَ فِی القُرْبیٰ" کی آیت اور اسی طرح حدیث کساء کا لحاظ نہ رکھا۔ بنابرایں، اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا سوائے اس کے کہ ہم اس حدیث کو رسول خدا ﷺ کی اہل بیت اور عترت کے بارہ اماموں پر منطبق سمجھیں، کیونکہ وہ اپنے زمانے کے افراد سے زیادہ عالم ان سے بڑھ کر عظیم اور تقویٰ کے اعتبار سے ان سب سے برتر تھے اور ان کا حسب ونسب بھی سب سے بلند واعلیٰ تھا۔[1]

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی جو کہ پہلے اہل سنت تھے اور پھر شیعیت کو قبول کیا انہوں نے اپنے شیعہ ہونے کی وجوہات پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "لاَکُونُ مَعَ الصادقین" رکھا ہے۔ تیجانی نے اس بارے میں چند مختصر مگر جامع جملے ادا کیے ہیں وہ لکھتے ہیں: "ان احادیث (بارہ اماموں والی احادیث) کی کسی صورت میں بھی تصحیح اور تفسیر نہیں کی جاسکتی مگر یہ کہ اس کی ہم وہی تفسیر کریں یعنی اہل بیتؑ کے بارے میں بارہ امام، جن پر شیعہ امامیہ کا عقیدہ ہے، اہل سنت کے اکابرین اور قائدین کو اس معمہ کو حل کرنا چاہیے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بارہ اماموں کا عدد جسے انہوں نے صحاح ستہ کی کتب میں خود لکھا ہے، آج تک سوالیہ نشان اور معمہ بنا ہوا ہے اور اس کا ابھی تک وہ کوئی جواب تلاش نہیں کر پائے۔"[2]

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بعض افراد نے اس حدیث کی تفسیر وتشریح بیان کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ وہ اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے نظریے کو بھی قبول نہیں کرنا چاہتے تھے تو ایسی صورت میں وہ حیران کن تکلفات کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف تو وہ یزید اور اس طرح کے دیگر افراد کو ان بارہ افراد میں شامل کرتے ہیں جن کے ذریعے اسلام کو عزت ملی اور وہ سربلند اور کامیاب ہوا اور دوسری طرف خلفاء کی ایک تعداد کو اپنی مرضی سے حذف کر دیتے ہیں۔

ہماری رائے کے مطابق کم از کم اگر وہ سکوت اختیار کرتے تو یہ ان غلط تأویلات سے زیادہ آبرومندانہ طریقہ تھا۔ اور ان سب سے زیادہ عجیب وہ تفسیر تھی جو ہم نے حج کے سفر میں بیت اللہ الحرام میں مکے کے ایک عالم سے مسجد الحرا میں سُنی، اس کا کہنا تھا کہ بارہ اماموں میں سے وہی پہلے چار خلفاء میں اور باقی آٹھ افراد آئندہ زمانے میں ظاہر ہوں گے۔ حالانکہ جو بھی اس حدیث کو پڑھے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس مراد یکے بعد دیگرے بارہ جانشین ہے، اور "لایزال هذا الدین منیعاً عزیزاً" یا "لایزال هذا الدّینُ قائماً حتی تقوم السَّاعَةُ" کے الفاظ اور جملات بہت ہی واضح طور پر یہ سمجھا رہے ہیں کہ حضرت رسول خدا ﷺ کے بارہ خلفاء کا سلسلہ دنیا کے خاتمہ تک جاری رہے گا۔

---

[1] ینابیع المودۃ، صفحہ ۴۴۵، باب ۷۷

[2] لاکون مع الصادقین، صفحہ ۱۴۶۔

اس گفتگو کا اختتام حلیۃ الاولیاء میں حافظ ابونعیم اصفہانی کی نقل شدہ ایک حدیث پر کرتے ہیں وہ اپنی سند سے ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ سَرَّهُ اَنْ یحیی حَیاتی و یَموتَ مَماتی و یَسْکُنَ جَنَّةَ عَدْنٍ غَرَسَهَا رَبّی فَلْیُوالِ عَلِیًّا مِنْ بَعْدِی وَ لْیُوالِ وَلِیَّهُ وَ لْیَقْتَدِ بِالاَئِمَّةِ مِنْ بَعْدِی فَاِنَّهُمْ عِتْرَتِی۔" یعنی: "جو شخص چاہتا ہے کہ میری طرح زندگی گزارے میری طرح موت سے ہمکنار ہو اور جنت عدن میں مقام پائے جس کے درختوں کو میرے پروردگار نے اپنے دست قدرت سے کاشت کیا ہے تو اُسے چاہیے کہ میرے بعد علی -کو اپنا مولیٰ بنائے، اور اس کے دوست کو اپنا دوست بنائے اور میرے بعد اماموں کی اقتداء اور پیروی کرے بے شک وہ میری عترت ہیں۔"[1]

یہاں پر ایک اہم نکتے کو سرسری طور پر بیان کیا جاتا ہے اس کی تفصیل آنے والے مباحث پر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ شیعہ اور سنی ذرائع سے منقولہ متعدد روایات میں بارہ آئمہ کے نام آئے ہیں (جس طرح مکتب اہل بیت ÷ کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے) ان میں بعض روایات میں ان میں سے سب سے پہلے حضرت علی اور سب سے آخری حضرت مہدی = کے نام ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ بعض میں ان میں سے صرف تیسرے امام یعنی حضرت حسین -کا نام ذکر ہوا ہے اس طرح سے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان ہوا ہے انہوں نے امام حسین -کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "هذا اِبْنِی اِمامٌ ابنُ امامٍ آخُو امامٍ اَبُو ائمّة تِسْعَةٍ"۔ یعنی: "یہ میرا بیٹا امام ہے، امام کا فرزند ہے، امام کا بھائی ہے اور نو اماموں کا باپ ہے۔"[2] یوں یہاں تمام آئمہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

زمین حجت خدا سے خالی نہیں ہوتی

اسلامی روایات میں جن مسائل پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے ان میں سے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ زمین الٰہی نمائندے سے خالی نہیں ہوتی۔ اہل بیت ÷ کے ذریعے سے ہم تک پہنچنے والی بہت ساری روایات میں یہ مطلب مکرر بیان ہوا ہے۔ کہ روئے زمین امام (یا پیغمبر) یا کلی طور پر حجت الٰہی سے خالی نہیں ہوتی۔

کافی شریف میں اس بارے میں دو باب باندھے گئے ہیں۔ ایک باب کا عنوان: "اِنَّ الْاَرْضَ لا تَخْلُو مِن حُجّةٍ" ہے۔ اس میں تیرہ روایات مذکور ہیں جو امام باقر -، امام صادق -، امام علی بن الرضا -اور دیگر اماموں سے منقول ہیں۔ دوسرے باب کا عنوان: "اِنَّه لو لم یَبْقَ فِی الاَرْضِ رَجُلانِ لَکانَ اَحَدُهما الحُجّة" یعنی: "اگر روئے زمین پر صرف دو آدمی بچ جائیں تو ان میں ایک حجت الٰہی ہوگا۔" اس باب میں اس مضمون کی پانچ روایتیں مذکورہ ہیں۔[3] یہاں پر ان دو ابواب میں سے بعض حدیثوں کو ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] حلیۃ الاولیاء جلد اصفحہ ۸۶ (فضائل الخمسہ کا الصحاح الستہ سے نقل کے مطابق جلد ۲ ص ۳۴)

[2] علامہ مرحوم کشف المراد (شرح تجرید العقائد) میں کہتے ہیں: یہ حدیث تواتر کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے (کشف المراد، صفحہ ۳۱۴ مکتبہ المصطفوی، قم)

[3] اصو کافی، جلد اول، صفحہ ۱۷۸، ۱۷۹

ایک روایت کے مطابق حضرت امام صادق - نے فرمایا: "اِنَّ الاَرْضَ لَا تَخْلُو اِلَّا وَ فِیْهَا اِمامٌ کَیْمَا اِنْ زَادَ الْمُؤْمِنُونَ شیئاً رَدَّهُمْ وَاِنْ نَقَصُوا شَیْئاً اَتَمَّهُ لهم۔" یعنی: "زمین کبھی بھی امام کے وجود سے خالی نہیں ہوتی امام کا وجود اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اگر مومنین (غیر دانستہ طور پر تعلیمات الٰہی میں) اضافہ کریں تو وہ انہیں پلٹا دیں اور اگر وہ کسی چیز کو کم کریں تو وہ اُسے مکمل کر دے۔ [۱]

ایک اور حدیث میں امام صادق - نے فرمایا: "اِنَّ اللّٰہَ اَجَلُّ واَعْظَمُ مِنْ اَنْ یَتْرُکَ الاَرْضَ بَغَیْرِ امامٍ عادلٍ۔" یعنی: "اللہ تعالیٰ اس سے بزرگ اور برتر ہے کہ وہ زمین کو عادل امام کے بغیر چھوڑ دے۔" [۲]

حتیٰ کہ بعض احادیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اگر امام اور حجت ایک لمحے کے لیے بھی زمین پر نہ ہوں تو زمین تباہ و برباد ہو جائے اور اپنے اہل کو غرق کر دے۔ [۳]

ایک اور حدیث میں امام صادق - سے منقول ہے: "لَو کَانَ النَّاسُ رَجُلَیْنِ لَکَانَ اَحَدُهُمَا الاِمَامَ۔" یعنی: "اگر دنیا میں دو انسان باقی رہ جائیں تو ان میں ضرور ایک امام ہو گا۔" اسی حدیث کے آخر میں آیا ہے: " وَ اِنَّ آخِرُ مَنْ یَمُوتُ الامامُ۔" یعنی: "اس دنیا میں سب سے آخر میں جانے والا شخص امام ہوگا۔" [۴]

مذکورہ بالا اٹھارہ احادیث کے علاوہ نہج البلاغہ میں بھی واضح طور پر اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے، حضرت علیؑ نے کمیل بن زیاد سے جو اہم ترین باتیں فرمائی ہیں ان میں انہوں نے ارشاد فرمایا: "اللھم بلیٰ لا تَخْلُو الاَرْضُ مِنْ قائِمٍ لِلّٰہِ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظاهِراً مشهوراً وَ اِمّا خائِفاً مغموراً لِئَلاَّ تَبْطُلُ حُجَجُ اللّٰہِ و بَیِّنَاتُهُ۔" یعنی: "ہاں! زمین کبھی بھی ایسی ہستی سے خالی نہیں ہوتی جو حجت الٰہیہ کے ساتھ قیام کرے خواہ وہ ظاہر ہو یا آشکار خوفزدہ یا ہراساں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے دلائل اور واضح نشانیاں مٹ اور ختم نہ ہو جائیں۔" [۵]

اس بارے میں علامہ مجلسی مرحوم نے بھی بحارالانوار کی جلد نمبر ۲۳ میں باب "**الاضطرار الی الحجة** (باب: حجت الٰہی کی ضرورت) میں ۱۱۸، احادیث دوسری کتابوں سے نقل کی ہیں کہ جن احادیث کا ایک حصہ تو وہی اصول کافی والی حدیث پر مشتمل ہے اور دیگر کتابوں سے مزید حصہ بھی نقل ہوا ہے۔ [۶]

---

[۱] اصول کافی، جلد اول، باب اول سے حدیث ۲ اور ۶۔

[۲] اصول کافی، جلد اول، باب اول سے حدیث ۲ اور ۶۔

[۳] اصول کافی، جلد اول، حدیث ۱۱، ۱۲۔ ۱۳۔

[۴] اصول کافی، جلد اول،، حدیث، ۳ (باب انه لولم یبق الا رجلین احدهما الامام)

[۵] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۷

[۶] بحارالانوار، جلد ۲۳، صفحہ ۱۔۵۶

اس لحاظ سے روئے زمین پر ہر دور اور زمانے میں حجت الٰہی کا موجود ہونا مکتب اہل بیت کے مسلمہ اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم - سے منقولہ ایک حدیث میں یہاں تک بیان ہوا ہے کہ: "اِنَّ اللهَ لا یُخلِی اَرْضَهُ مِنْ حُجَّةٍ طَرْفَةَ عَیْنٍ اِمّا ظاهِرٌ وَاِمّا باطِنٌ۔" یعنی: "ایک پلک جھپکنے کی حد تک بھی زمین حجت خدا سے خالی نہیں ہوتی وہ حجت ظاہر ہو یا پنہاں۔"[1]

حجت الٰہی کے لازم ہونے پر قرآنی اور منطقی دلائل

مذکورہ بالا روایات میں جو ذکر ہوا ہے وہ عقلی دلائل سے بھی قابل اثبات ہے کیونکہ "برہان لطف" جس کا ذکر بحث کی ابتداء میں امام یا پیغمبر الٰہی کے ہر دور اور زمانے میں موجود ہونے کی ضرورت کے موضوع میں کیا گیا تھا اور اسی طرح وہ خرابیاں جو اس کے نہ ہونے کی صورت میں پیدا ہوں گی یہانتک کہ اگر کرہ ارض پر صرف دو افراد موجود ہوں، ان کا بھی تذکرہ ہوا تھا، ان تمام صورتوں میں برہان لطف کار فرما ہے۔

قاعدہ لطف یہ کہتا ہے کہ جس نے انسان کو سعادت، ارتقاء اور کمال تک پہنچنے کے لیے خلق فرمایا ہے اور اس کے کاندھوں پر احکامات کا بوجھ ڈالا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کی ہدایت اور تربیت کے لیے تمام وسائل اور سہولتیں فراہم کرے اور اس ہدف کے حصول کے لیے بقدر ضرورت اس کے لیے وسائل و ذرائع مہیا کرے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو نقض غرض لازم آتی ہے اور اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم ہے وہ کبھی اپنے مقصد کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان میں صرف عقل جیسی قوت کا ہونا یا عام رہبروں کا موجود ہونا، اُسے غلطیوں، خطاؤں اور گناہوں سے پاک نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے الفاظ میں صرف انسان کا علم اُسے اس کی منزل مقصود یعنی اطاعت خدا اور ابدی سعادت تک نہیں پہنچا سکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اُسے کسی ایسے شخص کی بھی ضرورت ہے جو علم الٰہی کے بیکراں چشمے سے متصل ہو اور غلطی، اشتباہ اور گناہوں سے معصوم ہوتا کہ وہ احسن طور پر اتمام حجت کر سکے اور بغیر کسی کمی و بیشی کے راستے کی درست راہنمائی کر سکے۔

یہ دلیل ہر دور ہر زمانے اور ہر چھوٹے بڑے معاشرے یہاں تک کہ دو افراد پر مشتمل معاشرے پر صادق آتی ہے، بنابرایں اگر روئے زمین پر دو افراد کے علاوہ کوئی نہ ہو تو ان میں ایک کو پیغمبر خدا یا امام معصوم ہونا چاہیے۔ بہرصورت جیسا کہ ہم نے گزشتہ احادیث میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و برتر ہے کہ وہ انسانوں پر سعادت کی منزل مقصود تک پہنچنے کا فریضہ عائد کرے اور پھر درست اور غلطی سے مبرا راستہ کی انہیں نہ دکھائے۔ قرآن مجید کی بعض آیات میں اس مطلب کی طرف اشارے موجود ہیں جیسا کہ سورہ رعد کی آیت ۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

آپ تو بس ڈرانے والے ہی ہیں اور ہر قوم کیلئے ایک ہادی ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے ہادی ہے (ہادی اپنے حقیقی معنی میں یعنی اس کی ہدایت کامل اور ہر قسم کی غلطی سے پاک)

---

[1] بحارالانوار جلد ۷۴، صفحہ ۴۱۔

لہٰذا امام باقر - کی ایک حدیث ہم دیکھتے کہ آپ نے اس ہدایت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: "وَفِي كُلِّ زمانٍ إمامٌ مِنَّا يَهْدِيهِم إلى ماجاءَ بِهِ رَسولُ الله" یعنی: "ہر دور میں ہم میں سے ایک امام ہوتا ہے جو لوگوں کو اس چیز کی طرف ہدایت کرتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے تھے۔"[1]

نہج البلاغہ کی عبارت میں جو جملے تھے وہ اپنے اندر ایک منطقی دلیل کو لیے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ امام کے فرائض میں سے ایک تعلیمات الٰہی اور احادیث نبوی کی ہر قسم کی تحریف سے حفاظت کرنا ہے با الفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ اگر روئے زمین پر تمام لوگ کافر ہو جائیں تو پھر بھی کوئی تو موجود ہو جو نبوت کی تعلیمات اور ہدایات کی حفاظت کرے اور آئندہ آنے والی اور ہدایت چاہنے والی نسلوں تک ان ہدایات اور تعلیمات کو منتقل کرے بصورت دیگر اللہ تعالیٰ کی حجتیں محو ہو جائیں اور نشانیاں اور روشن دلیلیں مٹ جائیں: (لِئلاَّ تَبْطُلَ حُجَجُ اللهِ وبَيّناتُهُ)

یہاں پر ولایت عامہ کی بحث اختتام کو پہنچی ہے، اب ہم اس کی شرائط اور خصوصیات کو بیان کریں گے۔

[1] بحار الانوار، جلد ۲۳ صفحہ ۵، حدیث ۹۔

امام کی شرائط اور خاص صفات

اشارہ

اس بات کے پیش نظر کہ امام اور خلیفہ رسول ﷺ کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے شرائط بھی کڑی اور سخت ہونی چاہیں۔ امام کے لیے بھی وہی شرائط، صفات اور خصوصیات ہیں جو رسول ﷺ کے لیے ہیں کیونکہ دونوں کا راستہ اور ہدف و مقصد ایک ہے اور ایک ہی طرح کی ذمہ داری ان پر عائد ہے، رسول ﷺ پہلے مرحلے میں اور امام ان کے پیچھے بعد والے مرحلوں میں ہیں۔ جیسا کہ نبوت کے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ رسول ﷺ پر عظیم اور اہم فریضہ اور ذمہ داری کے عائد ہونے کے ناطے ان کے پاس بہت زیادہ وسیع علم و حکمت ہونا چاہیے تا کہ وہ انسانوں کو گمراہی کے خطرات سے بچا سکے اور نظریاتی، اخلاقی، معاشرتی اور فقہی مسائل میں ان کی راہنمائی کر سکے اور انہیں کمال و سعادت کی طرف ہدایت کر سکے اور احکام الٰہی کو کس قسم کی کمی بیشی کے بغیر بیان کر سکے۔

اس کے علاوہ اس کے پاس انسان کی روح اور جسم کے متعلق، اس کے نفسیاتی، معاشرتی اور انسانی معاشرے کے تاریخی مسائل کے بارے میں پوری معلومات ہونی چاہیں غرض یہ کہ انسان کی تربیت میں جو بھی انسانی شناخت اس کی مدد و معاون ہو اس کے بارے میں اُسے علم ہونا چاہیے۔ علم انبیاء کے موضوع میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ انہیں آئندہ کے واقعات و حالات کے متعلق بھی کم و بیش آگاہ ہونا چاہیے تا کہ مستقبل کے لیے صحیح اور دقیق منصوبہ بندی کر سکیں کیونکہ ان کی رسالت عمومی ہے۔ (اس بارے میں مزید وضاحت کے لیے پیام قرآن کی ساتویں جلد میں انبیاء کے علمی مقام صفحہ ۲۰۱ تا ۲۶۶ کا مطالعہ کریں)

یہ تمام باتیں تھوڑے سے فرق کے ساتھ سچے اماموں اور انبیاء کے جانشینوں پر صادق آتی ہیں کیونکہ وہ انبیاء کے مقاصد کو آگے بڑھانے والے اور انہی کے راستے کو جاری رکھنے والے ہیں۔ انبیاء نے جو بنیادیں رکھی ہیں آئمہ انہی کی تکمیل اور حفاظت کرنے والے ہیں انہوں نے اپنے بابرکت اور توانا ہاتھوں سے جن پودوں کو لگایا ہے ان کی آبیاری آئمہ کے طاقتور ہاتھوں سے ہوگی۔ ایک اور لحاظ سے یہ بھی ضروری ہے کہ آئمہ حق، انبیاء الٰہی کی طرح اپنی معلومات کو ہر قسم کی غلطی، بھول چوک اور انحراف سے پاک و پاکیزہ لوگوں تک پہنچائیں اگر وہ غلطیوں اور خطاؤں سے معصوم نہ ہوں تو ان کے موجود ہونے کے مقاصد اور اہداف پورے نہیں ہو سکیں گے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ چونکہ انبیاء دین اور دنیا میں انسانوں کے رہبر و راہنما ہوتے ہیں اس لیے ان تمام ظاہری اور باطنی عادات و اخلاق اور صفات سے انہیں پاک اور منزہ ہونا چاہیے جو لوگوں میں نفرت اور دوری کا موجب بنیں۔ تا کہ ان کی بعثت کے اہداف کی تکمیل ہو سکے اور نقض غرض پیش نہ آئے۔ بالکل یہی بات آئمہ حق کے متعلق بھی ثابت ہے وہ نہ صرف قابل نفرت اسباب اور صفات سے مبرا ہوں بلکہ ان کے اندر لوگوں کے قلوب اور افکار کو جذب کرنے کے لیے اخلاقی کشش اور جاذبیت کافی زیادہ ہونی چاہیے، اب سب سے پہلے علم امام کے بارے میں بیان کیا جائے گا۔

امام کا علم

قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس مسئلے کو بیان کیا گیا ہے۔ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾ (نساء/ ۸۳)

''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی خبر پہنچتی ہے تو وہ (بغیر تحقیق) اُسے خوب پھیلاتے ہیں اور اگر وہ اس خبر کو رسول اور اپنے میں سے صاحبان امر تک پہنچا دیتے تو ان میں اہل تحقیق اس خبر کی حقیقت کو جان لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند ایک افراد کے سوا باقی تم سب شیطان کے پیروکار بن جاتے۔''

ایک اور آیت میں ارشاد رب العزت ہے:''فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷﴾'' یعنی:''اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم و دانش سے پوچھ لو۔''(انبیاء/ ۷، نحل/ ۴۳) پہلی آیت یہ بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کچھ ایسے نادان موجود ہیں جو ایسی جھوٹی خبریں پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں جو اسلام دشمنوں اور منافقین کی طرف سے گھڑی گئی ہوتی ہیں؛ کبھی کامیابی کی جھوٹی خبر، کبھی شکست کی جھوٹی خبر اور کبھی دوسری من گھڑت خبریں۔ اور یہ چیز غفلت، جہالت اور بے خبری کا باعث بنتی ہے۔ نیز مسلمانوں کی ہمت و حوصلہ کو کمزور کرنے کا سبب بنتی ہے۔قرآن فرماتا ہے: اس قسم کے اہم سیاسی اور معاشرتی مسائل میں، جن سے مسلمان آگاہ نہیں ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا صاحبان امر کی طرف رجوع کریں۔

اولی الامر کا مطلب ہے صاحبان حکم و فرمان یقینا یہاں پر فوجی کمانڈر مراد نہیں ہے کیونکہ آیت میں بعد والا جملہ یہ کہتا ہے کہ وہ جو اہل تحقیق ہیں (یعنی مسئلہ کا اساسی طور پر اور مختلف پہلوؤں سے بغور جائزہ لیتے ہیں) وہ ان معاملات سے آگاہ اور باخبر ہیں۔لہٰذا نادان اور جاہل افراد کو ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے (قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ'' یستنبطونہ''''نَبَط'سے ہے بروزن فقط ہے اس کا اصلی معنی وہ پانی ہے جو پہلی مرتبہ کنویں سے نکالا جاتا ہے اور زمین کی بنیادوں سے نکلتا ہے اس لیے مختلف دلائل و شواہد کے ذریعے حقیقت کو حاصل کر لینا استنباط کہلاتا ہے)

یہ لفظ فقط علماء پر صادق آتا ہے نہ کہ فوجی کمانڈروں اور حکمرانوں پر اس لیے مسلمانون پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ حساس اور اہم ترین معاملات اور مسائل میں علماء اور صاحبان امر کی طرف رجوع کریں۔ یہاں پر اولی الامر سے مراد کون لوگ ہیں؟ مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ ان سے مراد فوجی کمانڈر ہیں (خصوصاً ان لشکروں کے کمانڈر جس لشکر میں آنحضرتؐ موجود

نہ تھے) بعض نے کہا ہے کہ علما اور فقہا مراد ہیں بعض کے بقول پہلے چار خلفاء ہیں، بعض کے مطابق اہل حل وعقد مراد ہیں اور بعض نے ان سے بارہ معصوم آئمہ مراد لیے ہیں۔

ان پانچ تفسیروں میں سے آخری زیادہ مناسب لگتی ہے، کیونکہ اس آیت کے آخر میں اولی الامر کی دو خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو غیر معصوم کے لیے ہر گز متصور نہیں ہوسکتیں۔ پہلے قطعی طور پر فرمایا گیا ہے کہ دو اگر وہ اولی الامر کی طرف رجوع کریں جو کہ مسائل کی تہہ تک جانتے ہیں، وہ ان کی راہنمائی کریں گے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا کہ ان کے علم میں جہل، شک اور غلطی کی آمیزش نہیں ہے اور یہ بات غیر معصوم کے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ صاحبان امر کے وجود کو ایک قسم کی رحمت اور فضل و احسان شمار کیا گیا ہے اس طرح سے کہ ان کی اطاعت اور پیروی لوگوں کو شیطان کی پیروی سے بچالیتی ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

''اور اگر تم پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً شیطان کی پیروی کرتے؛ مگر قلیل لوگ۔''

واضح ہے کہ صرف معصومین کی اتباع اور پیروی انسان کو شیطان کی پیروی اور گمراہی سے یقینی طور پر بچا سکتی ہے۔ کیونکہ اس کا امکان ہے کہ غیر معصوم افراد خود گمگا جائیں اور غلطی اور اشتباہ کا شکار ہو جائیں اور شیطان کے ہاتھوں کھلونا بن جائیں۔ اسی دلیل کی بنا پر شیعہ وسنی ذرائع سے منقولہ متعدد روایات میں اس آیت میں اولی الامر کی تفسیر آئمہ معصومین سے کی گئی ہے۔ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں امام باقر -سے یوں حدیث نقل کی ہے: ''هُمُ الائِمّةُ المعصومون۔'' یعنی: ''یہ معصوم امام ہیں۔''[1]

تفسیر عیاشی میں امام علی بن موسی الرضا -سے اس طرح سے حدیث بیان ہوئی ہے: يَعْنِى آلَ محمدٍ وَ هُمُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُونَ مِنَ الْقُرآنِ و يَعْرِفُونَ الحَلالَ و الحَرَامَ وَ هُم حُجَّةُ اللهِ علی خَلْقِهِ۔ یعنی: ''مراد آل محمد ہیں اور یہ وہ افراد ہیں جو قرآن سے استنباط کرتے ہیں، حلال وحرام کو بخوبی جانتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی اس کی مخلوق پر حجت ہیں۔''[2]

شیخ صدوق کی کتاب کمال الدین میں امام باقر -سے منقول ہے: آپ نے فرمایا: ''وَ مَنْ وَضَعَ وِلايَةَ اللهِ وَ اَهْلَ اِسْتِنْبَاطِ عِلْمِ اللهِ فِي غَيْرِ اَهْلِ الصَفْوَةِ مِنْ بُيُوتاتِ الانبياءِ فَقَد خالَفَ اَمْرَ اللهِ۔'' یعنی: ''جو شخص اللہ کی ولایت کو اور علم الٰہی کے استنباط کو اہل بیت انبیاء کے منتخب شدہ اور چنے ہوئے افراد کے علاوہ قرار دے اُس نے اوامر الٰہی کی مخالفت کی ہے۔''[3]

دوسری آیت یعنی: ''فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾'' یعنی: ''اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم و دانش سے پوچھ لو'' یہ آیت قرآن مجید کی دو سورتوں (نحل/ ۴۳ اور انبیاء/ ۷) میں آئی ہے اور سب لوگوں کو حکم دے رہی ہے کہ جن باتوں کو تم نہیں جانتے ہو وہ اہل ذکر سے پوچھ لو۔ بلا شک وشبہہ ذکر سے یہاں مراد آگاہی اور معلومات ہیں اور ''اَهْلُ الذكر'' میں تمام اطلاعات اور

---

[1] مجمع البیان، ج ۳، ص ۸۳

[2] تفسیر کنز الدقائق، ج ۳، ص ۴۸۶

[3] مجمع البیان، ج ۳، ص ۸۳

آ گاہی رکھنے والے افراد کلی طور پر شامل ہیں۔اسی دلیل کی بنا پر تقلید اور جاہل کے عالم کی طرف رجوع کرنے کے مسئلہ میں اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے،لیکن اس کے اتم اور اکمل مصداق وہ افراد ہیں جن کے علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا علم ہے۔ان کا علم غلطی اور اشتباہ سے پاک ہے،عصمت کی خصوصیت سے موصوف ہے۔

اس بنا پر اس آیت کی تفسیر اہل بیتؑ کے معصوم اماموں سے کی گئی ہے۔اسی حوالے سے ایک حدیث جو امام علی بن موسیٰ الرضا ؑسے نقل ہوئی ہے،اس میں جب مذکورہ آیت کے بارے میں سوال ہوا تو امامؑ نے فرمایا:"نحنُ اَهْلُ الذِّكرِ وَ نَحْنُ المَسْئولان"۔یعنی:"اہل ذکر ہم ہیں اور ہم سے ہی پوچھا جائے۔"[1]

اہم بات تو یہ ہے کہ یہی معنی یا اس سے قریب مطلب اہل سنت کی بارہ تفسیروں میں بیان ہوا ہے،ان تفسیروں کے نام یہ ہیں:تفسیر ابو یوسف،تفسیر ابن حجر،تفسیر مقاتل بن سلیمان،تفسیر وکیع بن جراح،تفسیر یوسف بن موسیٰ القطان،تفسیر قتادہ،تفسیر حرب الطائی،تفسیر سدی،تفسیر مجاہد،تفسیر مقاتل بن حیان،تفسیر ابی صالح اور تفسیر محمد بن موسیٰ شیرازی۔ان تفاسیر میں ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ آیت "فاسئلوا اهل الذكر"سے مراد:"هو محمدُ وعليٌ وفاطمةُ والحَسَنُ والحُسَيْنُ عليهم السّلام هُم اَهْلُ الذِكر والعِلْم والعقل والبيان وَهُمْ اَهْلُ بَيْتِ النُّبُوَّةِ..."یعنی:"یہ محمدؐ علیؑ،فاطمہؑ،حسنؑ،اور حسینؑ ہیں یہی اہل ذکر،اہل علم اور اہل عقل ہیں اور یہی نبوت کے گھرانے والے ہیں۔"[2]

مختصر یہ کہ آیت کا مفہوم اگرچہ وسیع اور عام ہے لیکن اس کا کامل اور جامع نمونہ آئمہ معصومین میں قابل تصور ہے جن کا علم ہر قسم کے شک وشبہہ اور غلطی سے مبرا ہے،اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سابقہ انبیاء کی نشانیوں،تورات،انجیل،اور یہود ونصاریٰ کے علماء سے سوال کے بارے میں آیت کا نزول،آیت کے مذکورہ معنی اور مطلب کے منافی نہیں ہے۔

یاددہانی

جیسا کہ ہم نے اس تفسیر کی ساتویں جلد میں انبیاء کے علمی مقام ومرتبے کے عنوان میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی ذمہ داری اور فریضہ انسانوں کی تمام مادی اور معنوی پہلوؤں سے ہدایت کرنا ہے اور ان کی ذمہ داری کا دائرہ کار جسم اور روح اور دنیا وآخرت ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس علم ودانش کا بہت بڑا ذخیرہ ہونا چاہیے تاکہ وہ احسن انداز سے اپنی ذمہ داری اور فریضے کو انجام دے سکیں۔

رسول اکرم ﷺ کے جانشین آئمہ کے لیے بھی یہی حکم ہے ان کے پاس اپنی عظیم ذمہ داری اور فریضے کے مطابق علم کا خزانہ ہونا چاہیے تاکہ لوگ ان پر اعتماد اور بھروسہ کریں اور اپنے دین وایمان کو ان کے سپرد کردیں۔یہ علم ومعرفت ہر قسم کی خطا،غلطی،اشتباہ اور

---

[1] تفسیر برہان،ج۲،ص۳۶۹

[2] احقاق الحق،جلد۳۔صفحہ ۴۸۲۔

نقص سے پاک ہوں ورنہ اعتماد حاصل نہ ہو سکے گا اور لوگ اپنے بعض نظریات اور افکار کو پیغمبر اور امام کے افکار پر فوقیت دینا جائز سمجھیں گے، اس لحاظ سے کہ پیغمبر اور امام بھی غلطی کر سکتے ہیں لہٰذا سو فی صد ان کی بات نہیں مانی جا سکتی۔ پس ثابت ہوا کہ مکمل اعتماد اس وقت حاصل ہوگا جب وہ مقام عصمت پر فائز ہوں گے۔

قرآن مجید، بنی اسرائیل کے ایک رہبر طالوت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ (بقرہ/۲۴۷)

''بے شک اللہ نے اُسے تمہارے مقابلے میں منتخب کیا ہے اور اُسے علم اور جسمانی طاقت کی فراوانی سے نوازا ہے۔''

بنی اسرائیل مختلف بہانے بنا رہے تھے وہ کہتے تھے کہ طالوت تو ایک غیر معروف اور غریب گھر کا فرد ہے، مال و دولت بھی نہیں رکھتا ان کے مقابلے میں ارشاد ہوا کہ الٰہی حکمرانی کے اصلی رکن علم اور قدرت ہے اور ان چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے اُسے وافر مقدار میں نوازا ہے۔ حضرت یوسف - کے واقعہ میں آیا ہے کہ جب حکومت مصر کی ایک وزارت بیت المال کے لیے اپنے آپ کو لائق اور عہدہ برا ہونے کے لیے پیش کیا تو انہوں نے علم و آگاہی اور امانت داری پر زور دیا۔

قَالَ اجْعَلْنِىْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾ (یوسف/۵۵)

''یوسف نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کریں میں بلاشبہ خوب حفاظت کرنے والا آگاہ اور مہارت رکھنے والا ہوں۔''

جس طرح ہم نے انبیاء کے علم کے متعلق کہا تھا کہ کم از کم انہیں غیب کا کچھ علم ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری اور فریضہ کو بخوبی انجام دے سکیں، یہ بات اماموں کے بارے میں بھی ضروری ہے۔ ان کی ذمہ داری بھی عالمی ہے انہیں بھی اس دنیا کے اسرار و رموز سے آگاہ ہونا چاہیے ان کی ماموریت گزشتہ اور آئندہ دونوں سے جڑی ہوئی پس وہ کس طرح ماضی اور مستقبل سے بے خبر اور لاعلم رہ کر اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے انجام دے سکتے ہیں اور سب کے لیے منصوبہ بندی اور لائحہ عمل مرتب کر سکتے ہیں۔

ان کے فرائض اور ماموریت کا دائرہ کار معاشرے کی ظاہری اور باطنی حالت اور لوگوں کی اندرونی و بیرونی صورتحال پر مشتمل ہے۔ ان تمام اہم ترین امور کو بجالانا، علم غیب سے آگاہی کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو امام صادق -کی حدیث میں بڑے دلکش الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا:

مَنْ زَعَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَحْتَجُ بِعَبْدٍ فِى بِلَادِهٖ ثُمَّ يَسْتُرُ عَنْهُ جميعَ مَا يحتاجُ اِلَيْهِ فَقَدِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ۔

''جو شخص یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو زمین پر اپنی حجت قرار دے اور پھر جن چیزوں کی اُسے

ضرورت ہے اللہ تعالیٰ اُس سے چھپا دے، تو اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔"[1]

درحقیقت ماضی، حال اور مستقبل کے اسرار و رموز کا علم، انسانوں کی ہدایت کی اہم ترین ذمہ داری ادا کرنے اور حجت الٰہی ہونے کا ذریعہ ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ امامت کے مقام و منصب پر فائز ہونے کی پہلی شرط علم و معرفت اور دانش ہے، تمام دینی تعلیمات، لوگوں کی ضروریات اور جو کچھ انسان کی تعلیم و تربیت اور ہدایت اور انسانی معاشرے کو چلانے کے لیے ضروری ہے اس کا علم امام کے پاس ہونا لازمی ہے۔ اور ایسے علم کے بغیر ذمہ داری ہرگز ادا نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

[1] البصائر الدرجات، بحار کے نقل کے مطابق، جلد ۲۶، صفحہ ۱۳۷

آئمہ اطہارؑ کے علم کا سرچشمہ

آئمہ معصومین کے علم کے بارے میں اہم ترین قابل توجہ اور قابل غور مسئلہ ان کا علمی سرچشمہ ہے یعنی دین و دنیا کے امور کا وسیع اور عظیم علم انہیں کہاں سے حاصل ہوا ہے جب کہ یہ امر بھی مسلم ہے کہ آسمانی وحی ان پر نازل نہیں ہوتی، خاتم الرسل کی رحلت کے بعد وحی کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے، پس شریعت کے احکام، اسلام اور مسلمانوں کی حکمتوں اور مصلحتوں سے، اور امت کی ہدایت کے لیے لازمی امور اور گزشتہ اور آئندہ سے متعلق حقائق سے وہ کس طرح مطلع اور باخبر ہوتے ہیں؟

قرآن کی آیات سے بطور خلاصہ اور اسلامی روایات سے مفصل طور پر ان سرچشموں اور ماخذ کی معلومات واضح انداز سے مل سکتی ہیں۔ یہ ماخذ گونا گوں قسم کے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ کتاب الٰہی یعنی قرآن مجید کا مکمل علم

اس طرح سے کہ وہ تمام قرآن کی تفسیر، تاویل، ظاہر اور باطن اور اس کے محکم و متشابہ سے پوری طرح باخبر ہیں۔ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے: وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ۝ (رعد/ ۴۳) یعنی: اور کافر کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں، کہہ دیں! میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے کافی ہیں۔

اس آیت سے یہ بات بڑی واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ کوئی ہستی موجود ہے جس کے پاس تمام کتاب کا علم ہے۔ (توجہ رہے کہ اس آیت میں ''علم کتاب'' بطور مطلق آیا ہے اور قرآن مجید سے متعلق تمام علوم کو شامل ہے۔ سورہ نمل کی آیت ۴۰ میں اس کے برخلاف ہے، وہاں ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ

جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اس نے کہا: میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے اسے (تخت بلقیس کو) آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں۔

یقیناً اللہ کی کتاب علوم و معرفت کا فیاض سرچشمہ ہے اور اس کا علم تمام امور کے لیے عقدہ کشا ہے، جب حضرت سلیمان کے وزیر جناب آصف بن برخیا، کتاب الٰہی کے کچھ علم کی بدولت اتنا بڑا کام انجام دے سکتے ہیں، اور چشم زدن میں جزیرۃ العرب کے آخری جنوبی حصے (یمن) سے آخری شمالی حصے (شام کا علاقہ حضرت سلیمان کی حکومت کا مرکز) تک پہنچا سکتے ہیں تو مسلم ہے کہ جس کے پاس تمام کتاب کا علم ہے وہ اس سے بھی زیادہ اہم اور بڑے کام انجام دے سکتا ہے رہی یہ بات کہ وہ کون ہے جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے، اس حوالے سے قرآن مجید نے ایک مجمل اشارہ کیا ہے۔ بعض افراد کا کہنا ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ (اس لحاظ سے ''من عندہ علم

الکتاب ‘‘) کے جملے کا عطف، عطف تفسیری ہو گا جو کہ ظاہر کلام کے برخلاف ہے۔

نیز چند مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب کے علماء اور سلمان اور عبداللہ بن اسلام جیسے افراد ہیں جنہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کی نشانیوں کو سابقہ آسمانی کتابوں میں دیکھا تھا اور وہ آنحضرتؐ کی حقانیت کے گواہ بن گئے۔ البتہ بہت سارے مفسرین نے اپنی کتب میں بیان کیا ہے کہ یہ آیت علی ابن ابی طالب اور دیگر ائمہ ہدیٰ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ مشہور مفسر قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں عبداللہ بن عطا سے نقل کیا ہے، کہ میں نے ابوجعفر بن علی بن الحسین سے کہا کہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ’’اَلّذِی عِنۡدَہٗ عِلۡمُ الکتٰاب‘‘ سے مراد عبداللہ بن سلام ہے، جواب میں انہوں نے فرمایا: اِنَّمَا ذٰلِكَ عَلِيُّ بنُ اَبِيۡ طالب رضی الله عنه۔ یہ فقط علی بن ابی طالبؑ ہیں، اسی طرح محمد بن حنیفہ نے بھی کہا ہے۔[۱]

دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ سورہ (رعد) مکے میں نازل ہوئی ہے جب کہ عبداللہ بن سلام اور سلمان فارسی اور اہل کتاب کے دیگر علماء مدینے میں دائرے اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ سعید بن جبیر سے بھی یہی بات نقل ہوئی ہے جب اُن سے پوچھا گیا کہ کیا ’’من عندہ علم الکتاب‘‘ سے مراد عبداللہ بن سلام ہیں؟ جواب دیا وہ کس طرح سے مصداق ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ سورہ مکی ہے[۲]

شیخ سلیمان قندوزی حنفی[۳] ’’ینابیع المودۃ‘‘ میں ثعلبی سے اور ابن مغازلی ’’عبداللہ بن عطا‘‘ سے نقل کرتے ہیں کہ میں محمد باقر - کے ساتھ مسجد میں تھا، میں نے عبداللہ بن سلام کے بیٹے کو دیکھا تو کہا یہ اس کا بیٹا ہے جس کے پاس کتاب کا علم ہے اس پر انہوں نے (امام محمد باقر -) فرمایا: یہ آیت علی بن ابی طالب - کی شان میں ہے۔[۴]

اسی کتاب میں ایک اور روایت عطیہ عوفی کے ذریعے ابوسعید خدری سے نقل ہوئی ہے کہ میں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے (سورہ نمل) کی آیت (نمبر ۴۰) ’’الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ‘‘ کے بارے میں پوچھا، آپؐ نے فرمایا: وہ میرے بھائی سلیمان بن داود کے وزیر تھے۔ پھر میں نے ’’قُل کَفٰی بِاللّٰہِ شَیۡھداً بَنِیۡ وَبَیۡنِکُم وَمَنۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ الۡکِتَاب‘‘ کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:

ذاكَ آخی عَلِیُّ بۡنُ ابی طالبٍ[۵]

وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں۔

نیز ایک اور روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن عباس بیان کرتے ہیں:

---

[۱] تفسیر قرطبی، جلد ۵، صفحہ ۳۵۶۵

[۲] الدر المنثور، جلد ۴، صفحہ ۶۹

[۳] قندوز، افغانستان کے شمال میں ایک شہر ہے اور اہل سنت کے یہ عالم وہاں کے رہنے والے تھے۔

[۴] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۰۲

[۵] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۰۳

مَنْ عِنْدَهُ عِلمُ الکتابِ اِنَّما هُوَ عَلِیٌّ لَقَدْ کان عالماً بالتفسیرِ و التّأویلِ و النّاسِخِ وَ الْمَنْسُوخِ۔

جس کے پاس کتاب کا علم ہے وہ فقط علیؑ ہیں، وہ قرآن کی تفسیر اور تاویل کو جانتے ہیں اور ناسخ و منسوخ سے بھی آگاہ ہیں۔[1]

مختصر یہ کہ مذکورہ آیت کی تفسیر کسی صورت میں بھی اہل کتاب کے علماء سے نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور وہ ہجرت کے بعد مدینے میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں، مذکورہ روایات کے مطابق اس سے مراد علیؑ ہیں (اور ان کے ذریعے دیگر معصوم آئمہ تک پہنچتی ہے) درحقیقت قرآن مجید کا مکمل علم اس کے اسرار اور حقائق اس کے ظاہر اور باطن سے آگاہی آئمہ معصومین کے علم کا اصلی سرچشمہ اور منبع ہے۔[2]

اس مطلب پر گواہ قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ (آل عمران/۷)

اس کی حقیقی تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں

اس کی تشریح کچھ یوں ہے: مفسرین کے درمیان بحث ہے کہ کیا ''الرّٰسخون فِی العلم'' کا عطف ''اللہ پر'' ہے؟ اگر اس کا عطف ''اللہ'' پر ہو تو آیت کا معنی یوں ہوگا کہ تاویل قرآن کو اللہ اور راسخون فی علم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ مستقل اور الگ جملہ ہے اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کی تاویل کو صرف ''اللہ'' جانتا ہے اور علم میں پختہ مقام رکھنے والے کہتے ہیں: اگرچہ ہم آیات متشابہ کی تاویل کو نہیں جانتے مگر ان سب کو تسلیم کرتے ہیں۔ پہلے والا معنی اور رائے چند دلائل سے ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ بہت بعید ہے کہ قرآن میں ایسے اسرار موجود ہوں جنہیں سوائے خدا کے اور کوئی نہ جانتا ہو کیونکہ قرآن تو انسانوں کی ہدایت اور تربیت کے لیے نازل ہوا ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس میں ایسی آیات اور جملے ہوں جن کا مطلب اللہ تعالی کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو۔

۲۔ جیسا کہ عظیم مفسر طبرسی اپنی تفسیر ''مجمع البیان'' میں لکھتے ہیں: مفسرین قرآن میں کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ قرآن کی فلاں آیت کا معنی سوائے خدا کے اور کوئی جانتا، بلکہ ان سب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ آیات کے معانی اور اسرار کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف ذرائع سے استفادہ کریں من جملہ معصومین کی روایات سے درحقیقت ''تاویل قرآن کو صرف اللہ جانتا ہے'' والی بات مفسرین کے اجماع کے خلاف ہے۔

۳۔ اگر مراد علم و آگاہی کے بغیر سر تسلیم خم کرنا ہے تو پھر انہیں ''ایمان میں راسخ'' کہنا چاہیے نہ کہ علم میں راسخ جو کسی چیز کو نہیں جانتا اُسے

---

[1] ینابیع المودة، صفحہ ۱۰۴

[2] اس بارے میں متعدد قابل توجہ احادیث، آئمہ ہدی کے طرق سے نقل ہوئی ہیں، مزید معلومات کیلئے تفسیر کنز الدقائق ج۶، صفحہ ۴۸۰ اور اسی آیت کی تفسیر میں تفسیر البرہان کا مطالعہ کریں۔

''راسخون فی العلم '' کیسے کہا جا سکتا ہے۔

۴۔متعدد روایات میں بیان ہوا ہے کہ قرآن کی آیات کی تاویل کو علم میں راسخ مقام رکھنے والے جانتے ہیں اور یہ دلیل ہے کہ ''الراسخون فی العلم '' کا عطف ''اللہ'' پر ہے۔امام صادق –سے حدیث میں آیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

الرّاسِخُون فِی العِلْمِ امیرُالمومنینَ والاَئِمَّة مِنْ بَعْدِہِ [۱]

علم میں راسخ امیرالمومنین ؑ اوران کے بعد والے امام ہیں۔

ایک اور حدیث میں امام صادق –نے فرمایا ہے:

نَحْنُ الرّاسخون فی العلمِ وَنَحْنُ نَعْلَمُ تأوِیلَه [۲]

ہم ہی ''راسخون فی العلم'' ہیں اور ہم قرآن کی تاویل کو جانتے ہیں۔

اسی طرح ایک حدیث اور ہے جس میں امام محمد باقر ؑ (یاامام صادق –)نے آیت ''و مایعلَمُ تاویله اِلّا اللهُ و الرَّاسخون فِی العلمِ '' کی تفسیر میں فرمایا:

فَرَسولُ اللهَ اَفضَلُ الرّاسِخِیْنَ فِی العِلْمِ ،قَدْ عَلَّمَہُ اللهُ عَزَّ وجَلَّ جَمِیْعَ مَا اَنْزَلَ عَلَیْہِ مِنَ التَّنْزِیلِ و التَّأویل وَ مَا کان اللهُ لِیُنَزِّلَ علیه شَیْئاً لَم یُعَلِّمْهُ تأویلَهُ و اوصیا ئُهُ مِنْ بَعْدِہ یَعْلَمُونَهُ کُلِّہِ۔

رسول خدا ﷺ سب سے افضل راسخون فی العلم تھے،اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آنحضرتؐ پر نازل کیا اس کی تنزیل اور تاویل سے آپؐ کو آگاہ کیا،ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی چیز نازل کرے لیکن اس کی تفسیر اور تاویل آپ کو نہ سکھائے اور آنحضرتؐ کے بعد ان کے تمام اوصیاء اس سب کا علم رکھتے ہیں۔[۳]

اس کے بارے میں اور بھی متعدد روایات موجود ہیں جو اس مطلب اور مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔[۴]

مذکورہ بالا چار دلائل (اگر چہ ان میں ہر ایک مطلب کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا) کی روشنی میں اب کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ ''و الراسخون فی العلم '' والا جملہ ''اللہ'' پر عطف ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قرآن کے گہرے اور عمیق مطالب اور اس کی تاویل سے باخبر ہیں۔

---

[۱] اصول کافی،جلد اول،صفحہ ۲۱۳،حدیث نمبر ۱

[۲] اصول کافی،جلد اول،صفحہ ۲۱۳،حدیث نمبر ۳

[۳] اصول کافی،جلد اول،صفحہ ۲۱۳،حدیث نمبر ۲

[۴] مزید وضاحت کیلئے جامع الاحادیث: جلد اول،صفحہ ۷،۲ تفسیر کنزالدقائق صفحہ ۴۲ تا ۴۵ اور اصول کافی،جلد اصفحہ ۴۱۵ کا مطالعہ کریں۔

ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ "و الراسخون فی العلم " کے الفاظ قرآن مجید میں دو مرتبہ آئے ہیں ایک مرتبہ زیر بحث (آل عمران/ ۷۷) آیت میں، اور دوسری مرتبہ سورہ نساء کی آیت ۱۶۲ میں، وہاں پر اہل کتاب یہود و نصاری کے برے اور قبیح اعمال میں جملہ سود خوری اور لوگوں کے اموال کو لوٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

لیکن ان (اہل کتاب) میں سے جو علم میں راسخ ہیں اور اہل ایمان (اصحاب رسول) اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا ہے۔

یعنی دونوں گروہ تمام آسمانی کتب (خواہ قرآن ہو یا سابقہ آسمانی کتب) پر ایمان رکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جنہوں نے عبداللہ بن سلام اور دیگر ایمان لانے والے اہل کتاب کے علماء کو "و الراسخون فی العلم " کی تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے وہ سورہ نساء کی اس آیت (۱۶۲) سے مربوط ہے نہ کہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۷ سے۔ کیونکہ جو آیت اہل کتاب کے علماء کی بات کر رہی ہے، وہ یہ پہلی آیت ہے، لیکن ہماری زیر بحث آیت (سورہ آل عمران/ ۷) کا اہل کتاب کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ بھی واضح ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ نہج البلاغہ کے خطبہ اشباح میں علیؑ نے فرمایا:

وَ اعْلَمْ اَنَّ الرّٰاسِخِينَ فِي العِلْمِ هُمُ الَّذِيْنَ اَغْنَاهُمُ اللّٰهُ عَنِ اقْتِحامِ السُّدَدِ المَضْرُوبَةِ دُونِ الغُيُوبِ لِاَقْرارُ بِجُمْلَةِ ما جَهِلُوا تَفْسِيرَهُ مِنَ الغَيْبِ المحجُوبِ.. [1]

یاد رکھو علم میں راسخ اور پختہ افراد وہی ہیں کہ جو غیب کے پردوں میں چھپی ہوئی ساری چیزوں کا اجمالی طور پر اقرار کرتے ہیں اگر چہ ان کی تفسیر تفصیل نہیں جانتے اور یہی اقرار انہیں غیب پر پڑے ہوئے پردوں میں درانہ گھسنے سے بے نیاز بنائے ہوئے ہے۔

ممکن ہے کہ یہ سورہ نساء کی آیت کی طرف اشارہ ہو جس میں اہل کتاب کے کچھ علماء اور مومنین کے قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کے سامنے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کرنے کی بات کی گئی ہے، نہ کہ سورہ آل عمران کی زیر بحث آیت کی طرف (غور کیجیے گا)

مختصر بات یہ کہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۷ ظاہری طور پر یہ بتاتی ہے کہ قرآن کا معنیٰ اور تاویل اور علم میں راسخ اور پختہ افراد جانتے ہیں یاد رہے کہ علم میں راسخ سے مراد پہلے درجے پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم اور آئمہ معصومین ÷ ہیں، پس اس طرح سے ثابت ہوا کہ ان کے علم کا اہم ترین مأخذ اور منبع قرآن مجید، اس کی تفسیر و تاویل اور اس کا ظاہر و باطن ہے۔

اس بات کو قرآن مجید کی چند دیگر آیات کے تذکرے کے ساتھ ختم کرتے ہیں، سورہ عنکبوت کی آیت ۴۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱ (خطبہ اشباح) اور ترجمہ کے مطابق خطبہ ۸۹ ہے۔

بَلۡ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيۡ صُدُوۡرِ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ؕ یعنی: ''یہ واضح اور روشن نشانیاں ہیں ان کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا ہے۔'' اہل بیتؑ کے ذرائع سے منقولہ بہت ساری روایات میں بیان ہوا ہے کہ ''الّذِین اُوتُو العلم ''سے مراد (حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد) معصوم امام ہیں۔

مزید معلومات کے لیے بحارالانوار اور تفسیر برہان کا مطالعہ کریں[1]

۲۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وراثت

آئمہ معصومین کے علم کا دوسرا مأخذ اور منبع پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وراثت ہے، اس معنی میں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت کے تمام احکام علی بن ابی طالب-کو تعلیم دیئے اور بعض روایات کے مطابق علیؑ نے انہیں اپنے ہاتھوں سے ایک کتاب میں لکھا اور یہ علم و دانش یکے بعد دیگرے ان کے فرزندوں یعنی معصوم اماموں تک پہنچا۔ایک اور انداز سے یوں کہا جائے کہ (جیسا کہ اسلامی روایات میں آیا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کے ایک ہزار باب علیؑ کو تعلیم فرمائے اور ان میں سے ہر باب سے علم کے ہزار باب اور کھل گئے۔

اصول کافی میں اس بارے میں بہت ساری حدیثیں موجود ہیں ان میں ایک حدیث ابوبصیر نے نقل کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام صادق -سے پوچھا کہ آپ کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو علم کا ایک باب تعلیم دیا اور اس سے ہزار باب علم کے کھل گئے۔امامؑ نے فرمایا: ''عَلَّمَ رسولُ علیاًّ اَلۡفَ بابٍ یُفۡتَحُ مَنۡ کُلِّ بابٍ اَلۡفُ بابٍ۔یعنی: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو ہزار باب علم کے سکھائے (نہ صرف ایک باب) اور ہر ایک باب سے ہزار باب کھل گئے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا: اے ابوبصیر! اِنَّ عِنۡدَنَا الجامعه .... قُلۡتُ وَ مَا الجامعَةُ؛ قَالَ صَحِيۡفَةُ طُولُها سَبۡعُونَ ذراعًا بِذراعِ رَسُولِ اللهِ وَ اِمۡلائِه مِنۡ فَلۡقِ فِيه وخَطِّ عَلِيّ بِيَمِيۡنِه فيها كُلُّ حلالٍ و حرامٍ و كُلُّ شيئٍ يَحۡتَاجُ النَّاسُ اِلَيۡهِ حتّى الاَرۡشِ فِي الخَدۡشِ۔ یعنی: جامع ہمارے پاس ہے، میں نے پوچھا! جامع کیا ہے؟ فرمایا: ایک صحیفہ ہے جس کی لمبائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ کے برابر ستر ہاتھ ہے، جسے آنحضرتؐ نے اپنی زبان مبارک سے لکھوایا اور علیؑ نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا، اس میں ہر حلال اور حرام موجود ہے (قیامت تک) انسانوں کو جس چیز اور حکم کی ضرورت تھی وہ سب اس میں مذکور ہے، یہاں تک کہ بدن پر ایک خراش کی دیت کا بھی ذکر ہے۔[2]

قابل توجہ امر یہ ہے کہ مشہور حدیث ''مدینة العلم ''کے متعلق اہل سنت اور شیعہ کی مشہور کتب میں بے شمار روایات موجود ہیں۔ان روایات کے راویوں میں ابن عباس، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عمر اور علی ابن ابی طالب-جیسی قابل قدر شخصیات ہیں۔جن

---

[1] بحارالانوار، جلد ۲۳، صفحہ ۱۸۸ تا ۲۰۸، تفسیر برہان: ج ۳، صفحہ ۲۵۴ تا ۲۵۶۔(ان دو کتابوں میں تقریباً ۲۰ حدیثیں اس بارے میں نقل ہوئی ہیں)

[2] اصول کافی، جلد ا صفحہ ۲۳۹

محدثین اور مصنفین نے اپنی کتب میں اس حدیث کو جگہ دی ہے ان میں حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب مستدرک میں، ابوبکر نیشاپوری نے تاریخ بغداد میں ابن مغازلی نے مناقب امیر المومنین -میں، گنجی نے کفایہ الطالب میں، حموینی نے "فرائدالسمطین" میں ذھبی نے میزان الاعتدال میں، قندوزی نے "ینابع المودۃ" میں نبھانی نے الفتح الکبیر میں اور دیگر افراد قابل ذکر ہیں۔[۱]

متعدد روایات میں نہایت صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ فرمایا کرتے تھے: جو کچھ ہم بیان کرتے ہیں تم لوگ اُسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت دے کر نقل کر سکتے ہو کیونکہ یہ سب کچھ نے اپنے آباء اور اجداد کے ذریعے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے۔ امام صادق -کے صحابی نے آپ سے پوچھا: کبھی ہم کوئی حدیث آپ سے سنتے ہیں پھر ہمیں شک ہوجاتا ہے کہ آپؑ سے سنی ہے یا آپ کے والد گرامی سے؟ انہوں نے فرمایا:

ما سَمِعْتَهُ مِنِّي فَارْوِهِ عَنْ أَبِي وَما سَمِعْتَهُ مِنِّي فارْوِهُ عَنْ رَسُولِ الله

جو حدیث تم نے مجھ سے سُنی ہے اُسے میرے والد سے نقل کرو اور جو کچھ مجھ سے سُنا ہے اُسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرو:[۲]

ایک اور مقام پر انہوں نے فرمایا:

حَدیثی حَدیثُ اَبی، وَ حَدِیْثُ اَبی حَدیثُ جَدّی وَ حَدِیثُ جَدّی حدیث الحُسَیْنِ، وَ حَدِیثُ الحُسَیْنِ حَدِیثُ الحَسَنِ و حَدیثُ الحَسَنِ حَدِیثُ امیرِ المُؤمِنینَ وحَدیثُ امیرِالمومنینَ ،حدیثُ رَسول اللهِ (ص)،وحدیث رسول اللهِ (ص)قَوْلُ الله عَزَّوجَلَّ۔

میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے، میرے والد کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے، میرے دادا کی حدیث حسینؑ کی حدیث ہے، حسینؑ کی حدیث حسنؑ کی حدیث ہے، حسنؑ کی حدیث امیر المومنینؑ کی حدیث ہے، امیر المومنینؑ کی حدیث رسول اللہؐ کی حدیث ہے اور رسول اللہؐ کی حدیث اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔[۳]

ایک تیسری حدیث بھی امام صادق -منقول ہے۔ جس میں انہوں نے واضح طور پر فرمادیا:

مَهْما اَجَبْتُكَ فِيه بشَيءٍ فَهُو مِنْ رَسُولِ اللهِ لَسْنا نَقُولُ بِرَأْيِنا مِنْ شيءٍ

---

[۱] مزید معلومات کیلئے احقاق الحق، جلد ۵، صفحہ ۴۶۸ سے ۵۰۱ تک مطالعہ کریں اس حدیث کے شیعہ ماخذ کیلئے جامع الاحادیث، پرانی چھاپ، صفحہ ۱۶ کے بعد مطالعہ کریں۔

[۲] جامع الاحادیث جلد ۱، صفحہ ۱۷ باب حجیۃ فتویٰ الائمہ۔

[۳] ایضا، حدیث نمبر ۱

جب بھی میں تمہیں کسی سوال کا جواب دوں یہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہوگا کیونکہ ہم اپنی رائے سے کوئی چیز بیان نہیں کرتے۔[1]

۳۔فرشتوں سے رابطہ

آئمہ معصومین کے علم کا تیسرا سرچشمہ ان کا فرشتوں سے ارتباط ہے۔البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ انبیاء اور پیغمبروں کی صف میں شامل تھے کیونکہ ہمارا ایمان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے آخری نبی اور رسول تھے اور ان کی رحلت کے ساتھ وحی الٰہی کا خاتمہ ہوگیا۔لہٰذا آئمہ کی مثال حضرت خضر، حضرت ذوالقرنین اور حضرت مریم کی سی ہے جن کا قرآن کی آیات کے مطابق فرشتوں سے رابطہ تھا اور عالم غیب سے ان کے دلوں پر حقائق کا الہام ہوتا تھا۔

امام باقر -سے ایک حدیث میں بیان ہوا ہے، انہوں نے فرمایا:اِنَّ علیًّا کانَ مُحَدِّثا علی محدث تھے (جن سے کلام کیا جاتا ہو) تھے، اور جب ان سے اس کی وضاحت پوچھی گئی کہ کون اُن سے کلام کرتا تھا تو انہوں نے فرمایا:یُحَدِّثُہُ مَلَکٌ "فرشتہ اُن سے کلام کرتا تھا" جب یہ پوچھا گیا کہ کیا وہ پیغمبر تھے تو انہوں نے اپنے ہاتھوں کو انکار کے طور پر ہلاتے ہوئے فرمایا:

کَصاحِبِ سُلَیمانَ او کَصاحِبِ موسیٰ اَوْ کَذِی القَرنَیْنِ[2]

وہ سلیمان ؑ کے ساتھی (آصف بن برخیا) یا موسیٰ ؑ کے ساتھی (یوشع یا خضرؑ) یا ذوالقرنین کی طرح تھے۔اس بارے میں اور بھی بہت ساری روایات موجود ہیں۔

۴۔روح القدس کا الہام

آئمہ ہدیٰ کے علم کا چوتھا ماخذ روح القدس کا فیض ہے۔اس کی وضاحت یوں ہے کہ قرآن مجید میں بطور مکرر"روح القدس" کی مدد اور تائید کی بات ہوئی ہے ان میں سے تین مقامات پر حضرت عیسیٰؑ[3] کے بارے میں، اور ایک مقام پر حضرت رسول اکرمؐ[4] کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔

یہ"روح القدس" کون ہیں؟ یا کیا چیز ہے؟اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے کچھ مفسرین نے اس سے جبرائیلؑ مراد لیے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے وہ مقدس اور پاکیزہ روح مراد لی ہے جو ان کے اندر موجود تھی۔یا ان پر نازل

---

[1] جامع الاحادیث جلد۱،صفحہ ۱۷ کے بعد حدیث ۷ (اس بارے میں مذکورہ کتاب میں اور بھی حدیثیں موجود ہیں)
[2] اصول کافی، جلد۱،ص ۲۷۱
[3] بقرہ،۸۷اور۲۵۳، اور مائدہ۔۱۱۰
[4] بقرہ،۱۱۰

ہونے والی کتاب انجیل مراد لی گئی ہے۔بعض کے بقول یہ اللہ کا اسم اعظم ہے جس کے ذریعے حضرت عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔[۱]

لیکن قرآن مجید کے الفاظ اور مختلف اسلامی روایات سے یوں استفادہ ہوتا ہے کہ روح القدس کے کئی معانی ہیں اور ممکن ہے کہ ہر مقام پر خاص معنی میں استعمال ہوا ہو۔قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (نحل/ ۱۰۲)

کہہ دیں کہ اسے روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔

یہاں پر ظاہراً جبرائیل کے معنی میں آیا ہے۔جس نے قرآن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اکرم ﷺ پر نازل کیا۔لیکن دیگر تین مقامات پر جو سب حضرت عیسیٰ کے متعلق ہیں دیگر معنوں میں استعمال ہوتا نظر آتا ہے، کیونکہ ''اِذْ اَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ یا وَ ايَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ'' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس سے مراد ایک روح ہے جو ہمیشہ حضرت عیسیٰ کے ساتھ رہتی تھی اور انہیں مدد اور قوت بہم پہنچاتی تھی۔

اہل بیتؑ سے منقولہ روایات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ روح القدس ایک مقدس روح تھی جو تمام انبیاء ورسل اور معصومین کے ہمراہ تھی اور مختلف مواقع پر ان کو الٰہی امداد بہم پہنچاتی تھی۔اسی طرح اہل سنت کی کتب میں بھی بہت ساری احادیث موجود ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ جب کبھی کسی سے کوئی بڑا کام انجام پاتا، یا پُر مغز بات یا بہترین شعر صادر ہوتا تو آپؐ فرماتے تھے کہ'' یہ روح القدس کی مدد سے ہوا ہے''

ان میں سے ایک حدیث تفسیر الدالمنثور میں مذکور ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مشہور اسلامی شاعر حسان بن ثابت کے متعلق فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اَيِّدْ حَسّاناً بِرُوحِ الْقُدُسِ كَما نافَحَ عَنْ نَبِيِّهِ.

اے اللہ! حسان کی روح القدس کے ذریعے مدد فرما جس طرح اُس نے اپنے نبی کا دفاع کیا ہے۔[۲]

اہل بیت ÷ کے مشہور شاعر کمیت بن زید اسدی کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام باقر -نے اس سے فرمایا: تمہارے لیے وہی دُعا ہے جو رسول خدا ﷺ نے حسان بن ثابت کے بارے میں مانگی تھی:

---

[۱] یہ چار معانی تفسیر کنز الدقائق جلد ۲ صفحہ ۸۷ پر ذکر ہوئے ہیں لیکن بعض مشہور تفاسیر میں صرف پہلا معنی ذکر ہوا ہے، فخر رازی کی تفسری میں تین معانی بیان ہوئے ہیں، جبرئیل انجیل اور اسم اعظم (تفسیر فخر رازی ج ۳، ص ۱۷۷)

[۲] الدالمنثور، جلد ۱ ص ۸۷ (سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ کی تفسیر میں) صحیح مسلم ج ۴، ص ۱۰، اور ۳۲ ''باب فضائل حسان بن ثابت'' میں بھی اسی مضمون کی دو روایتیں نقل ہوئی ہیں۔

لَنْ يَزَالَ مَعَكَ رُوحُ الْقُدُسِ مَا ذَبَبْتَ عَنَّا [1]

ترجمہ: ہمیشہ روح القدس تمہارے ساتھ ہوگی جب تک تم ہمارا دفاع کرتے رہوگے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جب معزز شاعر دعبل خزاعی نے اپنے مشہور قصیدے ''مدارس آیات'' کے چند اشعار پڑھے تو امام علی بن موسیٰ الرضا نے شدید گریہ کیا اور پھر فرمایا:

''نَطَقَ رُوحُ الْقُدُسِ عَلٰى لِسانِكَ بِهٰذَيْنِ الْبَيْتَيْنِ

یہ دو شعر روح القدس نے تیری زبان پر جاری کیے ہیں۔[2]

اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ''روح القدس'' ایک مدد کرنے والی روح ہے جو معنوی اور الٰہی کاموں کو انجام دینے میں انسان کی مددگار رہوتی ہے۔ البتہ افراد کے درجات کے اعتبار سے یہ مختلف ہوتی ہے۔ نبیوں اور اماموں کے حوالے سے غیر معمولی طور پر مضبوط اور واضح عمل کرتی ہے اور دوسرے افراد کے حوالے سے اپنے لحاظ سے، اگر چہ اس کی ماہیت اور جزئیات کے متعلق زیادہ معلومات پاس نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں امام صادق - نے ''وَ السّابِقُونَ السّابِقُونَ أُولئِكَ المُقَرَّبُونَ'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَالسَّابِقُونَ هُمْ رُسُلُ اللهِ و خَاصَّةِ اللهِ مِنْ خَلْقِهِ جَعَلَ فِيهِمْ خَمْسَةُ اَرْوَاحٍ، اَيَّدَهُمْ بِرُوحِ الْقُدُسِ فيه عَرَفُوا الاشياء...

سبقت لے جانے والے، اللہ کے رسول (علیہم السلام) ہیں اور اس کی مخلوقات میں سے خاص افراد ہیں ان میں اس نے پانچ روحیں قرار دی ہیں (ان میں سے ایک) روح القدس کے ذریعے اُس نے ان کی مدد اور حمایت کی ہے، اس کے ذریعے وہ اشیاء کو پہچانتے ہیں۔[3]

اس سلسلے میں ایک اور حدیث امام باقر - سے منقول ہے انہوں نے انبیاء اور اوصیاء میں موجود پانچ روحوں کو شمار کرتے ہوئے

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۶۹۵۴

[2] کشف الغمہ، جلد ۳، صفحہ ۱۸۸، اعلام الوری، صفحہ ۳۳۱، کے مطابق وہ دو شعر یہ ہیں

خروج الامام لامحالة خارج
بقوم على اسم الله والبركات
يميز فينا كل حق وباطل
ويجزى على النعماء والنقمات

[3] اصول کافی، جلد ۱، ص ۲۷۱

فرمایا: ''فبِرُوح القُدُسِ ....عَرَفُوا ما تَحْتَ العَرْشِ إلى ما تَحْتَ الثَّرىٰ. یعنی: ''روح القدس کے ذریعے زمین کی تہوں سے لے کر عرش کے درمیان جو بھی چیزیں ہیں انہیں وہ پہچان لیتے ہیں۔'' [1]

اس بارے میں بہت زیادہ احادیث اصول کافی اور دیگر کتب میں موجود ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہیں۔پس روح القدس کے ذریعے الٰہی امدایں، آئمہ معصومین کے علم کا ایک اور ماخذ اور منبع ہے۔

۵۔نورالٰہی

آئمہ طاہرین ÷ کے علم کے ماخذ کے طور پر پانچویں چیز جو ذکر کی جاسکتی ہے یہ وہی ہے جو اصول کافی کی متعدد احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ان میں ایک روایت میں حسن بن راشد بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام صادق -کو فرماتے ہوئے سنا: ''فَاذِا مَضىٰ الِامامُ الّذِى كانَ قَبْلَهُ رُفِعَ لِهَذا مَنارٌمِنْ نُورٍ يَنْظُرُ بِهِ إلىٰ اَعْمالِ الخَلائِقِ فَبِهٰذا يَحْتَجُّ اللهُ عَلىٰ خَلْقِهِ.'' یعنی: ''جب ایک امام رحلت فرماتا ہے تو اس کے بعد والے امام کے لیے اللہ سبحانہ نور کا ایک مینار کھڑا کرتا ہے اس کے وسیلے سے امام لوگوں کے اعمال دیکھتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر اپنی حجت تمام کرتا ہے۔'' [2]

بعض روایات میں ''عَمُودٌ مِنْ نورٍ '' (نور کا ستون) کے الفاظ بھی ذکر ہوئے ہیں۔ [3] لیکن زیادہ تر ''مَنَارٌ مِنْ نورٍ '' کے الفاظ آئے ہیں، البتہ ان دو الفاظ میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔اس سلسلے میں مزید آگاہی کے لیے بحارالانوار کی جلد ۶ رصفحہ ۱۳۲ کا مطالعہ کریں، علامہ مجلسی مرحوم نے اس حوالے سے ۱۶ حدیثیں نقل کی ہیں اور اسی طرح ''عرض اعمال'' کے باب میں متعدد روایات مذکور ہیں۔

اس تمام گفتگو سے مجموعی طور پر جو چیز واضح طور پر ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آئمہ معصومین -کے علم کے ماخذ اور سرچشمے مختلف اور گوناگون قسم کے ہیں پہلے نمبر پر ان کی علم وآگاہی کا محور و مرکز قرآن مجید ہے۔دوسرے نمبر پر وہ علوم ہیں جو ان تک رسول اللہ ﷺ کے ذریعے پہنچتے ہیں، تیسرے نمبر پر الٰہی امدادیں۔قلبی الہامات اور عالم غیب اور فرشتوں سے رابطہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ تمام پہلو اور جہات امام معصوم کے علم و دانش میں بے پناہ اضافہ کرتی ہیں تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی عہدہ براہو سکے۔یہ ذمہ داری وہی اسلام قرآن اور سنت رسول ﷺ کی حفاظت، مخلوق کو خالق کی طرف ہدایت دینا، انسانون کی تربیت، حدود الٰہی کا نفاذ اور امور کی تدبیر اور نظم ونسق ہے۔

ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ شب جمعہ کو آئمہ ہدیٰ جدید اور تازہ علم و دانش (جدید مسائل

---

[1] اصول کافی، جلد ا، ص ۲۷۲

[2] اصول کافی، جلد ا، ص ۲۸۷، حدیث ۲

[3] اصول کافی، جلد ا، ص ۲۸۷ حدیث ۴۔

کے لیے) اللہ تعالی کی طرف سے دریافت کرتے ہیں (تاکہ اپنے آپ کو اسلامی امت کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مکمل آمادہ کر سکیں) ان میں سے ایک حدیث میں امام صادق - نے فرمایا:

اِنَّ لَنَا فِی کُلِّ لَیلَةِ جُمُعَةٍ سُروراً۔

ہمارے لیے ہر جمعہ کی رات کو نیا سرور اور خوشی ہوتی ہے۔

روای کہتا ہے میں نے پوچھا:

زادكَ الله وما ذاك

اللہ تعالیٰ آپ کے سرور میں اضافہ فرمائے وہ سرور کیا ہے؟

انہوں نے فرمایا:

اِذَا کَان لَیلَۃُ الجُمُعَۃِ وافِی رَسُولُ اللہِ العَرْشَ وَ وافَی الاَئِمَّۃُ مَعَہُ و مَعَھُمْ فَلاَ تُرَدُّ اَرْواحُنا اِلَی اَبدانِنَا اِلَّا بِعِلْمٍ مُسْتَفادٍ ولَوْلَا ذٰلِكَ لَاَنْفَدْنا۔

جب جمعہ کی رات ہوتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کی مقدس روح) عرش (الٰہی) پر جاتے ہیں اور ائمہ کی ارواح بھی ان کے ہمراہ ہوتی ہیں اور میری روح بھی ان کے ساتھ وہاں جاتی ہے، پھر ہماری روحیں بدن میں واپس نہیں آتیں مگر جدید اور نئے علم و دانش کے ساتھ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارا علم ختم ہو جاتا۔[1]

اسی باب میں اس کے متعلق اور بھی کافی روایات منقول ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس فصل میں جو کچھ بیان ہوا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آئمہ کے علم کے ماخذ کا معاملہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، ان بزرگ ہستیوں کی ودسترس میں علم کے ایسے ماخذ ہیں جو انہیں دوسروں سے ممتاز کر دیتے ہیں اور اسلام اور قرآن کی تعلیمات کی حفاظت اور انسانوں کی ہدایت کی جو اہم ذمہ داری ان پر ہے، اس کی انجام دہی میں یہ علمی ماخذ ان کی مدد کرتے ہیں۔

[1] اصول کافی، جلد ۱، ص ۲۵۴ (باب فی ان الائمۃ یزدادون فی لیلۃ الجمعۃ)

اماموں کی عصمت

اشارہ

آئمہ ہدیٰ کی عام شرائط میں سے ایک اور شرط ان کا خطا، بھول چوک اور گناہ سے پاک ہونا ہے، وہ تمام دلائل جو انبیاء الٰہی کی عصمت پر دلالت کرتے ہیں درحقیقت وہی دلائل آئمہ کی عصمت پر بھی دلالت کرتے ہیں کیونکہ دونوں کی ذمہ داریوں میں بہت حد تک مماثلث اور شباہت پائی جاتی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شریعت کے بانی ہیں اور عالم وحی سے ان کا رابطہ ہے اور آئمہ اس شریعت کے محافظ ہیں، اگرچہ ان پر کسی قسم کی وحی نازل نہیں ہوتی لیکن لوگوں کی ہدایت کرنے میں، اللہ تعالیٰ کے احکام اور حدود کی حفاظت کرنے میں اور قرآنی آیات کی ترویج و اشاعت میں یہ رسول اللہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اسی وجہ سے بہت ساری صفات میں یہ ان کے ساتھ شریک ہیں اور ان سے مشابہہ ہیں۔ بنابریں، وہ تمام اہم ترین دلائل جو عصمت انبیاء کے باب میں ہم نے بیان کیے ہیں وہ سب آئمہ ہدیٰ کی عصمت کو بھی ثابت کرتے ہیں۔

اس اشارے کے بعد ہم قرآن کریم کی آیات کا جائزہ لیتے ہیں:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

(احزاب/۳۳)

اللہ کا ارادہ بس یہی ہے کہ ہر طرح کی ناپاکی اور پلیدی کو آپ! اہل بیت سے دور رکھے اور آپ کو ہر لحاظ سے پاکیزہ رکھے۔"

امامت وولایت کے مقام ومرتبہ کی عظمت کے بارے میں گزشتہ بحث میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعے میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس عظیم پیغمبر کو بہت سارے امتحانات میں ڈالا اور جب وہ ان تمام امتحانات میں کامیاب اور سرخرو ہوئے تو اللہ سبحانہ نے فرمایا:

"اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَاماً"

میں نے تمہیں لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیا ہے۔

(امامت کا مطلب، لوگوں کے جسم اور روح پر اور انسانوں کی تربیت کے لیے انسانی معاشروں پر حکومت ہے)

جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بعض اولاد اور فرزندوں کے لیے اس منصب کو مانگا تو اللہ کی طرف سے مشروط اجابت کی گئی،

ارشادرب العزت ہوا: لا ینال عَهدِی الظّالمین۔ یعنی: ''میرا عہد و پیان (عہد امامت) ظالموں کو شامل نہیں ہوگا۔'' (تیری اولاد میں سے صرف تیرے وہ فرزند اس عہدے کے لائق ہوں گے جو پاک اور معصوم ہوں گے) وہاں پر واضح ہو گیا تھا کہ آیت کا یہ جملہ کس طرح اماموں اور الٰہی پیشواؤں کی عصمت پر دلالت کرتا ہے۔ جو افراد ساری عمر عقائد کے اعتبار سے شرک اور کفر کے راستے پر چلتے رہے یا اپنے اعمال کے لحاظ سے اپنے آپ پر یا دوسروں پر ظلم و ستم کرتے رہے وہ اس مقام و منصب کے ہرگز لائق نہیں ہیں کیونکہ ظلم اپنے وسیع معنوں میں ظلم، شرک، کفر اور نظریاتی انحراف کو بھی شامل ہے اور دوسروں پر ہر قسم کے ظلم و تعدی اور گناہوں کے ذریعے اپنے پر ظلم کو بھی شامل ہے۔

چونکہ وہاں پر یہ گفتگو بڑی تفصیل اور تشریح کے ساتھ ہو گئی تھی اس لیے اب اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بنابراین اماموں اور الٰہی پیشواؤں کے معصوم ہونے کی اصلی شرط کی بنیاد اسی آیت میں رکھی گئی ہے۔ اب دوبارہ آیت تطہیر کی طرف لوٹتے ہیں اور عصمت کے مسئلہ پر اس آیت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں:

یہ بات درست ہے کہ یہ آیت ان آیات کے سیاق و سباق میں موجود ہے جو ازواج رسول ﷺ سے متعلق ہیں لیکن اس سیاق و سباق کے باوجود اس کا لہجہ اور انداز جداگانہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اس آیت کا مقصد کچھ اور ہے، کیونکہ اس سے پہلے والی اور بعد والی تمام آیات میں جمع مونث کی ضمیریں ہیں لیکن زیر بحث آیت میں جمع مذکر کی ضمیر آئی ہے۔ ان آیات کی ابتداء میں ازواج رسول ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے اور انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں مقیم رہیں اور دور جاہلیت کے رسم و رواج کی طرح لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہوں، پاک دامنی کے اصولوں پر کاربند رہیں، نماز قیام کریں، زکوۃ ادا کریں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں: (وَ قَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَ لاتَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الجاهِلِيَّةِ الأُولى وَ اَقِمْنَ الصَّلوةَ وَ آتينَ الزّكاةَ وَ اَطِعْنَ اللهَ وَ رَسُولَهُ)

اس حصے میں استعمال ہونے والی تمام کی چھ کی چھ ضمیریں جمع مونث کی صورت میں ہیں (غور کیجیے گا) اس کے بعد آیت کا لہجہ بدل جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: اللہ تعالیٰ صرف یہ چاہتا ہے رجس اور گناہ کو آپ اہل بیتؑ سے دور کرے اور تمہیں مکمل طور پر پاک کر دے: (اِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا) آیت کے اس حصے میں جمع کی دو ضمیریں استعمال ہوئی ہیں اور دونوں جمع مذکر کی ہیں، عام طور پر ایک آیت کا ابتدائی اور آخری حصہ ایک ہی مطلب کو بیان کرتا ہے لیکن یہ بات وہاں پر درست ہے یہاں اس کے برخلاف کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔

لہٰذا جن افراد نے آیت کے اس حصے کو رسول خدا ﷺ کی ازواج کے متعلق سمجھا ہے انہوں نے ظاہر آیت اور اس میں موجود قرینے ضمیروں کا فرق کے خلاف بات کہی ہے۔ اس سے ہٹ کر اس آیت کے حوالے سے متعدد روایات موجود ہیں جنہیں اسلام کے بڑے بڑے علما، اعم از شیعہ اور سنی نے خود رسول اکرم ﷺ سے بیان کی ہیں اور دونوں فریقوں کی مشہور اور ان کے ہاں معتبر کتب میں مذکورہ ہیں۔ یہ روایات فراوان اور بکثرت ہیں؛ یہ سب روایات یہ بتاتی ہیں کہ آیت کا یہ حصہ پیغمبر اکرم ﷺ، علیؑ، فاطمہ ×، حسن- اور حسین -سے متعلق ہے (نہ کہ ازواج رسول ﷺ) اس کی تفصیل بعد میں بیان ہوگی۔ لیکن روایات کی بحث میں داخل ہونے سے

پہلے ضروری ہے کہ آیت کے الفاظ کی تشریح بیان کی جائے:

''اِنّما '' کا لفظ عام طور پر حصر کے لیے آتا ہے اور اردو میں اس کی جگہ پر فقط یا صرف کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اس آیت میں مذکورہ لطف وعنایت اہل بیت کے ساتھ مختص ہے اور دوسروں کو شامل نہیں ہے۔

''یرید'' (اللہ کا ارادہ ہے یا وہ چاہتا ہے) یہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی ارادے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ نے اپنے ایک تکوینی امر سے ارادہ کیا ہے کہ تمہیں ہر قسم کی پلیدی اور آلودگی سے پاک وصاف رکھے۔ اس سے ارادہ تشریعی مراد نہیں ہے کیونکہ ارادہ تشریعی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی پاکیزگی کی حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ حکم فقط اہل بیت کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تو سب مسلمانوں کا فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھیں۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ ارادہ تکوینی تو ایک قسم کا جبر ہے اور جبر کی صورت میں معصوم ہونا تو باعث فضلیت اور افتخار نہیں ہوگا۔

اس بات کا جواب ہم ساتویں جلد میں انبیاء کی عصمت کے باب میں تفصیلی طور پر دے چکے ہیں، یہاں پر مختصر طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ معصوم افراد میں دو قسم کی قابلیت اور لیاقت ہوتی ہے ایک ذاتی اور عطا شدہ قابلیت، اور دوسری اکتسابی قابلیت جو اپنے اعمال اور اندرونی ملکات کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ ان دونوں کے مجموعے سے، جن میں ایک یقینا اختیاری پہلو رکھتی ہے، یہ بلند مقام حاصل ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں، ارادہ الٰہی اور عنایت خداوندی اس عظیم مقام تک پہنچنے کے لیے توفیقات کے حصول میں زمین ہموار کر دیتا ہے اور اس توفیق سے فائدہ اٹھانا ان کے اپنے ارادے سے مربوط ہے۔ (غور کیجیے گا)

ان کے لیے گناہوں کو ترک کرنا محال عادی ہے نہ کہ محال عقلی، مثال کے طور پر محال عادی یہ ہے کہ ایک باایمان اور عالم شخص مسجد میں اپنے ساتھ شراب لے جائے اور نماز جماعت کی صف میں اُسے پینا شروع کر دے، یہ عام طور پر محال ہے لیکن مسلم ہے کہ یہ عقلی طور پر محال نہیں ہے اور اس کے اختیاری ہونے کے منافی نہیں ہے، یا ایک اور مثال میں ایک عقل مند انسان کبھی بھی بالکل برہنہ ہو کر گلی یا سڑکوں پر نہیں آتا، ایسا کرنا اس کے لیے ناممکن نہیں ہے لیکن اس کی سطح فکری، اس کا علم و دانش اُسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس قسم کا کام انجام دے باوجود اس کے کہ اس کا انجام دینا اور ترک کرنا اس کے اختیار میں ہے۔

انبیاء اور آئمہ کے لیے گناہوں کو انجام دینا بھی اسی طرح کا ہے، یہ بات درست ہے کہ ان کا معصوم ہونا اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید سے ہے لیکن یہ الٰہی مدد اور تائید اندھا دھند اور بغیر حساب وکتاب کے نہیں ہے، جس طرح قرآن حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بارے میں فرماتا ہے کہ جب تک اللہ کی طرف سے امتحانوں میں کامیاب نہیں ہوئے انہیں امامت کا بلند مرتبہ ومقام اور مخلوقات کے پیشوا ہونے کا عہدہ نہیں ملا۔ (بقرہ، ۱۲۴)[1]

اور جہاں تک ''رجس'' کے کلمے کا تعلق ہے تو اس کلمے کا لغوی معنی ناپاک چیز ہے خواہ انسانی مزاج کے لحاظ سے آلودہ اور

---

[1] معصومین کی عصمت ان کے اعمال کے اختیاری ہونے سے منافی نہیں ہے، اس بارے میں مزید مطالعہ کیلئے پیام قرآن کی ساتویں جلد، صفحہ ۱۹۳ کے بعد صفحات کو دیکھیں۔

ناپسند ہو یا عقلی اور شرعی حکم کے اعتبار سے ہو، یا ان سب کے لحاظ سے، اسی وجہ سے ''مفردات'' میں راغب رجس کا معنی ''شئی قَذِر'' گندی چیز کرنے کے بعد اس کے لیے چار صورتیں ذکر کرتے ہیں (وہی چار صورتیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں، یعنی گندی انسان کے مزاج کے لحاظ سے، عقلی لحاظ سے، شرعی یا ان سب کے اعتبار سے) اگر بزرگوں کی بعض عبارتوں میں رجس کا معنی، گناہ یا شرک یا باطل عقیدے یا بخل وحسد کیا گیا ہے تو یہ درحقیقت اس کے وسیع معنی کے مختلف مصادیق کو بیان کیا گیا ہے۔

بہرحال لفظ الرجس پر جو الف لام داخل ہے یہ جنس کے لیے ہے اور یہاں پر اس کے عام معنی پر دلالت کر رہی ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ ہر قسم اور ہر طرح کی گندگی اور آلودگی سے انہیں پاک و پاکیزہ رکھے۔

''تطہیر'' کا معنی پاک کرنا ہے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ''**وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا**'' کا جملہ سابقہ جملے میں مذکورہ رجس اور ہر قسم کی پلیدی کی نفی پر تاکید مزید ہے، اور تطہیراً کا لفظ جو کہ نحوی اصطلاح میں مفعول مطلق ہے یہ مذکورہ معنی پر ایک اور تاکید ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی تاکیدات کے ساتھ ارادہ فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اہل بیتؑ کو ہر قسم کی پلیدی، گندگی سے پاک اور مبرا بنا دے۔ مسلم ہے کہ یہ ارادہ پہلے نمبر پر یہ خود پیغمبر اکرم ﷺ کو شامل ہے جو کہ اس گھر کے اصلی اور بنیادی فرد ہیں، ان کے بعد باقی گھر کے افراد کو شامل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے باقی اہل بیت ؑ کون ہیں؟

اہل بیت سے مراد کون ہیں؟

اہل سنت کے کچھ مفسرین نے اہل بیتؑ کا معنی پیغمبر اکرم ﷺ کی بیویاں، بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ آیت کے سیاق و سباق میں موجود جمع مونث کی ضمیروں کا جمع مذکر میں تبدیل ہونا اور خود آیت کا اپنا طرز بیان ظاہر کرتا ہے کہ اس جملے کا مطلب پہلے اور بعد والے جملوں سے علیحدہ ہے اور یہ جملہ کسی اور مقصد کو بیان کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور قرآن فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ مرتبے پر ہے اور اس کے تمام الفاظ نپے تلے اور حکمت و مقصد کے عین مطابق ہیں۔

چند دیگر مفسرین نے اسے رسول خدا ﷺ، علی، فاطمہ، حسن، حسین ؑ سے مخصوص سمجھا ہے۔ اہل سنت اور شیعہ کتب میں بہت ساری روایات اس مطلب پر گواہی دے رہی ہیں، ان میں چند روایات کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔ شاید انہی روایات کی وجہ سے وہ افراد بھی جو اس جملے کو پنجتن پاک سے مخصوص نہیں سمجھتے، اس کے وسیع معنی کے قائل ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ جملہ ان ہستیوں کو بھی شامل ہے اور ازواج رسول ﷺ کو بھی شامل ہے اور یہ اس آیت کی تیسری تفسیر ہے۔

رہی بات ان روایات کی جو آیت کے پیغمبر اکرم ﷺ، علی مرتضیٰ ؑ، فاطمہ زہراؑ اور ان کے دو بیٹے حسن مجتبیٰ ؑ اور حسین ؑ کے ساتھ مختص ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے اٹھارہ روایات تو صرف تفسیر ''الدر لمنثور'' میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے پانچ حضرت امّ سلمہ سے، تین حضرت ابوسعید خدری، ایک حضرت عائشہ سے ایک روایت حضرت انس سے دو حضرت ابن عباس سے، دو روایتیں ابی الحمراء سے، ایک وائلہ بن اسقع سے ایک روایت سعد سے اور ایک ایک روایت ضحاک بن مزاحم اور زید بن ارقم

سے بیان ہوئی ہے۔[1]

علامہ طباطبائی مرحوم نے اپنی تفسیر ''المیزان'' میں اس بارے میں منقولہ روایات کی تعداد ستر سے زیادہ بیان کی ہے، اور انہوں نے کہا ہے کہ اس کے متعلق اہل سنت کے ذرائع سے نقل ہونے والی روایات شیعہ ذرائع سے منقولہ روایات سے کہیں زیادہ ہیں، انہوں نے مذکورہ بالا راویوں کے علاوہ دیگر راویوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔ (یعنی الدالمنثور میں مذکورہ راویوں کے علاوہ) بعض افراد کے بقول ان روایات اور ان کتابوں کی تعداد جن میں یہ روایات نقل ہوئی ہیں ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے، اور بعید بھی نہیں ہے کہ ایسا ہو۔ یہاں پر ہم چند روایات کا ان کی کتب کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ واحدی کا ''اسباب النزول'' میں درج ذیل بیان ایک حقیقت ہے:

ان الآیة نزلت فی النبی و علی و فاطمة و الحسنین (علیهم السلام) خاصة لایشارکهم فیها غیرهم۔

یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ، علی، فاطمہ، اور حسنین ؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں ہے۔[2]

ان احادیث کو چار قسموں میں بطور خلاصہ بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ وہ احادیث جو رسول خدا ﷺ کی بعض زوجات سے منقول ہیں اور واضح طور پر بتاتی ہیں جب پیغمبر اکرم ﷺ اس آیت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے تو ہم نے پوچھا: کیا ہم بھی اس میں شامل ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: تم اچھی اور نیک ہو مگر اس آیت میں شامل نہیں ہو!

اسی حوالے سے ثعلبی نے ام المومنین حضرت سلمہ سے حدیث بیان کی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اپنے گھر میں تھے۔ اتنے میں حضرت فاطمہ ؑ آنحضرتؐ کے لیے کھانا لے کر آئیں۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں حسنؑ اور حسینؑ کو بلائیں'' وہ سب آ گئے تو سب نے کھانا کھایا اس کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی عبا ان پر ڈال دی اور فرمایا:

اَللّٰهُمَّ هٰؤُلاءِ اَهْلُ بَيْتِي وَ عِتْرَتِي فَاَذْهَبْ عَنْهُمُ الرِّجسَ وطَهِّرهُمْ تَطْهِيْراً

اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت اور میری عترت، ان سے ہر قسم کی ناپاکی کو دُور فرما اور انہیں ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ فرما۔''

اس موقعہ پر یہ آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللہ ... نازل ہوئی۔۔۔ اس کے بعد میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا میں آپ سب

---

[1] الدالمنثور، جلد ۵، صفحہ ۱۹۶، اور ۱۹۹ ملاحظہ فرمایئے!

[2] المیزان، جلد ۱۶، صفحہ ۳۱۱۔

کے ساتھ شامل ہوں؟! آنحضرتؐ نے فرمایا: انك الیٰ خیر، تم نیکی پر ہو (لیکن ان افراد میں شامل نہیں ہو)[1]

ثعلبی چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی ہجری کے شروع کے اہل سنت کے بڑے مشہور عالم ہیں ان کی تفسیر کبیر بڑی معروف ہے انہوں نے زوجہ رسول ﷺ حضرت عائشہ سے یوں نقل کیا ہے کہ جب ان سے جنگ جمل کے بارے اور اُس تباہ کن جنگ میں ان کی شرکت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: یہ تقدیر کا لکھا ہوا تھا! اور جب ان سے علیؑ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے یہ کہا:

تَسْأَلُنِی عَنْ اَحَبِّ النَّاسِ کَانَ اِلیٰ رَسُولُ اللهِ وَ زَوْجِ اَحَبِّ النَّاسِ کَانَ اِلیٰ رَسُول اللهِ لَقَدْ رَأَیْتُ عَلِیًّا وَ فَاطِمَةَ وَ حَسَناً و حُسَیْناً وَ جَمَعَ رَسُولُ اللهِ بِثَوْبٍ عَلَیْهِمْ ثُمَّ قَالَ: اللّٰهُمَّ هٰؤُلاءِ اَهْلُ بَیْتِی و حامَتی فَاَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَ طَهِّرْهُمْ تَطْهِیْراً. قَالَتْ فَقُلْتُ: یارَسُول اللهِ اَنَا مِنْ اَهْلِكَ قَالَ تَنَحّی فَاِنَّكَ اِلیٰ خَیْرٍ

کیا تم مجھ سے رسول اللہ ﷺ کی محبوب ترین ہستی کے بارے میں پوچھتے ہو، کیا تم اس کے متعلق سوال کرتے ہو جو رسول خدا ﷺ کی محبوب ترین ہستی کا شوہر تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین (÷) کو کپڑے کے نیچے جمع کیا ہوا تھا اور فرمایا: اے اللہ! یہ میرے اہل بیتؑ اور رشتہ دار ہیں، رجس اور پلیدی کو ان سے دور کردے، اور ہر ہر قسم کی گندگی اور آلودگی سے انہیں پاک کردے۔ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! کیا میں بھی ان میں شامل ہوں، آپؐ نے فرمایا: ہٹ جا تم نیکی اور خیر پر ہو (لیکن ان افراد میں شامل نہیں ہو)۔[2]

اس طرح کی احادیث واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ اس آیت میں ازواج رسول ﷺ، اہل بیت میں شامل نہیں ہیں۔

۲۔ حدیث کساء کا واقعہ روایات میں غیر معمولی کثرت کے ساتھ اور مختلف الفاظ کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ کو بلایا (یا آپؐ ان کے پاس تشریف لائے) اور ان پر اپنی عبا یا کوئی اور کپڑا اڈال دیا اور فرمایا: اے اللہ! یہ میرے گھر والے ہیں ان سے رجس اور پلیدی کو دور کردے، اس موقعہ پر یہ آیت: 'اِنَّمَا یُرِیدُ اللهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ بیت' نازل ہوئی۔

نہایت قابل توجہ بات یہ ہے کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث خود حضرت عائشہ سے بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح حاکم نے اپنی کتاب

---

[1] طبرسی نے مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں اور حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۵۶ میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے۔

[2] مجمع البیان، اسی آیت کے ضمن میں۔

مستدرک میں بیہقی نے سنن میں ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور سیوطی نے الدر المنثور میں نقل کی ہے۔[۱] حاکم حسکانی نے بھی شواہد التنزیل میں اِسے ذکر کیا ہے۔[۲] صحیح ترمذی میں یہ حدیث دو بار نقل ہوئی ہے۔ ایک جگہ پر عمرو بن ابی سلمہ سے اور دوسری جگہ پر حضرت اُمّ سلمہ سے۔[۳]

ایک نکتہ یہ ہے کہ فخر رازی سے آیت مباہلہ (آل عمران، آیت ۶۱) کی تفسیر میں کسی مناسبت سے حدیث کساء کو نقل کرنے کے بعد مزید لکھا ہے: "وَ اعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الرواية كَالْمتفَقِ عَلٰى صِحَّتِها بَيْنَ اَهْلَ التَّفْسِيرِ و الحَدِيثِ۔" یعنی: جان لو کہ یہ روایت اس روایت کی طرح ہے جس کے صحیح ہونے پر مفسرین اور محدثین کا اتفاق ہے۔ یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ امام احمد حنبل نے اپنی مسند میں اس حدیث کو مختلف طرق سے نقل کیا ہے۔[۴]

۳۔ روایات کی ایک اور قسم میں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہم پڑھتے ہیں کہ آیت تطہیر کے نزول کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کئی ماہ (بعض میں چھ مہینے بعض میں ہے کہ آٹھ یا نو مہینے) تک نماز صبح پر جاتے ہوئے جب فاطمہ زہرا کے گھر کے پاس سے گزرتے تو بلند آواز سے فرماتے:

الصّلٰوة! يا اَهْلَ الْبَيْت! اِنَّما يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ و يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔

اے اہل بیت! نماز کا وقت ہے! اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ وہ تم اہل بیت کو ہر قسم کے رجس سے دور کردے، اور تمہیں ہر طرح سے پاکیزہ بنادے۔

یہ حدیث مشہور مفسر حاکم حسکانی کی کتاب شواہد التنزیل میں حضرت انس بن مالک سے نقل ہوئی ہے۔[۵] اسی کتاب میں ایک اور حدیث "سات مہینوں" کے عنوان سے ابی الحمراء سے بیان ہوئی ہے۔ نیز مذکورہ کتاب میں ہی اسی واقعے کو آٹھ ماہ کے عنوان سے ابو سعید خدری سے نقل کیا گیا ہے۔[۶]

الفاظ کا یہ فرق فطری ہے کیونکہ ممکن ہے کہ انس نے چھ ماہ تک اس عمل کو دیکھا ہو، ابوسعید خدری نے آٹھ ماہ تک اور ابوالحمرء نے

---

[۱] صحیح مسلم، جلد ۴، صفحہ ۱۸۸۳، حدیث ۲۴۲۴ (باب فضائل اہل بیت النبیؐ)

[۲] شوہدا التنزیل، جلد ۲ صفحہ ۳۳، حدیث ۳۷۶۔

[۳] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۹۹، حدیث ۳۸۷۱ (باب فضل فاطمہ) مطبوعہ احیاء التراث۔

[۴] تفسیر فخر رازی، جلد ۸ صفحہ ۸۰

[۵] مسند احمد، جلد ۱۱، صفحہ ۳۳۰، جلد ۴، صفحہ ۱۰۷، اور جلد ۶، صفحہ ۲۹۲ (فضائل الخمسہ جلد ۱، صفحہ ۲۷۶۔۔۔ سے نقل کرتے ہوئے)

[۶] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۸ اور احقاق الحق، جلد ۲، صفحہ ۵۰۳ تا ۵۴۸۔

سات ماہ تک اور ابن عباس نے ۹ ماہ تک دیکھا ہو۔[۱] جس نے جو دیکھا اس نے وہی نقل کیا ہے جب کہ ان اقوال میں کوئی تضاد بھی موجود نہیں ہے، پیغمبر اکرم ﷺ کا اس عمل کو ایک لمبے عرصے تک جاری رکھنا اور اس آیت کی بار بار تلاوت کرنا ایک سوچا سمجھا طرز عمل تھا۔ آنحضرت نہایت صراحت اور بار بار تاکید کے ساتھ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اہل بیت سے مراد صرف اور صرف یہ گھر والے ہیں تا کہ مستقبل میں کسی کے لیے شک وشبہہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ آیت صرف اور صرف پنجتن پاک کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ان تمام تاکیدات، اور تکرار کے باوجود یہ مسئلہ بعض افراد کے لیے مبہم رہ گیا۔ واقعاً تعجب کی بات ہے۔ بالخصوص اس صورت میں جب صرف اس گھر کا دروازہ مسجد نبویؐ کی طرف کھلتا تھا، اور وہ رسول خداؐ اور علیؑ کا گھر تھا۔ (کیونکہ رسول خداؐ نے حکم دیا تھا کہ مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں سوائے ان دو گھروں کے)

واضح ہے کہ ایسی صورت میں نماز کے وقت کچھ افراد نے ہمیشہ اس مقام پر پیغمبر اکرم ﷺ کی بات سنی ہوگی اس کے باوجود بعض مفسرین اصرار کرتے ہیں کہ اس کا معنی وسیع ہے اور ازواج رسول بھی اس میں شامل ہیں کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے! جب کہ ہم دیکھتے ہیں اور تاریخ اس کی گواہ ہے کہ زوجہ رسول اکرم حضرت عائشہ اپنے فضائل کو بیان کرنے میں اور رسول خداؐ کے ساتھ اپنے تعلق کی جزئیات کو بیان کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتی تھیں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اس آیت میں شامل نہیں سمجھا بلکہ بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مجھے فرمایا تم ان میں شامل نہیں ہو۔

۴۔ صحابی رسولؐ جناب ابوسعید خدری سے آیت تطہیر کے حوالے سے منقولہ متعدد روایات میں وہ واضح طور پر کہتے ہیں:

نَزَلَتْ فِی خَمْسَةٍ فِی رَسُولِ اللہِ وَ عَلِیٍّ وَ فَاطِمَةَ وَ الحَسَنِ وَ الحُسَیْنِ علیہ السلام [۲]

یہ آیت پانچ ہستیوں یعنی رسول خدا، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ÷ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کے متعلق اور اس آیت کے پنجتن پاک یعنی رسول خدا، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے ساتھ مخصوص ہونے کے بارے میں روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ انہیں متواترہ روایات کے ہم پلہ قرار دیا جائے اور اس اعتبار سے اس میں کوئی شک و شبہہ باقی نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ شرح احقاق الحق میں اس بات کو اہل سنت کی ستر سے زیادہ معتبر کتب سے نقل کیا گیا ہے۔ (یہ کتب مذہب اہل بیت کی کتب کے علاوہ ہیں) اس کے مصنف کہتے ہیں۔ اگر ہم ان سب مآخذ اور کتب کو شمار کریں تو ان کی تعداد ہزار سے بڑھ جائے۔[۳]

---

[۱] الدر المنثور، جلد ۵، صفحہ ۱۹۹

[۲] شواہد التنزیل مین اس کے متعلق چار حدیثیں آئی ہیں، ج ۲، از صفحہ ۲۴ تا ۲۷ (حدیث ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۴)

[۳] احقاق الحق کی جلد دوم سے اقتباس، صفحہ ۵۰۲ سے ۵۶۳ تک۔

چند سوالوں کے جواب

مذکورہ بالا آیت ائمہ اہل بیت کے لیے ایک بہت بڑی فضلیت شمار ہوتی ہے خصوصاً ان متواتر روایات کی روشنی میں جو اس آیت کی تفسیر میں مشہور و معروف اسلامی کتب میں آئی ہیں، اس اعتبار سے اس آیت کو ان کے راستے کی حقانیت پر دلیل قرار دیا جا سکتا ہے، اسی وجہ سے بعض اہل علم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور توقع کے عین مطابق اس پر اعتراضات کرنے لگے اگر چہ ان میں اعتراضات کم اور بہانہ بازی زیادہ نظر آتی ہے، اس کے برعکس دوسرے افراد نے نہایت جرأت مندی سے اس آیت اور روایات کو قبول کیا ہے اگر چہ اصولی لحاظ سے وہ اہل سنت کے طریقہ پر باقی رہے ہیں۔

ان افراد کے بعض اعتراضات یہاں بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ اہل بیت سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کے گھر میں رہنے والے ہیں کیونکہ بیت کا معنی وہ گھر ہے جس میں سکونت اختیار کی جاتی ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ کے گھر میں سکونت پذیر وہی آپ کی ازواج ہیں، لہٰذا دوسرا کوئی اس میں شامل نہیں ہے، اور اگر ضمیریں مذکر آئی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ''اہل'' مذکر ہے اور اگر ''بیت'' جمع کی بجائے مفرد صورت میں آیا ہے، حالانکہ زوجات النبیؐ متعدد مختلف گھروں میں رہتی تھیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ، ایک شخصیت ہیں لہٰذا ان کا گھر بھی واحد صورت میں ذکر ہوا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آیت صرف ازواج رسول ﷺ کی شان میں ہے۔

اس اعتراض یا بہانے کا جواب گزشتہ باتوں سے اچھی طرح واضح ہے۔ اور اس رائے کے دفاع میں تکلف کے اثرات صاف ظاہر ہیں، کیونکہ اگر لفظ ''اھل'' سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کی بیویاں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظاہری طور پر یہ لفظ ''مفرد مذکر'' ہے اور اس کا معنیٰ ''جمع مونث'' ہے۔ حالانکہ آیت میں نہ مفرد مذکر کا ذکر ہے اور نہ ہی جمع مونث ہے کا بلکہ ''جمع مذکر'' کی صورت میں مذکور ہے۔

اسی طرح ''بیت'' کا لفظ بھی مفرد ہے جب کہ اسی آیت کے شروع میں یہ لفظ جمع کی صورت میں ہے فرمایا: وَ قَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ۔'' لہٰذا لفظ بیت کا استعمال پیغمبر اکرم ﷺ کے لیے نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ کا کوئی الگ سے گھر نہ تھا آپ کا گھر وہی آپ کی بیویوں کے گھر تھے جہاں آپؐ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ بنا برایں، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم کہیں کہ یہاں پر بیت سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ سے رشتہ داری قرابت اور قربت والا گھر ہے نہ کہ رہائشی مکان اور یہ اصطلاح عام اور رائج ہے۔

ان چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بالفرض ہم ان اعتراضات کو مان لیتے ہیں، تو ان سب روایات کا کیا کریں گے؟ کیا روایات کی اس کثرت، وسعت اور صراحت کہ اہل بیت فقط پانچ افراد ہیں، سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے؟ کیا انہیں ہم ضعیف احادیث شمار کریں؟ اگر یہ احادیث متواتر اور قوی نہ ہوں تو پھر کوئی بھی حدیث متواتر اور صحیح نہیں ہے، اگر یہ روایات صریح اور واضح نہیں ہیں تو پھر کونسی روایات صریح اور واضح ہیں؟! اور حیران کن بات تو ''عکرمہ'' سے نقل ہوئی ہے اس نے کہا ہے:

مَنْ شَاءَ بَاهَلْتُهُ اَنَّهَا نَزَلَتْ فِي نِسَاءِ النَّبِيِ

میں اس بات پر کہ یہ آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کے بارے میں نازل ہوئی، جو شخص چاہے میں اس سے مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ [۱]

اِنَّ عَکْرَمَةَ کَان یُنَادِی فِی السُّوقِ اَنَّ قَولَهُ تعالیٰ اِنَّما یُرِیدُ اللهُ .... نَزَلَ فِی نساء النبِّی۔ [۲]

عکرمہ بازار میں صدا لگا کر کہتا تھا کہ آیت انما یرید اللہ۔۔۔ازواج النبی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

واقعاً حیرانی کی بات ہے، کیا علمی اور استدلالی مسائل کو مباہلے اور بازاروں میں صدائیں لگانے سے ثابت کیا جاتا ہے اور وہ بھی اس بات کو جس پر اتنے دلائل شواہد اور قرائن موجود ہوں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانچ افراد پر عبا ڈال کر ان کے اردگرد ایک دائرہ کھینچ دیتے ہیں تا کہ انہیں بالکل واضح کر دیا جائے اور انہیں ہی مخاطب قرار دیا جائے یہاں تک کہ اس دائرے میں حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہ کو بھی داخل نہیں ہونے دیتے اور چھ یا آٹھ یا نو ماہ تک مسلسل حضرت فاطمہؑ کے گھر کے سامنے اس جملے کا تکرار فرماتے ہیں کہ اس آیت سے مراد آپ (اہل بیت) ہیں اور آیت کے شروع میں لفظ انما جو کہ حصر پر دلالت کرتا ہے، انتہائی قابل توجہ ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیے بعد دیگرے کئی تاکیدوں کے ساتھ ہر قسم کے ابہام اور غلط فہمی کو دور کریں، لیکن عکرمہ اپنے مقصد کے لیے جسے وہ خود بہتر جانتے ہیں مباہلے سے آنحضرتؐ کے خلاف بات کو ثابت کرئے اور بازاروں میں آ کر اس کے خلاف آواز بلند کرئے۔

اصولی طور پر علمی گفتگو میں عکرمہ کا اس طرح جوش و خروش دکھانا اور مباہلہ کا اعلان کرنا شاذ و نادر ہے۔ اسی طرح علمی مسائل میں بازاروں میں آ کر آوازیں لگانے کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ خود ایک واضح دلیل ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور اس شور شرابے کے پیچھے کوئی اور مقصد پوشیدہ ہے کیا وہ اس امر پر مامور تھا کہ وقت کے حاکموں کے مفاد کے لیے اس عظیم اور الٰہی فضلیت کا انکار کرئے اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس ذلت و رسوائی کے ساتھ مقابلے کے لے اٹھ کھڑا ہو؟!

سوال:۲

اگر اہل بیت سے مراد صرف یہ پانچ مقدس نور ہیں تو پھر باقی اماموں کا کیا بنے گا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس وقت یہ پانچ ہستیاں موجود تھیں باقی امام بعد میں دنیا میں تشریف لائے ہیں اور یہ تمام صفات انہوں نے رسول خدا اور اپنے آباء سے وراثت میں پائی ہیں۔

---

[۱] تفسیر روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۲

[۲] تفسیر روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۳

سوال:۳۰

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے کہ "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا" میں جو ارادہ ہے وہ ارادہ تکوینی ہے نہ کہ تشریعی بالالفاظ دیگر مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ گناہوں کے قریب نہ جاؤ؛ کیونکہ یہ حکم خدا تو بلا استثناء تمام مسلمانوں کے لیے ہے اور اصحاب کساء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔اس بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مراد اللہ کا ارادہ تکوینی اور اس کی مشیت یہ ہے کہ انہیں پاک رکھے اور ہر قسم کے گناہ سے انہیں بچائے رکھے، شیطان اور ہوائے نفس اور برائی سے انہیں محفوظ رکھے اور ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہمیشہ پورا ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

یہ جو بعض لوگوں نے کہا ہے، کونسی چیز دنیا میں اللہ کے ارادے کے پورا ہونے میں رکاوٹ بن سکتی ہے مگر یہ کہ اللہ کا ارادہ کسی شرط سے مشروط ہو اور شرط پوری نہ ہو، معلوم ہے کہ آیت میں مذکورہ ارادہ مطلق ہے اور کسی شرط وقید سے مشروط نہیں ہے۔اور بعض افراد کا جو یہ کہنا ہے کہ اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالخصوص اہل بدر سب کے سب معصوم ہوں کیونکہ اللہ سبحانہ نے ان کے حق میں فرمایا ہے:

وَلٰکِنْ یُرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تشکرونَ

اللہ تعالیٰ تمہیں پاکیزہ بنانا چاہتا ہے اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کرنا چاہتا ہے۔تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو[1]

واقعاً یہ قابل افسوس ہے جب تعصب کی آگ بھڑکتی ہے تو اس کے شعلے سب چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور جلا کر راکھ کر دیتے ہیں جنگ بدر کے بارے میں بالکل اس طرح کی کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے، جنگ بدر کے حوالے سے جو ہے وہ یہ آیت ہے:

وَیُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَھِّرَکُمْ بِهٖ وَیُذْھِبَ عَنْکُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ

(انفال/۱۱)

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے تم پر پانی برسایا تاکہ تمہیں پاکیزہ کرے اور شیطان کی پلیدی کو تم سے دور کرے۔

واضح ہے کہ یہ آیت (بدر کے میدان میں) بارش کے برسنے اور پانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کے اس سے غسل اور وضو کرنے سے متعلق ہے اور اس کا ہماری بحث سے کسی قسم کا کوئی ربط نہیں ہے لیکن اس صاحب نے تعصب میں آکر آیت کے ابتدائی حصے کو حذف کرتے ہوئے صرف "لِیُطَھِّرَکُمْ" کے جملے کو ذکر کیا ہے اور اسے تمام اصحاب کی پاکیزگی اور قداست پر دلیل قرار دیا ہے۔

البتہ یہ آیت "وَلٰکِنْ یُرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ جنگ بدر کے مجاہدین کے

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج۲۲ص۱۷ (سورہ احزاب کی آیت ۳۳ کی تفسیر میں) تالیف: آلوسی

بارے میں نہیں بلکہ وضو، غسل، اور تیمم کی آیت کے ساتھ آئی ہے اور انتہائی واضح ہے کہ یہ آیت اس پاکیزگی کو بیان کررہی ہے جو ان تین طہارتوں سے حاصل ہوتی ہے نجانے کس طرح اتنے مشہور مفسر آیت کو بدر کے میدان میں لے گئے اور وہ چیز جس کا تعلق وضو، غسل اور تیمم سے ہے اُسے عصمت کی بحث میں لے آئے ہمیں اس کی سمجھ نہیں آئی۔

یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ آیت ان ہستیوں کی عصمت پر دلیل ہے تو پھر ''یُرِیدُ'' فعل مضارع کی صورت میں کیوں آیا ہے؟ اگر یہ افراد معصوم ہیں تو خدا کیوں فرماتا ہے ''اللہ یہ چاہتا ہے کہ ایسا ہو جائے۔'' کیا یہ تحصیل حاصل نہیں ہے؟ جو کہ ناممکن ہے کیوں یہ نہیں فرمایا گیا ''اَرَادَ الله''؟ ''اللہ نے چاہا کہ شروع سے ایسا ہو''[1]

یہ سوال کرنے والا اگر لفظ ''یُرِیدُ'' کا قرآن مجید کی آیات میں بغور مطالعہ کرتا تو وہ ہرگز اس قسم کی بات نہ کرتا؛ کیونکہ بہت ساری آیات قرآن میں یہ لفظ ایسے امور کے لیے استعمال ہوا ہے جن میں اللہ کا ارادہ استمراری طور پر یعنی ماضی۔ حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں جاری وساری ہے بالفاظ دیگر یہ جملہ زیادہ تر کسی چیز کے ارادے کے ماضی، حال اور مستقبل میں دوام اور استمرار کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے اس بات کی سچائی درج ذیل آیات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٨﴾ (آل عمران/ ۱۰۸)

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ/ ۱۸۵)

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (نساء/ ۲۸)

بہت واضح ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماضی میں ظلم کا ارادہ کیا ہے۔ اس سے پہلے تمہارے لیے مشکلات اور سختی چاہتا تھا یا یہ کہ اس سے قبل وہ تمہارے بوجھ کو سبک و ہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آج کے بعد اُس نے ایسا کیا ہے۔ بلکہ ان تمام آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہی ارادہ ماضی میں تھا، حال میں ہے اور مستقبل میں رہے گا۔ اسی طرح شیطان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿٦٠﴾ (نساء/ ۶۰)

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ (مائدہ/ ۹۱)

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿٥﴾ (قیامت/ ۵)

واضح ہے کہ ان آیات کا مقصد شیطان کے ماضی، حال اور مستقبل میں انسان کو گمراہ کرنے کے لیے جاری وساری مکروہ ارادے کو بیان کرنا ہے؛ شیطان اپنے ارادے کو ہر زمانے میں شراب اور جوئے کے ذریعے دشمنی اور عداوت پیدا کرکے پورا کرے گا۔ اسی طرح تیسری آیت کا معنی یہ ہے کہ ناشکرا انسان ہمیشہ بے لگام رہنے کا اور گناہ کرنے کا خواہاں رہا ہے اسی وجہ سے وہ قیامت کا انکار کرتا ہے۔ ان

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۷

چھ آیتوں کے علاوہ اور بہت ساری آیتیں قرآن میں موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ''یُرِیدُ'' ہر تین زمانوں میں بطور فعل استمراری استعمال ہوا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ آیت ''اِنَّمَا یُرِیدُ اللهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجسَ'' کا مطلب یہ ہے کہ اصحاب کساء کی عصمت وطہارت اور قداست و پاکیزگی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ مستقل اور مستمرّ ہے۔

مسئلہ عصمت پر نکتہ چینی

انبیاء ؑ اور آئمہ ہدیٰ ؑ کی عصمت کے بارے میں بہت سارے سوال اٹھائے گئے ہیں ان میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا معصوم ہونے سے جبر لازم نہیں آتا؟ اگر مقام عصمت اللہ کی دین ہے جو صرف اور صرف ان عظیم ہستیوں کے نصیب میں آئی ہے۔ اور انبیاء اور آئمہ معصومین گناہ انجام نہیں دے سکتے یا اللہ تعالیٰ گناہ کے اسباب زبردستی روک دیتا ہے تو پھر یہ کون سا کمال اور فضلیت ہے؟ اس سوال کا جواب تفصیل کے ساتھ عصمت انبیاء کے باب میں پیام قرآن کی ساتویں جلد میں دیا جا چکا ہے اس کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے: اس اعتراض کی وجہ آئمہ ؑ کی عصمت کی بنیادوں کو نہ سمجھنا ہے انہیں اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ اس ناقابل شکست تقویٰ یعنی عصمت کا سرچشمہ مضبوط ایمان اور غیر معمولی علم وآگہی ہے۔ ان میں سے ہر دو کا ایک حصہ اکتسابی اور ایک حصہ وہبی (عطا شدہ) ہے اس کی مثال اس اعلیٰ قسم کے ماہر ڈاکٹر کی طرح ہے جو کبھی بھی اس پانی کو منہ نہیں لگاتا جو کئی تجربات کے ذریعے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ مہلک اور جان لیوا جراثیم سے پُر ہے۔ حالانکہ ایک جاہل اور ان پڑھ آدمی ایسے پانی کو پی لیتا ہے، اس ڈاکٹر کا گندے پانی سے اجتناب کرنا اگرچہ قطعی اور حتمی ہے، لیکن ایک مکمل اختیاری عمل ہے کیونکہ وہ چاہے تو پانی پی سکتا ہے لیکن اس کے اثرات اور نتیجے سے آگاہی پانی پینے میں رکاوٹ بن جاتا ہے، وہ اس کام کو انجام دینے میں مکمل آزادی کے ساتھ معصوم کی طرح ہے [1]

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خود اماموں نے اپنے الفاظ اور کلمات میں گناہوں اور غلطیوں کا اعتراف کیا ہے، اس صورت میں انہیں کیسے معصوم مانا جا سکتا ہے؟ وہ خود اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے گناہوں سے معافی اور بخشش طلب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ ان کے معصوم نہ ہونے پر دلیل ہے۔ امام علی بن ابی طالب- نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۱۶ میں فرماتے ہیں:

اِنِّی لَسْتُ فِی نَفْسِی بِفَوْقِ اَنْ اُخْطِی وَ لَا آمَنُ ذٰلِکَ مِنْ فِعْلِی اِلَّا اَنْ یَکْفِیَ اللهُ مِنْ نَفْسِی مَا هُوَ اَمْلَکُ بِهٖ مِنِّی۔ [2]

میں (بحیثیت انسان) اپنے آپ کو غلطی اور خطا کرنے سے بالاتر نہیں سمجھتا اور نہ ہی لغزشوں سے مبرا سمجھتا ہوں مگر یہ کہ اللہ میرے نفس کو اس سے بچائے رکھے کہ جس پر وہ مجھ سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔

---

[1] مزید تفصیل کیلئے پیام قرآن کی جلد ۷ صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۷ مطالعہ۔

[2] تفسیر روح المعانی کے مولف آلوسی نے آیت تطہیر کی تفسیر میں عجیب طرح سے سارا زور لگا کر یہ کوشش کی ہے آیت سے اہل بیت کے معصوم ثابت ہونے سے انکار کرے، اس کیلئے اس نے مذکورہ بالا اعتراضات پیش کیے ہیں، (روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۷)

اسی طرح کا اعتراض قرآن میں انبیاء کے واقعات سے متعلق آیات کے بارے میں بھی ہوسکتا ہے ان سب کا ذکر ہم بڑی تفصیل کے ساتھ اسی تفسیر کی ساتوں جلد میں تنزیہ انبیاء کے موضوع میں کر چکے ہیں، وہاں پر انبیاء کی تاریخ میں سے ہر اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا جس میں اس قسم کے اعتراضات کی گنجائش تھی۔ پھر ان کا مفصل جواب بھی دیا گیا۔ یہاں پر مختصر طور پر چند نکات کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ بہت سارے مقامات پر معصومین نے نمونے کے طور پر لوگوں کے لیے گفتگو کی ہے اور ان کی ان باتوں میں ہدایت اور تعلیم کا پہلو موجود تھا، دلچسپ بات یہ ہے کہ تفسیر روح المعانی کے موئف نے امیر المومنین علیؑ کے بارے میں یہی اعتراض کرتے ہوئے یہی جواب دیا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: جس طرح پیغمبر اکرم ﷺ کی بعض دعاؤں میں ہے اس طرح کا ہدایت اور تعلیم کا ارادہ علیؑ کے کلام میں بعید ہے۔[1]

معلوم نہیں، یہ قصد وارادہ رسول خدا ﷺ کے کلام میں کیوں بعید نہیں اور علیؑ کے کلام میں کیوں بعید ہے؟ یہ بے اصولی کی انتہا ہے اور اس کی وجہ صرف اور صرف مفسر کا گہرا تعصب ہے۔

۲۔ بعض موارد میں معصومین کا ہدف یہ بتانا مقصود تھا کہ ہم عنایت خداوندی اور لطف پروردگار کے بغیر اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ سب اس کی عنایات، کرم نوازیاں اور اُسی کی دی ہوئی توفیقات ہیں کہ ہم معصوم ہیں۔ ایک جملہ حضرت علیؑ سے نقل ہوا ہے جو نکتہ چینی کرنے والے کے بالکل برعکس لطف خداوندی کی وجہ سے ان کے معصوم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ امام -فرماتے ہیں میں ذاتی طور پر (اللہ تعالی کے لطف وکرم کے بغیر) غلطی سے محفوظ نہیں ہوں اور یہ فضلیت اللہ کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی یا پھر سورہ یوسف کی اصطلاح کے مطابق ''برہان رب'' کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

۳۔ بہت سارے مقامات پر جہاں آیات اور دعاؤں میں گناہ کا ذکر ہوا ہے، یہ ترک اولی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور ایک مشہور قول کا مصداق ہے۔ وہ قول یہ ہے: ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ'' اس کا مطلب یہ ہے نیک افراد کی نیکیاں مقربین کے گناہ شمار ہوتی ہیں۔

اس نکتہ کو بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ ''ترک اولی'' کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے کسی واجب کام کو ترک کیا ہے یا گناہ کا ارتکاب کیا ہے حتی کسی مکروہ کام کو انجام دیا ہے، بلکہ اس سے مراد کسی مباح کام کا انجام دینا ہے بلکہ دو مستحب کاموں میں سے اہم مستحب کو ترک کر کے کمتر مستحب کو انجام دینا ہے۔ واضح ہے کہ ایک بہتر مستحب کو ترک کر کے کم تر مستحب کو انجام دینا کسی لحاظ سے بھی بُرا کام اور گناہ نہیں ہے بلکہ اسے ترک اولی کہتے ہیں اور دوسروں کے لیے یہی کام نہ صرف برا نہیں ہے بلکہ مستحب کو انجام دینا ایک فضلیت شمار ہوتا ہے، جب کہ بارگاہ الٰہی میں مقرب بندوں کے لیے یہی کام عتاب کا باعث بنتا ہے۔

ایک عام آدمی سے جو نماز صحیح اور قابل قبول ہے وہی ایک بڑے عالم کے لیے ترک اولی ہے اور اُس بڑے عالم کی طرح نماز

---

[1] روح المعانی، ج ۲۲، ص ۱۷۔

معصوم کے مقام کے لائق نہیں ہے۔مزید مطالعہ کے لیے پیام قرآن کی ساتویں جلد کو دیکھیں۔[1]

آئمہ کی خصوصیات

جیسا کہ اس مطلب کی طرف کئی بار اشارہ کیا گیا ہے کہ آئمہ معصومین کے فرائض اور ذمہ داریاں کئی جہات اور پہلوؤں سے انبیاء کے فرائض اور ذمہ داریوں کی طرح ہیں۔صرف یہ کہ ان پر وحی نازل نہیں ہوتی اور وہ دین کے بانی نہیں ہیں بلکہ دین کے محافظ اور انبیاء کے مشن کو جاری وساری رکھنے والے ہیں۔اِسی بنا پر ایسی بہت ساری صفات جن کا انبیاء میں ہونا ضروری ہے ان کا ائمہ معصومین میں ہونا ضروری ہے۔ہم نے قرآنی آیات کی روشنی میں ان صفات کو تفصیل کے ساتھ ساتویں جلد میں پیغمبروں کی عمومی صفات کے عنوان سے بیان کر دیا ہے یہاں پر انہیں دوبارہ مفصل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یاددہانی کے لیے سرسری طور پر ان کا ایک جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔(یاد رہے کہ یہ تمام خصوصیات قرآن کی آیات میں پیغمبروں کے بارے میں بیان ہوئی ہیں) ہادیان برحق اور معصوم آئمہ میں علم اور عصمت کے ساتھ ساتھ درج ذیل صفات کا ہونا بھی لازمی ہے۔

۱۔سچائی اور صداقت

کیونکہ اگر یہ صفت نہ ہو تو پیشواؤں اور پیروکاروں کے درمیان معنوی اور روحانی تعلق کے لیے جس اعتماد اور اطمینان کی اشد ضرورت ہے وہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

۲۔اپنے وعدوں اور عہد و پیمان کی پابندی کرنا

اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کا دعوت کا ایک اہم حصہ ان وعدوں پر مشتمل ہے جو وہ لوگوں کو دیتے ہیں اگر ''صادق الوعد'' (اپنے وعدوں کے سچے) نہ ہوں تو لوگوں میں اپنا اعتماد کھو بیٹھیں گے۔

۳۔احکام الٰہی کی حفاظت اور ان کے پہنچانے میں امانتداری

یہ بھی اعتماد اور اطمینان کا ایک اہم ستون ہے۔

۴۔عوام سے غیر معمولی محبت اور ہمدردی

اگر ان کے اندر یہ خصوصیت موجود نہ ہو تو وہ کبھی بھی لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے سخت مشکلات اور جان لیوا مشقتوں میں

---

[1] پیام قرآن: جلد ۷، صفحہ ۱۰۳ تا ۱۷۳۔

نہیں پڑیں گے خصوصاً بیوقوف، ضدی اور ہٹ دھرم افراد کی ہدایت کے لیے۔

۵۔خلوص اور مکمل بے لوث ہونا

ہر قسم کی جزا اور مادی توقع کے بغیر خدمت کرنا کیونکہ اگر یہ نہیں ہوگی تو ان کی دعوت اور رہبری میں جاذبیت اور کشش ختم ہو جائے گی۔

۶۔دوستوں حتیٰ دشمنوں کے حق میں نیکی اور بھلائی

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحمیت کی صفات کا مظہر ہے اور پیشواؤں اور پیروکاروں کے درمیان معونی اور روحانی رشتے اور تعلق سبب ہے۔

۷۔غیر معمولی شجاعت

قرآن مجید میں شجاعت اور غیر خدا سے نہ ڈرنا، پیغام الٰہی کے مبلغین کی بنیادی خصوصیت قرار دی گئی ہے، کیونکہ کامیابی کا اصل راز یہی ہے اور اس کے بغیر قیادت و رہبریت کا کوئی کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔

۸۔اللہ پر مکمل بھروسہ

اکثر حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہبر و قائد اکیلا رہ جاتا ہے غیر معمولی فاسد ماحول اُسے سب سے الگ تھلگ کر دیتا ہے، اگر اس کا اللہ پر بھروسہ اور توکل نہ ہو تو وہ اپنے مشن کو جاری نہیں رکھ سکتا۔

۹۔حسن اخلاق اور نرمی

اس خصوصیت کا ذکر قرآن مجید کی آیات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہوا ہے، درحقیقت ہر الٰہی رہبر (خواہ نبی ہو یا امام) میں اس خصوصیت کا ہونا ضروری ہے، بصورت دیگر سخت مزاجی، سختی اور ''فظا غلیظ القلب'' لوگوں کے انتشار اور دُور ہو جانے کا سبب بنے گا اور نتیجے کے طور پر اللہ کے ان نمائندوں کے آنے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

۱۰۔مشکل امتحانات میں کامیابی

قرآن مجید نے اسی امر پر حضرت ابراہیمؑ کو منصب امامت دیئے جانے کی بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معصوم پیشواؤں کو آزمائش کی سخت بھٹیوں سے صحیح و سالم گزرنا چاہیے اور تمام مومنین کی جسمانی، روحانی، ظاہری

اور باطنی راہنمائی کی صلاحیت کو ثابت کرنا چاہیے۔ اس بحث کو مفصل طور پر آیات قرآن کی روشنی میں ساتویں جلد میں انبیاء کی عمومی صفات کے عنوان کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔

امام صرف اللہ کی طرف سے منصوب ہوتا ہے

امام کی خصوصیات اور ان کی صفات انبیاء کے ساتھ بہت سے پہلوؤں سے مشابہت کی ابحاث سے مجموعی طور پر نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ (پیغمبروں کے جانشین) معصوم اماموں کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں، اس موضوع میں نہ تو عوام کے انتخاب کا کوئی کردار ہے اور نہ ہی اجماع امت یا عام افراد کی طرف سے نامزدگی کا کردار ہے کیونکہ جن خصوصیات اور صفات کا امام میں ہونا ضروری ہے ان سے خدا کے سوا کوئی آگاہ نہیں ہے۔ ان میں سے اہم ترین صفت عصمت اور خاص علمی مقام ہے۔ امام ان دو بازؤں اور پروں کے بغیر امامت اور مخلوقات کی راہنمائی اور رہبری کی فضا میں پرواز نہیں کر سکتا۔ کون جان سکتا ہے کہ فلاں شخص گناہ اور خطا سے پاک ہے اور وہ تمام شریعت اور انسانی زندگی کے مسائل کا مکمل علم رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ امام کے لیے مذکورہ بالا دیگر خصوصیات کی تشخیص بہت سارے افراد کے لیے بابعض اوقات تمام افراد کے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ امام کو معین کرنے کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ ہے اُسی کی طرف سے امام کا تقرر ہونا چاہیے۔ یہ تقرر تین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے:

اول: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا پہلے والے امام معصوم کے ذریعے سے جو اپنے الٰہی جانشین کو حق تعالیٰ کے فرمان سے تعین کرتا ہے اور تمام لوگوں کو اس کا تعارف کراتا ہے درحقیقت اس مسئلے میں وہ حکم الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

دوم: معجزات کے ذریعے جیسا کہ نبوت کے باب میں گزر چکا ہے یعنی امام کا ایسا فوق العادت کام انجام دینا جو بشری قوت کے بس سے باہر ہو اور وہ بھی چیلنج اور دوسروں کو مقابلے کی دعوت کے ساتھ ہو اس طرح سے کہ اگر وہ اس کو نہیں مانتے تو وہ اس جیسا کام کر کے دکھائیں، البتہ نبوت کے حوالے سے چیلنج نبوت کے میدان میں ہوتا ہے اور امامت کے مسئلہ میں چیلنج امامت کے بارے میں ہوتا ہے، عام الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ امامت کا دعویٰ کرنے والا شخص بشری طاقت سے مافوق کام انجام دے گا اور اسے دعویٰ امامت کے ساتھ انجام دے گا۔ مسلم بات ہے کہ اس فوق العادت کام انجام دینے کی قوت اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم علیم، آگاہ اور خبیر ہے وہ ہرگز یہ قوت جھوٹے دعویداروں کے ہاتھ میں نہیں دے گا۔

سوم: جس طرح نبوت کی بحث میں بیان ہوا ہے، ایک تیسرا راستہ بھی موجود ہے اور وہ قرآئن اور شواہد کا اکٹھا کرنا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ صفات، اعمال اور خصوصیات کا ایسا اگر مجموعہ کسی میں پایا جائے کہ جسے دیکھ کر انسان یقین حاصل کر لے کہ وہ شخص معصوم امام اور الٰہی پیشوا ہے۔ اس کا علم و دانش، اس کی اعلیٰ انسانی اور اخلاقی صفات، اس کے کارنامے، اعمال، نظریات، اور منصوبے سب مل کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ یقیناً وہ معصوم امام ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برحق جانشین ہیں، اس بارے میں تفصیل ساتویں جلد کے ''نبوت اور قرآن'' کے باب کا مطالعہ کریں۔

انبیاء اور آئمہ علیہم السلام کی ولایت تکوینی

اشارہ

ہم جانتے ہیں کہ ولایت دو قسم کی ہوتی ہے:

۱۔ولایت تشریعی ۲۔ولایت تکوینی

ولایت تشریعی سے مراد شرعی اور قانونی طور پر حاصل ہونے والا اختیار، تسلط اور سرپرستی ہے کبھی اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ جیسے نابالغ بچے پر باپ اور دادا کی ولایت، اور کبھی اس کا دائرے انتہائی وسیع اور عام ہوتا ہے جیسے اسلامی حکمران کی حکومت اور اسلامی ملک کو چلانے سے مربوط تمام امور اور مسائل میں ولایت ہے جس کے بارے میں انشااللہ پیام قرآن کی دسویں جلد میں مفصل بات کی جائے گی۔

لیکن ولایت تکوینی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان اللہ تعالی کے حکم اور اذن سے عالم خلقت اور کائنات میں ردوبدل کر سکے اور اسباب کی اس دنیا میں عالم طبیعت کے معمول کے برخلاف واقعات اور حالات پیدا کر دے۔ مثلا نا قابل علاج مریض کو اذن الٰہی سے یا اللہ کی دی ہوئی طاقت اور تسلط سے شفا دے دے یا مردوں کو زندہ کر دے اور اسی طرح کے دیگر کام ولایت تکوینی میں شمار ہوتے ہیں، علاوہ ازیں انسانی نفوس اور اجسام اور عالم طبیعت میں ہر قسم کا فوق العادت روحانی تصرف اسی قسم میں شامل ہے۔ ولایت تکوینی کی چار صورتیں ممکن ہیں جن میں سے بعض قابل قبول اور بعض نا قابل قبول ہیں:

۱۔کائنات کی خلقت اور آفرینش میں ولایت

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالٰی اپنے بندوں میں سے کسی بندے یا اپنے فرشتوں میں سے کسی فرشتے کو یہ طاقت و توانائی عطا کرئے کہ وہ کسی دنیا اور عالم کو خلق کرئے اُسے صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ یقینا یہ امر محال نہیں ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر قسم کی قوت و طاقت کسی کو بھی عطا کر سکتا ہے، لیکن قرآنی آیات ہر مقام پر یہ بتاتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ یہ کائنات، آسمان و زمین، جن و انس، فرشتے، ملک، پودے، حیوان، پہاڑ اور دریا سب کے سب رب کی قدرت سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ خاص بندوں یا فرشتوں کے ذریعے سے لہٰذا تمام جگہوں پر خلقت کی نسبت اُسی کی طرف دی گئی ہے اور کہیں پر بھی یہ نسبت (وسیع معنوں میں) اس کے غیر کی طرف نہیں دی گئی۔ بنابرایں آسمانوں، زمینوں، پودوں، حیوانوں اور انسانوں کا خالق صرف اور صرف اللہ ہے۔

۲۔ولایت تکوینی، واسطہ فیض ہونے کے معنی میں

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے ہر قسم کی مدد، رحمت، برکت اور طاقت جو بندوں اور کائنات کی دیگر مخلوقات تک پہنچتی ہے وہ اولیاء الٰہی اور اس کے خاص بندوں کے ذریعے سے پہنچتی ہے، اس کی مثال شہر میں سپلائی کیے جانے والے صاف پانی کی طرح

ہے یہ سب پانی گھروں تک پائپ لائن کے ذریعے پہنچتا ہے اور یہ بڑی پائپ لائن پانی کو اصلی منبع سے حاصل کر کے شہر میں ہر جگہ تک پہنچاتی ہے اور اس پائپ لائن کو ''وسیلہ فیض'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ معنی بھی عقلی طور پر محال نہیں ہے۔ عالم صغیر (انسانی وجود) میں اس کا نمونہ موجود ہے انسان کے بدن میں غذائی مواد اور آکسیجن کا دِل کی شہہ رگ کے ذریعے جسم کے تمام حصوں تک پہنچنا، اس کی بہترین مثال ہے، جب عالم صغیر میں ایسا ہو سکتا ہے تو عالم کبیر (کائنات) میں ایسا ہونے میں کیا مانع ہے؟ لیکن بلاشک اس کو ثابت کرنے کے لیے کافی دلائل کی ضرورت ہے اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی ''باذن اللہ'' ہے۔

۳۔ خاص حدود کے اندر ولایت تکوینی

جیسے مردوں کو زندہ کرنا، لا علاج بیماروں کو شفا دینا وغیرہ اس قسم کی ولایت کی مثالیں قرآن مجید میں بعض انبیاء کے بارے میں واضح طور پر ذکر ہوئی ہیں جن کی طرف بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔ اسلامی روایات بھی اس پر گواہی دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے ولایت تکوینی کی یہ صورت نہ صرف عقلی اعتبار سے ممکن ہے بلکہ اس پر متعدد نقلی دلائل بھی موجود ہیں۔

۴۔ ولایت تکوینی، مطلوبہ امور کے وقوع پذیر ہونے کی دعا معنی میں

یعنی ان امور کے قدرت الٰہی کے ذریعے سے پورا ہونے اور انجام پانے کی دعا کرنا۔ اس طرح سے کہ نبی یا امام دُعا کریں اور جو انہوں نے خدا سے مانگا ہے وہ واقع ہو جائے۔ یہ صورت بھی عقلی اور نقلی لحاظ سے قابل اعتراض نہیں ہے۔ آیات اور روایات اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے اِسے ولایت تکوینی ہی نہ کہا جائے کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی دعا کی قبولیت ہے۔

بہت ساری روایات میں ''اسم اعظم'' کے اشارے موجود ہیں جو کہ پیغمبروں، اماموں اور اولیا الٰہی (انبیاء اور آئمہ کے علاوہ) کے اختیار میں تھا اور وہ اس کے ذریعے سے کائنات اور عالم ہستی میں تصرف کرتے رہے۔ اس سے قطع نظر کہ اسم اعظم سے مراد کیا ہے (اس پر ہم نے صفات الٰہی میں سیر حاصل بحث کی ہے) اس قسم کی روایات ولایت تکوینی کی تیسری صورت پر مکمل طور پر منطبق ہو سکتی ہیں اور اس کے لیے دلیل بن سکتی ہیں۔ اب ہم ولایت تکوینی کے بارے میں آیات الٰہی کو بیان کرتے ہیں:

۱۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾

(آل عمران ۴۸۔۴۹)

۲۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ (ص/۳۶)

۳۔قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡكِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡكَ طَرۡفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ ۟ۖ لِیَبۡلُوَنِیۡۤ ءَاَشۡكُرُ اَمۡ اَكۡفُرُ ؕ وَمَنۡ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیۡ غَنِیٌّ كَرِیۡمٌ ﴿۴۰﴾ (نمل/۴۰)

ترجمہ

ا۔اور اللہ اُسے کتاب وحکمت اور توریت وانجیل کی تعلیم دے گا۔اور وہ اُسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا (اور وہ کہے گا) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں (وہ یہ کہ) میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی شکل کا مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور برص کے مریض کو شفا دیتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہو، اگر تم صاحبان ایمان ہو تو اس میں تمہارے لیے نشانی ہے۔

۲۔پھر ہم نے ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا؛ جدھر وہ جانا چاہتے تھے ان کے حکم سے نرمی کے ساتھ اسی طرف چل پڑتی تھی۔

۳۔جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا وہ کہنے لگا: میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں جب سلیمان نے اُسے اپنے سامنے نصب شدہ دیکھا تو کہا: یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفران اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنے فائدے کے لیے شکر کرتا ہے، اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا رب یقیناً بے نیاز اور صاحب کرم ہے۔

سب سے پہلی آیت میں ابتداء میں حضرت عیسیٰؑ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایتوں کا ذکر ہے ارشاد ہوتا ہے:

''اللہ نے انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی اور انہیں تورات وانجیل عطا کی''

وَیُعَلِّمُهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَالتَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ﴿۴۸﴾

اس کے بعد ''اُس نے انہیں رسول کی حیثیت سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجا'' (وَرَسُولاً اِلٰی بنی اسرائیل) اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے جو کچھ کہا، اُسے اور ان کے معجزات کی تفصیل آیت میں بیان کی گئی ہے۔ان کے معجزات کو پانچ حصوں میں ذکر کیا گیا ہے۔سب سے پہلے وہ فرماتے ہیں:

میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی اور معجزہ لے کر آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مٹی سے پرندے کی شکل بناتا

ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں اور وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔ (اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ۙ اَنِّىۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّيۡرِ فَاَنۡفُخُ فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ) دوسرا اور تیسرا معجزہ یہ ہے کہ میں مادرزاد اندھے اور برص کے مریض (لاعلاج مرض) کو تندرست کر دیتا ہوں (وَ اُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَ الۡاَبۡرَصَ) چوتھا یہ کہ: میں مردوں کو اللہ کے اذن سے زندہ کرتا ہوں (وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِ اللّٰهِ) پانچواں معجزہ یہ کہ جو کچھ کھاتے ہو اور گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو میں تمہیں اس کے بارے میں خبر دیتا ہوں (اور آگاہ کرتا ہوں) اگر تم صاحبان ایمان ہو تو اس میں تمہارے لیے نشانی ہے۔

وَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۚ‏ ﴿۴۹﴾

اس آیت کے مفہوم اور اس میں استعمال ہونے والے الفاظ میں غور و فکر کرنے سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ پرندے کی آفرینش کو خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں جب کہ دیگر تین معجزات (مادرزاد اندھے اور برص کے مریض کو شفا دینے اور مردوں کو زندہ کرنے) کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں البتہ اللہ کے حکم اور اذن سے، ولایت تکوینی سے مراد یہی ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی قدرت دیتا ہے کہ وہ اس کے حکم سے کائنات اور عالم طبیعت میں تصرف کر سکتا ہے معمول کے اسباب و وجوہات کو درہم برہم کر سکتا ہے، مردے کو زندہ کر سکتا ہے اور ناقابل علاج بیماروں کو شفا دے سکتا ہے۔

یہ تھا ولایت تکوینی کا ایک نمونہ، جو خدا نے اپنے بندے حضرت عیسیٰؑ کو عطا فرمایا اور اس قسم کی چیز دوسرے انبیاء یا اماموں کو عطا کرنے میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ دعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ اُس بیمار کو شفا دے دیتا تھا یا اُس مردے کو زندہ کر دیتا تھا، تو یہ بات آیت کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے کیونکہ آیت بڑی صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہے کہ ''میں اس کام کو حکم خدا سے انجام دیتا ہوں''، یعنی اُسے خود انجام دیتا ہوں البتہ باذن اللہ۔ لہٰذا ہمارے پاس آیت کے آشکار مفہوم کو چھوڑ کر اس کے برخلاف معنیٰ کو اختیار کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

بلکہ پرندے کی پیدائش کے مرحلے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پھونک میں خدا نے یہ اثر عطا کر دیا ہو کہ وہ اذن الٰہی سے ایسا کام انجام دے سکتے ہوں۔ اگرچہ بہت سارے مفسرین نے اس معنیٰ کو قبول نہیں کیا اور کہا ہے کہ پرندے کی پیدائش براہ راست اللہ تعالیٰ سے مربوط تھی اور شاید ان الفاظ کو اس لیے لایا گیا ہو کہ جاہل افراد حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت اور خدائی کا دعویٰ نہ کریں کیونکہ خلقت کا مسئلہ صرف خدا سے وابستہ ہے۔

اسی طرح کا مطلب سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں بھی بیان ہوا ہے، البتہ خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو خطاب کی صورت میں نہ حضرت عیسیٰؑ کی اپنی زبان سے، ارشاد رب العزت ہے:

وَاِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّيۡنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّيۡرِ بِاِذۡنِىۡ فَتَنۡفُخُ فِيۡهَا فَتَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِىۡ وَتُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِىۡ ۚ وَاِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِىۡ ۚ

(یاد کرو میری نعمت کو) جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کا مجسمہ بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے صحت یاب کرتے تھے اور میرے حکم سے مردوں کو (زندہ کر کے) نکال کھڑا کرتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورہ آل عمران میں جو الفاظ کا اختلاف تھا بالکل وہی اختلاف یہاں بھی نظر آ رہا ہے۔یعنی پرندے کی خلقت اور پیدائش کو حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت نہیں دی گئی لیکن مردوں کو زندہ کرنے، لاعلاج مریضوں، مادر زاد اندھوں کو شفا دینے کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی طرف دی گئی ہے، اگرچہ "باذن اللہ" صریحاً ان سب میں مذکور ہے۔مختصر یہ ہے کہ یہ آیات واضح طور پر ولایت تکوینی کے مسئلے کو حضرت عیسیٰؑ کے لیے محدود اور خاص دائرے میں ثابت کر رہی ہیں، اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ مسئلہ فقط حضرت عیسیٰؑ میں منحصر ہے، اور اس قول "حُكْمُ الاَمْثَالِ فِي مَا يَجُوزُ و ما لايَجُوزُ واحد" کی رُو سے دیگر پیغمبروں یا معصوم اماموں کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔

دوسری آیت میں حضرت سلیمان کے لیے ہوا کا تابع فرمان ہونے کی بات ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا کہ وہ ان کے حکم سے نرمی سے چلے اور جہاں وہ چاہیں انہیں لے جائے۔" (فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ) اس آیت اور اس کے بعد والی آیات سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح شیاطین حضرت سلیمان کے تابع تھے اور ان کے لیے خشکی اور سمندر میں بڑے بڑے کام انجام دیتے تھے اسی طرح ہوا بھی ان کے تابع تھی وہ جہاں اُسے حکم دیتے وہ ادھر کو چلنے لگتی اور یہ چیز ان مخلوقات میں ولایت تکوینی کا ہی مصداق ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔اسی طرح کا مطلب سورہ انبیاء کی آیت ۸۱ میں بھی بیان ہوا ہے: ارشاد ہوتا ہے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهٖٓ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بٰرَكْنَا فِيهَا ؕ

اور سلیمان کے لیے تیز ہوا کو مسخر کیا جو ان کے حکم سے اس سرزمین تک چلتی تھی جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا۔

یہاں پر بھی تیز ہوا پر حضرت سلیمان کے تسلط اور حکمرانی کی بات ہوئی ہے۔یہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے قصے میں بھی ولایت تکوینی کے مصداق موجود ہیں، مثال کے طور پر چٹان پر ان کا عصا مارنا اور اُس سے حکم الٰہی سے بارہ چشموں کا پھوٹنا (بقرہ/۶۰) اور ان کا دریا پر عصا کو مارنا جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنے عصا کو دریا پر ماریں چنانچہ دریا پھٹ گیا۔(شعرا/۶۳) خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو کائنات اور عالم خلقت میں تصرف کرنے کی قوت و توانائی عطا فرماتا ہے۔یہ ولایت تکوینی کی ایک قسم ہے جو خدا کے اس خاص بندے کو حاصل ہوتی ہے۔

تیسری آیت میں ان افراد کے لیے ولایت تکوینی کی بات ہو رہی ہے جو حضرت سلیمان کے قریبی ساتھی تھے۔البتہ ان کا نام قرآن میں نہیں آیا ہے بلکہ ان الفاظ "الّذی عِنْدَہ علم من الکتاب" میں ان کی توصیف بیان کی گئی ہے کہ "جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا"، جب حضرت سلیمان نے اپنے اصحاب اور درباریوں سے فرمایا: تم میں سے کون ہے جو ملکہ سبأ کا تخت میرے پاس لے آئے

قبل اس کے کہ وہ فرمانبردار ہو کہ میرے پاس آئیں۔

قَالَ یا اَیُّھَا المَلَأ اَیُّکُمۡ یأتِیۡنِی بِعَرۡشِھا قَبۡلَ اَنۡ یاتونی مُسۡلِمِینَ

جنوں میں سے ایک عیار نے کہا میں اسے آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں قبل اس کے آپ اپنی جگہ سے اٹھیں:

(قالَ عِفۡرِیت مِنَ الجِنّ انا آتیكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ تَقُومَ مِنَ مَقَامِكَ)

اس کے بعد فرمایا: جس کے پاس کتاب میں سے کچھ علم تھا، اُس نے کہا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اِسے آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں:

(قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡكِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡكَ طَرۡفُكَ ؕ)

البتہ یہ صرف دعویٰ نہیں تھا بلکہ اُس نے اسے عملی کر دکھایا کیونکہ آیت مزید کہتی ہے کہ:

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ

اور جب اُس نے تخت کو اپنے سامنے حاضر دیکھا تو کہنے لگے یہ میرے پروردگار کا فضل وکرم ہے (کہ میرے بعض ساتھیوں میں یہ طاقت وتوانائی ہے) یہاں پر بہت ساری بحث وگفتگو ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ کون تھا؟ مشہور ومعروف یہی ہے کہ وہ حضرت سلیمان کے وزیر آصف بن برخیا تھے کہا جاتا ہے کہ وہ ان کے بھانجے تھے۔ تفسیر عیاشی کی ایک روایت میں یحییٰ بن اکثم کے سوال کے جواب میں امام علی بن محمد النقیؑ نے جو فرمایا ہے، اس کے مطابق آصف، حضرت سلیمان کے وصی اور جانشین تھے اور صاحب مقام نبوت تھے، حضرت سلیمان اس عمل کے ذریعے اس کے مقام ومنزلت کا لوگوں سے تعارف کرانا چاہتے تھے، ورنہ خود حضرت سلیمان اس کام کو انجام دینے کی کہیں زیادہ توانائی رکھتے تھے۔[1]

بعض افراد کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ خود حضرت سلیمان تھے [2] مگر یہ احتمال آیت کے ظاہری معنی کے خلاف ہے۔ بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا، معلوم ہے کہ یہ تفسیر اس تفسیر کے قطعاً منافی نہیں ہے جو کہتی ہے کہ یہ آصف بن برخیا تھے۔ کیونکہ ظاہراً تو وہ بھی بنی اسرائیل سے تھے، بہر حال یہاں پر جو چیز ہمارے مدنظر ہے وہ شخص نہیں ہے، ہمارے پیش نظر یہ بات ہے کہ اولیاء الٰہی میں سے ایک فرد علم الکتاب یا اسم اعظم رکھنے یا کسی اور چیز کے ذریعے کائنات اور عالم اسباب میں تصرف کرنے کی طاقت رکھتا تھا اور اس نے چشم زدن میں ملکہ سبا کے تخت کو عرب کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچا دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ چیز دوسرے

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴، صفحہ ۹۱، حدیث ۷۷۔ تفسیر الدر المنثور میں بھی یہ مفہوم ابن عباس اور بعض دیگر محدثین سے پوری صراحت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ یہ بات کہنے والے آصف بن برخیا تھے کہ جن کا دوسرا نام ''تملیخا'' ہے۔

[2] المیزان نے یہ احتمال جلد ۱۵، صفحہ ۳۶۳ پر نقل کیا ہے اور اس پر اعتراض کیا ہے۔

اولیاء خدا، پیغمبروں اور اماموں کے لیے بھی ہوسکتی ہے۔

خصوصاً ان روایات کی روشنی میں جو امام محمد باقر - سے بیان ہوئی ہیں: انہوں نے فرمایا ہے: اللہ کے اسم اعظم کے تہتر حرف (۷۳ نام) ہیں۔ آصف کے پاس فقط ایک حرف تھا جس کے ذریعے اس نے بات کی اس کے اور تخت بلقیس کے درمیان زمین سمٹ گئی اور اس نے تخت کو پکڑ الیا اور پھر زمین اپنی اصلی حالت پر آ گئی اور یہ سب کچھ چشم زدن سے بھی کم وقت میں ہوا، اور ہمارے پاس اس اسم کے بہتر (۷۲) حرف ہیں اس کا ایک حرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور علم غیب میں اُسی ذات کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی قوت وطاقت اذن الٰہی کے بغیر نہیں ہے۔[1]

یہی مطلب امام باقر -، امام صادق - اور دیگر آئمہ اہل بیتؑ سے منقولہ روایات میں بیان ہوا ہے۔ گزشتہ آیات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں ولایت تکوینی ایک ممکن اور قابل قبول چیز ہے۔

ولایت تکوینی احادیث میں

اسلامی روایات میں معجزات کے بہت سارے واقعات موجود ہیں جو ولایت تکوینی کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ معجزات کی انواع واقسام ہیں، بعض صرف نبی یا امام کی دعا سے واقع ہوئے ہیں بعض لوگوں کے مطالبے کے ساتھ اذن الٰہی سے انجام پائے ہیں اور بعض خود ان کی اپنی طرف سے ان کے عمل سے واقع ہوئے ہیں یعنی ان کے روحانی اور معنوی تصرف اور تسلط کی وجہ سے اور اللہ کے اذن سے انجام پائے ہیں اور یہ امر یہی ولایت تکوینی ہے جس پر ہم گفتگو کررہے ہیں۔

ایسے واقعات کی تعداد بہت زیادہ ہے یہاں پر ہم نمونے کے طور پر چند کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اس کا ایک بہترین نمونہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ كُنْتُ مَعَهُ لَمَّا اَتَاهُ الْمَلَأُ مِنْ قُرَيْشٍ فقالُوا له يا مُحَمَّدُ......[2]

میں رسول ﷺ کے ساتھ تھا کہ قریش کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی اور انہوں نے آپ سے کہا کہ اے محمدؐ! آپ نے ایک بہت بڑا دعویٰ کیا ہے، ایسا دعویٰ نہ تو آپ کے باپ دادا نے کیا نہ آپ کے خاندان والوں میں سے کسی اور نے کیا ہم آپ سے ایک امر کا مُطالبہ کرتے ہیں اگر آپ نے اُسے پُورا کر کے ہمیں دکھلا دیا تو پھر ہم بھی یقین کرلیں گے کہ آپؐ نبی اور رسول ہیں اور اگر نہ کر سکے تو ہم جان لیں گے کہ (معاذ اللہ) آپ جادُوگر اور جُھوٹے ہیں حضرت نے فرمایا کہ تمہارا مطالبہ کیا ہے؟

---

[1] کافی تفسیر برہان کے نقل کے مطابق، جلد ۳، صفحہ ۲۰۳، حدیث ۱۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ۔

انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے لیے اس درخت کو پکاریں کہ یہ جڑ سمیت اکھڑ آئے اور آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ اگر اُس نے تمہارے لیے ایسا کر دکھایا تو کیا تم ایمان لے آؤ گے اور حق کی گواہی دو گے؟ اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا جو تم چاہتے ہو تمہیں دکھائے دیتا ہوں اور میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم بھلائی کی طرف پلٹنے والے نہیں ہو، یقیناً تم میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہیں چاہ (بدر) میں جھونک دیا جائے گا اور کچھ وہ ہیں جو (جنگ) احزاب میں جتھا بندی کریں گے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اے درخت اگر تُو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، تُو اپنی جڑ سمیت اکھڑ آ یہاں تک کہ تو بحکم خدا میرے سامنے آ کر ٹھہر جائے۔ (رسولؐ کا یہ فرمانا تھا کہ) اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا وہ درخت جڑ سمیت اکھڑ آیا اور اس طرح آیا کہ اُس سے سخت کھڑکھڑاہٹ اور پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی سی آواز آتی تھی یہاں تک کہ وُہ لچکتا جُھومتا ہُوا رسُول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُوبرُو آ کر ٹھہر گیا اور بلند شاخیں اُن پر اور کچھ شاخیں میرے کندھے پر ڈال دیں اور میں آپؐ کی دائیں جانب کھڑا تھا۔ جب قریش نے یہ دیکھا تو نخوت وغرور سے کہنے لگے کہ اسے حکم دیں کہ آدھا آپ کے پاس آئے اور آدھا اپنی جگہ پر رہے۔ چنانچہ آپؐ نے اُسے یہی حکم دیا تو اُس کا آدھا حصہ آپؐ کی طرف بڑھ آیا اس طرح کہ اُس کا آنا (پہلے آنے سے بھی) زیادہ عجیب صُورت سے اور زیادہ تیز آواز کے ساتھ تھا اور اب کہ وُہ قریب تھا کہ وہ رسُولؐ سے لپیٹ جائے۔

اب انہوں نے کفر وسرکشی سے کہا کہ اچھا اب اس آدھے کو حکم دیجیے کہ یہ اپنے دُوسرے حصے کے پاس پلٹ جائے جس طرح پہلے تھا۔ چنانچہ آپؐ نے حکم دیا اور وُہ پلٹ گیا میں نے (یہ دیکھ کر) کہا کہ لا الہ الا اللہ، اے اللہ کے رسُولؐ میں آپ پر سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں، اور سب سے پہلے اِس کا اقرار کرنے والا ہُوں کہ اس کے درخت نے بحکم خدا آپؐ کی نبوت کی تصدیق اور آپ کے کلام کی عظمت و برتری دِکھانے کے لیے جو کچھ کیا ہے وُہ امر واقعی ہے۔ یہ سُن کر وہ ساری قوم کہنے لگی کہ یہ (نعوذ باللہ) پرلے درجے کے جھوٹے اور جادوگر ہیں، ان کا سحر عجیب وغریب ہے اور ہیں بھی اس میں چابکدست۔ اس امر پر تصدیق ان جیسے ہی کر سکتے ہیں اور اس سے مراد مجھے لیا۔ میں تو اس جماعت میں سے ہوں جن پر اللہ کے بارے میں کوئی ملامت اثر انداز نہیں ہوتی وہ جماعت ایسی ہے جن کے چہرے سچوں کی تصویر اور جن کا کلام نیکوں کے کلام کا آئینہ دار ہے۔ وہ شب زندہ دار دِن کے روشن مینار اور خدا کی رسی سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے فرمانوں اور پیغمبر کی سنتوں کو زندہ کرتے ہیں نہ یہ تکبر اور غرور کرتے ہیں نہ خیانت کرتے ہیں اور نہ فساد پھیلاتے ہیں ان کے دِل جنت میں اٹکے ہوئے اور جسم اعمال میں لگے ہوئے ہیں۔

اس خطبے کے الفاظ پر ذرا غور کریں تو یہ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ یہ فوق العادت امر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالم تکوین پر تصرف اور تسلط کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس بنا پر جو کچھ عبارت کے اس جملے: ''اِنَّ الشَّجَرَ فَعَلَتْ بِاَمْرِ اللّٰہِ تعالٰی'' (درخت نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے حکم سے تھا) میں آیا ہے یہ اذن اور خدا کی اجازت سے تھا اور اُس قوت وتوانائی سے ہوا جو خدا نے اپنے رسول کو اس قسم کے تصرفات کے لیے عطا کی تھی، جیسا کہ اس عبارت کے شروع میں ''اذن اللہ'' کا لفظ آیا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے الفاظ کہ حکم دے، امر کرو یہ اور وہ ہو جائے اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درخت سے فرمانا: اے درخت ایسے کرو یہ سب اس امر پر دلیل ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

ولایت تکوینی حاصل تھی۔

۲۔علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں سلمان فارسی سے یوں بیان کیا ہے:

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو لوگوں نے آپؐ کے اونٹ کی مہار پکڑ لی (اور ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پیغمبر اکرمؐ اس کے گھر میں ٹھہریں) آنحضرتؐ نے فرمایا:

اونٹی کو چھوڑ دو، وہ مامور ہے وہ جس کے گھر کے سامنے بیٹھے گی میں اُسی کے گھر میں قیام کروں گا (اور یہ ہر قسم کے اختلاف اور جھگڑوں کے حل کا بہترین طریقہ تھا) انہوں نے ناقہ کو چھوڑ دیا وہ اسی طرح چلتی ہوئی مدینے کی گلیوں میں داخل ہوئی اور حضرت ابوایوب انصاری کے گھر کے دروازے پر بیٹھ گئی اور مدینے میں وہ سب سے زیادہ غریب تھا، قریب تھا کہ لوگوں کے دل حسرت سے پھٹ جائیں کہ آنحضرتؐ ان کے پاس کیوں نہ ٹھہرے (اور یہ عظیم سعادت انہیں نصیب نہ ہوئی) ابوایوب نے آواز دی: اے ماں! دروازہ کھولو:

"فَقَدْ قَدِمَ سَيِّدُ الْبَشَرِ وَ اَكْرَمُ رَبِيعَةِ وَ مُضَرٍ مُحَمَّدُ المصطفىٰ وَ الرَّسولِ الْمُجْتَبىٰ"

"انسانوں کے سردار، ربیعہ اور مضر قبیلہ کے بزرگ، محمد مصطفیٰ اور رسول مجتبیٰ تشریف لائے ہیں"

اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور باہر آئی وہ نابینا تھی۔ اس نے کہا: کاش! میری آنکھیں ہوتیں اور میں اپنے آقا و مولا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوایوب کی والدہ کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھنا شروع کر دیا یہ پہلا معجزہ تھا جو آپؐ سے ظاہر ہوا۔ (ممکن ہے چہرے پر ہاتھ رکھنے سے مراد اشارے سے ہاتھ پھیرنا ہو یا کپڑے کے اوپر ہاتھ پھیرنا مقصود ہو) [۱]

۳۔ یہ بھی شیعہ و سنی کتب میں مذکور ہے کہ جنگ خیبر میں جب بعض کمانڈروں کے ذریعے فتح نصیب نہ ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کل میں اس کو علم دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہو گا اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح عطا کرے گا، اس کے بعد آپؐ نے علیؑ کو بلایا، وہ آشوب چشم کے درد میں مبتلا تھے، حضرت علیؑ، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت شرفیاب ہوئے۔ آنحضرتؐ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں پر لگایا اس کے بعد آنکھوں کی تکلیف جاتی رہی اس کے بعد انہوں نے پرچم ان کے حوالے کیا (اور انہوں نے خیبر کو فتح کیا)۔ [۲]

یہ مشہور حدیث ثابت کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تکوینی اثر و نفوذ سے (باذن اللہ) علی کی آنکھوں کو شفا بخشی۔

۴۔ حضرت امیرالمومنین علیؑ کے حالات زندگی میں بیان ہوا ہے کہ ان کے زمانے میں دریائے فرات میں ایسی طغیانی آئی کہ کوفے کے لوگ خوفزدہ ہو گئے اور ان کی خدمت میں آ کر کہنے لگے ہمیں ڈوبنے کا خطرہ ہے کیونکہ پانی اتنا اونچا آ گیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے، خدا کے لیے ہماری مدد کریں!

امیرالمومنین -سواری پر سوار ہوئے لوگ آپ کے دائیں اور بائیں طرف ہو لیے اور فرات کی طرف چلنے لگے۔ جب فرات پر

---

[۱] بحارالانوار ج ۱۹، صفحہ ۱۲۱۔

[۲] اس حدیث کو ابن اثیر نے کامل میں بطور مفصل بیا کیا ہے (جلد ۲ ص ۲۱۹) اسی طرح ابن ہشام نے سیرۃ نبویہ کی جلد ۳، ص ۳۴۹ اور علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں جلد ۲۱، صفحہ ۲۹۸، حدیث ۳۰۔

پہنچے تو دیکھا کہ دریا کی موجیں بپھری ہوئی ہیں اور ہر طرف پانی نظر آرہا ہے۔ حضرت علیؑ کھڑے ہوگئے لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے عبرانی زبان میں کچھ کہا: اچانک فرات کا پانی ایک ہاتھ نیچے چلا گیا۔ آپ نے لوگوں کی طرف رخ کر کے کہا: کافی ہے؟ لوگ عرض کرنے لگے: اور زیادہ نیچے کریں۔ آپ کے ہاتھ میں جو چھڑی تھی اُسے آپ نے پانی پر مارا۔ پانی اور زیادہ نیچے ہوگیا (لوگ خوشی خوشی دریا سے واپس لوٹ گئے) (ا) تو یہاں سوال یہ ہے کہ آیا یہ کام باذن الٰہی سے تکوینی تصرف کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

۵۔ حضرت علیؑ کے حالات زندگی میں یہ بھی ملتا ہے کہ وہ کوفہ کے قریب سے گزر رہے تھے کہ چند یہودی ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: کیا آپ امام علی بن ابی طالب۔ ہیں؟ فرمایا: ہاں میں ہوں! انہوں نے عرض کیا: ہماری کتابوں میں ایک چٹان کا ذکر آیا ہے جس پر چھ انبیاء کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے اُسے بہت تلاش کیا ہے لیکن اُسے نہیں پا سکے۔ اگر آپ امام ہیں تو اُسے تلاش کر کے دکھائیں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: میرے پیچھے پیچھے آئیں۔ وہ سب لوگ ان کے پیچھے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ جب صحرا میں پہنچے وہاں پر ریت کا بڑا ٹیلہ تھا، امام ؑ نے فرمایا:

اَيُّتهَا الرِّيحُ اِنسِفِى الرَّمْلَ عَنِ الصَّخْرَةِ بِحَقِّ اسْمِ اللّٰهِ الاَعْظَمِ ۔ [1]

اے ہوا بحق اسم اعظم خدا، ریت کو اس چٹان سے ہٹا دے۔

چنانچہ ہوا چلنے لگی، ریت ہٹ گئی اور چٹان ظاہر ہوگئی۔ یہ عالم خلقت میں اثر و نفوذ اور تصرف کا ایک اور نمونہ تھا۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں اور نمونے، تاریخ، تفسیر، حدیث اور دیگر مختلف کتابوں اعم از شیعہ و سنی میں مذکورہ ہیں ان سب کو بیان کرنے کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ ان آیات اور روایات سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے خواہ وہ انبیاء ہوں یا امام ان کے پاس حکم اور اذن الٰہی سے ایسی قوت و طاقت تھی کہ جن مقامات پر خدا کی طرف سے اجازت تھی وہاں وہ کائنات کے امور میں تصرف اور مداخلت کر سکتے تھے وہ نہ صرف خدا سے دعا اور درخواست کے ذریعے سے، بلکہ اپنے ذاتی خداداد اثر و رسوخ کے ذریعے سے، جو اس قسم کے امور انجام دینے کے لیے انہیں عطا ہوا تھا اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم ولایت تکوینی کہتے ہیں۔

البتہ ولایت تکوینی کی اور بھی شاخیں ہیں ان میں سے ایک حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ قلوب پر معنوی اور روحانی امداد کے ذریعے موثر ہونا، لائق اور قابلیت رکھنے والے افراد کی غیر محسوس انداز میں ہدایت اور تربیت کرنا ہے، اس قسم کی مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔ بہت سے افراد تھے جو پیغمبر اکرم ﷺ یا امام معصوم کی خدمت میں آئے اور ایک لحظہ میں ان کے اندر اس طرح سے عجیب تبدیلی آئی اور انقلاب رونما ہوا، جسے عام اصولوں اور معیاروں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ اس انقلاب اور تبدیلی کے نتیجے میں ان کی زندگیاں بالکل بدل گئیں۔ یہ فوق العادت اور غیر معمولی تبدیلی، ولایت تکوینی کے اثرات میں سے ایک اثر ہے جو قابل اور باصلاحیت افراد میں رونما ہوتا تھا۔

---

[1] بحار الانوار ج ۴۱، صفحہ ۲۳۷ (خلاصہ کے ساتھ)

ولایت وامامت خاصہ

اشارہ

اب ہم امامت کی عمومی بحث، یعنی ''امامت عامہ'' کے اختتام پر ''امامت خاصہ'' پر بحث وگفتگو آغاز کرتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کے جانشین اور خلیفہ الٰہی اور امام معصوم کون تھے؟ اس کی شناخت اور پہچان کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اس حوالے سے قرآن وحدیث اور اسلامی ماخذ سے مدد حاصل کریں گے۔

قرائن وشوائد کو اکٹھا کرنا، پیغمبروں اور اماموں کی شناخت اور پہچان کا ایک بہترین ذریعہ ہے، ہم اس ذریعے سے بھی مدد لیں گے، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! جو حق وحقیقت ہے وہ ہماری فکر، بیان اور قلم پر جاری فرما اور ہر قسم کے انحراف اور خلاف ورزی سے محفوظ فرما۔ سب سے پہلے ہم امامت خاصہ کے بارے میں موجود آیات پر تحقیق کریں گے۔ ان آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ وہ آیات جو براہ راست امامت کے موضوع سے متعلق ہیں اور اس پر واضح انداز میں گفتگو کرتی ہیں۔

۲۔ وہ آیات جو بالواسطہ طور پر امامت کے موضوع کو بیان کرتی ہیں۔ اگرچہ دونوں قسم کی آیات کثرت سے ہیں لیکن ہماری بنا اس پر ہے کہ ان دو قسموں میں سے جو زیادہ واضح ہیں ان کا انتخاب کر کے زیر بحث لایا جائے۔ پہلی قسم میں ہم درج ذیل آیات پر گفتگو کریں:

ا۔ آیت تبلیغ اور واقعہ غدیر　　۲۔ آیت ولایت
۳۔ آیت اولی الامر　　۴۔ آیت صادقین
۵۔ آیت قربیٰ۔

آیات کی دوسری قسم فضائل پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں ہم ان آیات کو بیان کریں گے جو براہ راست امامت اور خلافت کے موضوع سے متعلق نہیں ہیں، البتہ امیر المومنین علیؑ کے فضائل کو ضرور ثابت کرتی ہیں اور انہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت میں سے اعلیٰ ترین اور بلند ترین شخصیت کے طور پر متعارف کراتی ہیں۔ ان فضائل کے ساتھ ایک بدیہی عقلی مقدمہ (مفضول کو افضل پر ترجیح دینا قبیح ہے) ضمیمہ کرنے سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت کی قیادت اور رہبریت کے لیے ان سے زیادہ لائق اور قابل کوئی اور نہیں ہے۔ ایسی آیات کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے ہم صرف ۲۵ کا ذکر کریں گے:

ا۔ آیت مباہلہ　　۲۔ آیت خیر البریہ
۳۔ آیت لیلۃ المبیت　　۴۔ آیت حکمت
۵۔ سورہ ھل اتی کی آیات　　۶۔ سورہ برائت کی ابتدائی آیات

۷۔آیت سقایۃ الحاج
۸۔آیت صالح المومنین
۹۔آیت وزارت
۱۰،۱۱۔سورہ احزاب کی آیات
۱۲۔آیت بینہ وشاھد
۱۳۔آیت صدیقون
۱۴۔آیت نور
۱۵۔آیت انذار
۱۶۔آیت مرج البحرین
۱۷۔آیت نجوی
۱۸۔آیت سابقون
۱۹۔آیت اذن واعیہ
۲۰۔آیت مودت
۲۱۔آیت منافقون
۲۲۔آیت ایذاء
۲۳۔آیت انفاق
۲۴۔آیت محبت
۲۵۔آیت مسئولون۔

ا۔آیت تبلیغ

يَٰٓأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٦٧﴾ (مائدہ/۶۷)

اے رسول! جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اُسے (لوگوں تک) پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اللہ کا پیغام ہی نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا؛ بے شک اللہ کافروں کی راہنمائی نہیں کرتا۔

شان نزول

اہل سنت کے بہت سے علماء کی کتابوں (اور شیعہ کی تمام معتبر کتب) میں خواہ وہ تاریخ کی کتب ہوں یا حدیث اور تفسیر کی، بیان ہوا ہے کہ مذکورہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ان روایات کو صحابہ کرام کے ایک بڑے گروہ نے نقل کیا ہے جن میں ابو سعید خدری، زید بن ارقم، جابر بن عبداللہ انصاری، ابن عباس، براء بن عازب، حذیفہ، ابو ہریرہ، ابن مسعود اور عامر بن لیلی شامل ہیں۔ ان سے منقولہ روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت غدیر کے دن علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں بعض روایات متعدد اسناد سے نقل ہوئی ہیں، جیسے ابوسعید خدری کی حدیث گیارہ حوالوں سے، ابن عباس کی حدیث بھی گیارہ حوالوں سے اور براء بن عازب کی حدیث تین ذرائع سے نقل ہوئی ہے۔جن مشہور علماء نے اس حدیث کو (تفصیلی یا اجمالی طور پر) اپنی کتب میں نقل کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

ا۔حافظ ابونعیم اصفہانی نے کتاب ''ما نُزِّلَ مِنَ القرآن فِی علی'' (الخصائص، صفحہ ۲۹ سے نقل کے مطابق)۔

۲۔ ابوالحسن واحدی نیشاپوری نے ''اسباب النزول'' صفحہ ۱۵۰۔

۳۔ابن عساکر شافعی (الدرالمنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۸ سے نقل کے مطابق)۔

۴۔فخر رازی نے تفسیر کبیر میں، جلد ۳، صفحہ ۶۳۶۔

۵۔ابواسحاق حموینی نے ''فرائد السمطین'' (مخطوطہ) میں۔

۶۔ابن صباغ مالکی نے ''فصول المھمہ'' صفحہ ۲۷ میں۔

۷۔جلال الدین سیوطی نے الدرالمنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۸ میں۔

۸۔قاضی شوکانی نے فتح القدیر، جلد ۳، صفحہ ۵۷ میں۔

۹۔شہاب الدین آلوسی شافعی نے ''روح المعانی'' جلد ۶، صفحہ ۱۷۲ میں۔

۱۰۔شیخ سلیمان قندوزی حنفی نے "ینابیع المودۃ" صفحہ ۱۲۰ میں۔

۱۱۔بدرالدین حنفی نے "عمدۃ القاری فی شرح صحیح البخاری" جلد ۸، صفحہ ۵۸۴ میں۔

۱۲۔شیخ محمد عبدہ مصری نے "تفسیر المنار" جلد ۶، صفحہ ۴۶۳ میں۔

۱۳۔حافظ ابن مردویہ (متوفی ۴۱۸ ہجری قمری) (الدر المنثور میں سیوطی کے نقل کے مطابق)۔

بہت سارے دیگر افراد نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ان میں سے بعض علماء روایت اور شان نزول کو نقل کرنے کے باوجود بعض وجوہات کی بنا پر جن کی طرف بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔اس آیت سے نہایت سادگی سے گزر گئے ہیں یا پھر اس پر اعتراضات کیے ہیں۔اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ صفحات میں ان کے اقوال پر بحث و تمحیص کریں گے۔

واقعۂ غدیر

گذشتہ گفتگو سے اجمالی طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بے شمار شواہد اور دلائل کے مطابق یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اور اس کے متعلق صرف اہل سنت کی معتبر کتابوں میں اس قدر روایات نقل ہوئی ہیں کہ کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔(شیعہ کتب اس کے علاوہ ہیں)

مذکورہ بالا روایات کے علاوہ روایات کی ایک بہت بڑی تعداد اور ایسی ہے جو واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ یہ آیت غدیر خم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ اور علیؑ کے بطور وصی اور ولی کے اعلان کے واقعے کے متعلق بیان ہوئی ہے۔ایسی روایات کی تعداد سابقہ روایات سے کئی گنا زیادہ ہے، یہاں تک کہ عظیم محقق علامہ امینی نے اپنی کتاب الغدیر میں حدیث غدیر کو ۱۱۰ صحابہ کرام سے معتبر اسناد اور ماخذ سے نقل کیا ہے۔اسی طرح ۸۴ تابعین اور ۳۶۰ مشہور اسلامی مصنفین اور مولفین سے اُسے بیان کیا ہے۔

ہر غیر جانب دار شخص جب مجموعی طور پر ان اسناد اور ماخذ پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ حدیث غدیر اسلامی روایات میں سے قطعی ترین حدیث ہے اور حدیث متواتر کا واضح ترین مصداق ہے، سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی اس کے متواتر ہونے میں شک کرئے تو پھر وہ کسی حدیث کے متواتر ہونے پر عقیدہ نہ رکھے۔چونکہ اس موضوع پر تفصیلی بحث ہمیں تفسیر موضوعی کی طرز تحریر سے خارج کر دے گی۔لہٰذا آیت کے شان نزول اور اس حدیث کی اسناد کے بارے میں اتنی گفتگو کافی ہے۔اب ہم اس حدیث کے مفہوم پر گفتگو کرتے ہیں اور جو کوئی اس حدیث کی اسناد پر مزید مطالعہ کرنا چاہتا ہے وہ درج ذیل کتب کا مطالعہ کرئے۔

۱۔الغدیر، جلد اول۔

۲۔احقاق الحق، تالیف علامہ قاضی نور اللہ شوشتری، تفصیلی شرح آیت اللہ نجفی، پہلی، دوسری، تیسری، چودھویں اور بیسویں جلد۔

۳۔المراجعات: مصنف شرف الدین عاملی۔

۴۔عبقات الانوار: مصنف عظیم عالم میر حامد حسین ہندی۔(بہتر یہ ہے کہ عبقات الانوار، جلد ۷، ۸ اور ۹ کو دیکھ لیا جائے)

۵۔ دلائل الصدق: مصنف بزرگ عالم شیخ مظفر، جلد دوم۔

روایات غدیر کا مفہوم

غدیر کے بارے میں منقولہ روایات سے مجموعی طور پر واقعہ غدیر کی جو تصویر سامنے آتی ہے اُسے مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ (البتہ بعض روایات نے اس واقعے کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے بعض نے نہایت مختصر انداز میں بیان کیا ہے، بعض نے اس واقعے کے ایک پہلو کو بیان کیا ہے اور بعض نے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالی ہے، مجموعی طور پر اِسے یوں بیان کیا جاتا ہے) رسول اکرمؐ کی حیات مبارکہ کے آخری سال میں حجۃ الوداع شان وشوکت اور کامل طریقے سے آنحضرتؐ کی موجودگی میں انجام پایا۔

دل، روحانیت اور معنویت کے جذبوں سے سرشار تھے اور اس عظیم عبادت کی معنوی لذت کا ذائقہ جانوں میں باقی تھا۔ اصحاب رسولؐ جن کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی [1] اس عظیم سعادت اور فیض کے نصیب ہونے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اس سفر میں صرف مدینے والے آنحضرتؐ کے ساتھ نہیں تھے بلکہ جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں کے مسلماں اس تاریخی سعادت وافتخار کو پانے کے لیے آنحضرت کے ہمراہ تھے۔ حجاز کا سورج پہاڑوں اور دروں پر اپنی آگ برسا رہا تھا لیکن اس بے مثال روحانی سفر کی لذت اور مٹھاس سب مشکلات کو آسان بنا رہی تھی۔ ظہر کا وقت قریب تھا آہستہ آہستہ جحفہ کی سرزمین اور پھر غدیر خم کا خشک اور تپتا ہوا میدان دور سے دکھائی دینے لگا۔

درحقیقت یہاں پر (اس زمانے میں) ایک چوراہا تھا جہاں سے عرب مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔ شمال کی طرف راستہ مدینے کی طرف جاتا تھا، مشرق کی جانب عراق کو اور مغرب میں راستہ مصر کو جاتا تھا اور جنوب کی طرف راستہ یمن کو جاتا تھا، اسی مقام پر اس عظیم سفر کی آخری یادگار چیز کو انجام پانا تھا اور اس کی اہم ترین فصل کو پایہ تکمیل تک پہنچنا تھا اور مسلمانوں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری پیغام اور حکم کو دریافت کر کے ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا۔ یہ درحقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیاب رسالت کا آخری مرحلہ تھا۔

ہجرت کا دسواں سال اور جمعرات کا دن تھا۔ عید قربان کو گزرے ٹھیک آٹھ دن ہو گئے تھے۔ اچانک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے سب کو ٹھہرنے کا حکم ملا۔ مسلمانوں نے آگے جانے والوں کو بلند آواز سے پیچھے کی طرف بلایا اور پیچھے رہ جانے والوں کے پہنچنے کا انتظار کیا، جونہی زوال کا وقت ہوا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موذن نے ''اللہ اکبر'' کی آواز سے لوگوں کو نماز ظہر کی طرف بلایا۔ لوگ جلدی سے نماز کے لیے تیار ہو گئے، لیکن گرمی اتنی شدید تھی کہ بعض افراد نے مجبوراً اپنی عبا کا سرا پاؤں کے نیچے دیا اور دوسرا سرا اپنے سر پر رکھا بصورت دیگر ریت کے انتہائی گرم ذرات اور سورج کی دھوپ ان کے پاؤں اور سروں کو جلا دیتی۔

اس میدان میں نہ کوئی سایبان تھا نہ کوئی سبزہ اور درخت، چند خشک قسم کے صحرائی درخت تھے جن کا کوئی خاص سایہ نہ تھا اور وہ گرمی اور

---

[1] رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ لوگوں کی تعداد، بعض نے نوے ہزار، بعض نے ایک لاکھ بارہ ہزار، بعض نے ایک لاکھ بیس ہزار اور بعض نے ایک لاکھ چوبیس ہزار لکھی ہے

سخت موسم کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کچھ لوگ انہی درختوں کے پاس پناہ لیے ہوئے تھے ان درختوں میں سے ایک پر کپڑا ڈال کر پیغمبر اکرم ﷺ کے لیے ایک سایباں بنایا گیا مگر گرم لو کے تھپیڑے اس سایے کے نیچے بھی دھوپ کی تپش بکھیر رہے تھے۔

نماز ظہر ختم ہو گئی مسلمان فوراً اپنے ہمراہ لائے ہوئے چھوٹے چھوٹے خیموں میں واپس جانا چاہتے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی طرف سے انہیں اطلاع دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے نئے حکم کو سننے کے لیے تیار ہو جائیں جو ایک مفصل خطبے کے دوران سنایا جائے گا، جو لوگ ذرا فاصلے پر تھے۔ وہ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے آنحضرتؐ کے نورانی چہرے کو نہیں دیکھ پا رہے تھے لہٰذا اونٹوں کے پلانوں سے ایک منبر تشکیل دیا گیا، پیغمبر اکرم ﷺ اس منبر پر جلوہ افروز ہوئے، سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالائے اور اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دیا پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر یوں فرمایا:

''میں بہت جلد دعوت الٰہی پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے چلا جاؤں گا، میں بھی ذمہ دار اور مسئول ہوں اور تم بھی ذمہ دار اور مسئول ہو۔ تم میرے بارے میں کس طرح گواہی دیتے ہو؟''

لوگوں نے با آواز بلند پکار کر کہا: ''نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ نَصَحْتَ وَ جَهَدْتَ فَجَزَاكَ اللّٰهُ خيراً۔'' یعنی: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے پیغام دیا، آپؐ نے ہماری خیر خواہی اور نصیحت کا حق ادا کر دیا اور ہماری ہدایت و راہنمائی کے لیے آپؐ نے پوری کوشش اور جہد و جہد کی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو جزئے خیر عطا فرمائے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اللہ کی وحدانیت، میری رسالت، قیامت کے دن کی حقانیت اور اُس دن مردوں کے اٹھ کھڑے ہونے کی گواہی دیتے ہو؟'' سب نے یک زبان ہو کر کہا: ہاں ہم گواہی دیتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ! گواہ رہنا!'' دوبارہ آپؐ نے فرمایا: ''اے لوگو! کیا میری آواز تم تک پہنچ رہی ہے؟ ۔۔۔'' انہوں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس کے بعد میدان میں سنسناٹا چھا گیا اور ہوا کی سنسناہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:

''۔۔۔ میں تمہارے درمیان دو گراں نقدر اور قیمتی چیزیں یادگار کے طور پر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ دیکھو ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو؟'' مجمع سے ایک شخص بولا: یا رسول اللہ! کونسی گرانقدر دو چیزیں؟! آپؐ نے فوراً فرمایا: ''پہلی ثقل اکبر، اللہ کی کتاب ہے جس کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے اسے تھام کے رکھنا تاکہ گمراہ نہ ہو جاؤ، دوسری اہم اور قیمتی چیز میری اہل بیت اور عترت ہے۔ اللہ جو کہ لطیف اور خبیر ہے، نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دو چیزیں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ یہاں تک کہ جنت میں مجھ سے ملحق ہو جائیں گی۔ ان دو سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔''

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول خداؐ اپنے ارد گرد دیکھ رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ جونہی آپ کی نگاہ مبارک علیؑ پر پڑی۔ آپؐ جھکے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا اور اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغل کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب نے انہیں دیکھا لیا اور پہچان لیا کہ یہ تو ہمیشہ فاتح رہنے والا اسلامی کمانڈر ہے۔ اس موقعہ پر پیغمبر اکرم ﷺ کی آواز پہلے سے زیادہ صاف اور اونچی ہوئی اور ارشاد فرمایا:

اَیُّھا النَّاسُ مَنْ اَوْلَی النَّاسِ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ

اے لوگو! مومنین پر ان سے بھی زیادہ کون حق رکھتا ہے؟!

لوگوں نے جواب دیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اللہ میرا مولی اور آقا ہے اور میں مومنوں کا ولی اور آقا ہوں، میں ان سے زیادہ ان کی جانوں پر حق رکھتا ہوں۔ (یعنی میرا ارادہ ان کے ارادے پر مقدم ہے)'' اس کے بعد فرمایا:

فَمَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ

جس کا میں مولا و آقا ہوں اس کا علی مولا اور آقا ہیں۔

اس جملے کو آپؐ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا اور بعض راویوں کے بقول چار مرتبہ بیان فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ نے آسمان کی طرف رخ کر کے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ والاہُ وعادِ مَنْ عاداہُ وَاَحِبَّ مَنْ اَحَبَّہُ وابْغِضْ مَنْ اَبْغَضَہُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَہُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَہُ وَ اَدِرِ الحَقَّ مَعَہُ حَیْثُ دارَ۔

''اے اللہ! تو اُسے دوست رکھ جو ان سے دوستی رکھے، دشمن رکھ اُسے جو ان کا دشمن ہو اُسے محبوب رکھ جو ان سے محبت کرتا ہو اور جو ان سے بغض رکھے تو بھی ان سے بغض رکھ، مدد کر اس کی جو ان کا مددگار ہو، تو بھی اس کی مدد نہ کر جو ان کو چھوڑ دے اور مدد نہ کرے، ان کو حق سے جدا نہ فرما اور جہاں علی ہوں وہاں حق کو پھیر دے۔''

پھر فرمایا:

الا فلیبلغ الشاھد الغائب۔

''آگاہ رہو! حاضرین، غائبین تک اس کی اطلاع پہنچا دیں۔''

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ ختم ہوا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علیؑ اور لوگ پسینہ سے شرابور تھے۔ ابھی مجمع کی صفیں درہم برہم نہیں ہوئی تھیں کہ جبرئیل امین نازل ہوئے اور اس آیت کو پیغمبر تک پہنچایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ .....

آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا۔۔۔۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ عَلٰی اِکْمالِ الدِّیْنِ وَ اِتْمامِ النِّعْمَۃِ وَ رَضَی الرَّبِّ بِرِسَالَتِی وَ الْوَلایَۃِ لِعَلِیٍّ مِنْ بَعْدِی

اللہ بڑا ہے، اللہ بڑا ہے، وہ اللہ جس نے اپنے دین کو مکمل اور اپنی نعمتوں کو ہم پر پورا کر دیا، اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت سے راضی و خوشنود ہو گیا۔

اس موقعہ پر لوگوں میں شور اٹھا اور وہ علیؑ کو اس منصب پر مبارکباد دینے لگے۔ جن سرکردہ افراد نے حضرت علیؑ کو مبارکباد پیش کی ان میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سرفہرست تھے اور انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ امیر المومنین علیؑ کو مبارکباد پیش کی:

بَخٍّ بَخٍّ لَكَ يَا ابْنَ اَبِي طالِبٍ اَصْبَحْتَ وَ اَمْسَيْتَ مَوْلايَ وَ مَولا كُلِّ مُؤمِنٍ و مُؤمِنَةٍ۔

اے ابوطالب کے بیٹے! مبارک ہو آپ کو، مبارک ہو آپ کو، میرے اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کے مولا و آقا بن گئے۔

اس موقعہ پر ابن عباس نے کہا: "خدا کی قسم یہ عہد و پیمان سب کی گردنوں پر باقی رہے گا۔" مشہور شاعر حسان بن ثابت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس موقعہ کی مناسبت سے شعر کہنے کی اجازت چاہی اور چند اشعار اپنی زبان پر جاری کیے:

يُنَادِيهِمْ يَومَ الغَدِيرِ نَبِيُّهُمْ
بِخُمٍّ وَاَسْمِعْ بِالرَّسُولِ مُنادِياً
فَقالَ فَمَنْ مَوْلاكُمْ وَ نَبِيُّكُمْ؟
فَقالُوا وَ لَمْ يَبْدُوا هُناكَ التَّعامِيا
اِلٰهُكَ مَوْلانا وَ اَنْتَ نَبِيُّنا
وَ لَم تَلْقِ مِنّا فى الْوَلَايَةِ عاصِياً
فَقالَ لَهُ قُمْ يا عَلِيُّ فَاِنَّنى
رَضيتُكَ مِنْ بَعْدى اِماماً و هادِياً
فَمَنْ كُنْتُ مَوْلاهُ فَهذا وَلِيُّهُ
فَكُونُوا لَهُ اَتْباعَ صِدْقٍ مُوالِيا
هُناكَ دَعا اَللّٰهُمَّ وَالِ وَلِيَّهُ
وَ كُنْ لِلَّذى عادا عَلَيّاً مُعادِيا

"ان کے نبی نے غدیر کے دن سرزمین خم پر انہیں پکارا اور وہ بلانے والا کس قدر صاحب عظمت ہے۔ انہوں نے فرمایا: تمہارا مولیٰ اور پیغمبر کون ہے؟ لوگوں نے کسی تامل اور جھجک کے بغیر واضح جواب دیا: آپ کا خدا ہمارا مولا ہے اور آپ ہمارے نبی ہیں اور ہم آپ کی ولایت و سرپرستی کے قبول کرنے میں ذرا

نافرمانی نہیں کریں گے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ سے کہا: اٹھ کھڑے ہوں میں نے تمہیں اپنے بعد امام اور ہادی منتخب کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا: جس کا میں مولا اور آقا ہوں یہ شخص اس کا مولا و آقا ہے پس تم سب اس کی صدق دِل کے ساتھ اتباع و پیروی کرو۔ اس موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی: بارالٰہا! اس کے دوست کو دوست رکھ اور اس کے دشمن سے دشمنی رکھ۔" [۱]

یہ تھا مشہور و معروف حدیث غدیر کا خلاصہ، جو اہل سنت اور شیعہ کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔

آیت تبلیغ کا ایک اور زاویے سے تجزیہ و تحلیل

اگر ہم ان تمام روایات جو اس آیت کے شان نزول کے متعلق آئی ہیں اور اس طرح واقعہ غدیر کے بارے میں منقولہ تمام روایات سے چشم پوشی کر لیں اور صرف اِس آیت اور اس کے بعد والی آیات کے مفہوم اور معنی میں غور و فکر کریں تو ہم ان آیات کے عمق اور بطن سے مسئلہ خلافت اور جانشینی رسولؐ کو حل کر سکتے ہیں اس حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کا تعین کر سکتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ مذکورہ آیات میں استعمال ہونے والے مختلف الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ یہ آیت ایک ایسے مسئلہ کی نشاندہی کر رہی ہے جو ان تین اہم خصوصیات کا حامل ہے۔

۱۔ یہ مسئلہ اسلام کی نظر میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے چونکہ اس کے پہنچانے کا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا اور اسے نہ پہنچایا تو رسالت الٰہی کو نہیں پہنچایا، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ یہ مسئلہ نبوت کے ہم پلہ تھا، کہ اگر اِسے انجام نہ دیا تو تو رسول خداؐ کی رسالت نامکمل رہتی ہے۔ (وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَما بَلَّغْتَ رِسالَتَہُ) بہت واضح ہے کہ مقصود یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی عام اور معمولی فرمان خدا تھا اور ہر حکم الٰہی اگر نہ پہنچے تو رسالت ہی نہیں پہنچی، کیونکہ یہ بات واضح کی توضیح کے مترادف ہے اور اسے بیان کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ خاص اہمیت کا حامل ہے جس کا نبوت و رسالت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

۲۔ یقیناً یہ مسئلہ نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ اور اس طرح کے دیگر اسلامی تعلیمات سے مربوط نہیں تھا، کیونکہ یہ آیت سورہ مائدہ کی ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ سورہ مائدہ آخری صورت ہے جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی ہے (یا آخری سورتوں میں سے ہے) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک کے آخری حصے میں نازل ہوئی ہے جب کہ اس وقت تک اسلام کے تمام اہم ارکان بیان ہو چکے تھے۔ [۲]

---

[۱] اہل سنت کے بعض بزرگ دانشوروں نے یہ اشعار نقل کیے ہیں کہ جن میں: حافظ "ابونعیم" اصفہانی، حافظ "ابوسعید سجستانی"، خوارزمی مالکی، حافظ، ابوعبداللہ مرزبانی، گنجی شافعی، جلال الدین "سیوطی" سبط ابن جوزی، اور صدرالدین حموی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

[۲] فخر رازی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اصحاب آثار (راویان حدیث اور سیرت نگاروں) نے لکھا ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو اس کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف ۸۱ یا ۸۲ دن زندہ رہے (تفسیر کبیر: جلد ۱ صفحہ ۱۳۹) تفسیر المنار اور بعض دوسری کتب میں آیا ہے کہ تمام سورہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ (لمنار جلد ۶ ص ۱۱۶) البتہ بعض نے دنوں کی تعداد مذکورہ تعداد سے بھی کم ہے۔

۳۔ آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ آیت کے پیش نظر جو مسئلہ تھا وہ ایسا تھا کہ بعض افراد کا اس کے خلاف سخت موقف تھا یہاں تک کہ اس کی وجہ سے پیغمبر خدا کی جان کو خطرہ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی اس بارے میں خاص حمایت کا اعلان فرماتا ہے اور آپؐ سے ارشاد فرماتا ہے: ''اللہ تعالیٰ آپؐ کو (لوگوں کے ممکنہ خطرات سے) محفوظ رکھے گا۔'' (وَ اللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النّاس)۔ اس کے بعد آیت کے آخر میں تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''اللہ تعالیٰ کافروں کے گروہ کو ہدایت نہیں کرتا۔'' (اِنَّ اللّٰہَ لا یَھْدِی الْقَوْمِ الْکافِرِیْنَ)۔ یہ الفاظ کچھ مخالفین کے منفی ردعمل اور موقف پر ایک اور دلیل پیش کر رہے ہیں۔

ان تین جہتوں سے مجموعی طور پر یہ واضح نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ اس آیت سے خلافت اور جانشینی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہے اس کے علاوہ کوئی اور چیز مقصود نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر کے آخری حصے میں ایسی چیز ہی بڑی اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے اور زیر بحث آسکتی ہے نہ کہ دیگر اسلام کے ارکان، جو اس وقت تک پورے طور پر بیان ہو چکے تھے۔ یہ وہ چیز ہے جو نبوت کے ہم پلہ اور برابر ہو سکتی ہے اور یہی وہ مسئلہ ہو سکتا ہے جس کے اظہار سے مخالفتیں جنم لے سکتی تھیں اور خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔

مذکورہ آیت کی امامت و ولایت اور خلافت کے موضوع کے علاوہ جو بھی تفسیر کی جائے وہ آیت سے میل نہیں کھاتی۔ آپ ان تمام مفسرین کی آراء کا مطالعہ کریں جو اس آیت کے مفہوم کو دوسرے مسائل کی طرف موڑنا چاہتے تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی آیت کی تاکیدات کے حساب سے ایسا مطلب پیش نہیں کر سکا جو آیت کے مناسب ہو، درحقیقت وہ اس کی تفسیر سے قاصر رہے۔

چند وضاحتیں

ا۔ حدیث غدیر میں ولایت اور مولا کا مطلب:

ہم نے حدیث غدیر جو کہ متواتر ہے کو اجمالی طور پر جان لیا۔ اس حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور جملہ (من کنت مولا ہ فعلی مولاہ) جو کہ تمام کتابوں میں بیان ہوا ہے، بہت سارے حقائق کو واضح کرتا ہے، اگرچہ بہت سے اہل سنت مصنفین نے بہت زیادہ زور لگایا ہے کہ یہاں پر ''مولا'' کا معنی دوست، یار، مددگار کیا جائے۔ کیونکہ ''مولیٰ'' کے معانی میں سے ایک مشہور معنی یہی ہے۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ ''مولا'' کا ایک معنی دوست، یار اور مددگار ہے لیکن متعدد قرائن اور شواہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا حدیث میں مولا کا معنی ولی، راہنما اور سرپرست کے ہیں، ان قرائن کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا رہا ہے۔

ا۔ علیؑ کی تمام مومنین کے ساتھ دوستی کی بات کوئی پوشیدہ، خفیہ یا پیچیدہ مسئلہ نہ تھا کہ اُسے بیان کرنے کے لیے اتنے اہتمام اور تاکیدات کی ضرورت تھی، یہ اس قدر اہم معاملہ نہ تھا جس کے لیے اتنے بڑے قافلے کو سخت گرمی میں خشک و بیابان میدان میں روکا جاتا، خطبہ دیا جاتا اور مجمع سے پے در پے اعترافات لیے جاتے۔ قرآن بڑے واضح انداز میں فرماتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤمِنُونَ اِخْوَۃ۔ یعنی: تمام مومنین آپس میں بھائی ہیں۔ (حجرات/۱۰) ایک اور مقام پر فرماتا ہے: ''و الْمُؤمِنُونَ و الْمُؤمِناتُ بَعْضُھُم اَوْلِیاءُ بعضٍ'' یعنی: ''مومن

مرد اور مومنہ عورتیں ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔'' (توبہ/۷۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک دوسرے سے برادری اور اخوت اسلامی، اسلام کی بدیہی ترین تعلیمات میں سے ہے جو اسلام کے آغاز سے موجود تھی، پیغمبر اکرم ﷺ کئی بار اس مسئلہ کی تبلیغ کر چکے تھے اور اس پر تاکید فرما چکے تھے۔ اس کے علاوہ یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہ تھا کہ آیت میں اتنے سخت لہجہ میں بیان کیا جاتا اور رسول خدا ﷺ اس کے اظہار کرنے میں خطرہ محسوس کرتے (غور کیجیے گا)

۲۔ اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ ''

''کیا میں تمہاری نسبت تم سے زیادہ تمہاری جانوں پر حق نہیں رکھتا''

یہ جملہ بہت سی روایات کے متون میں آیا ہے اور کسی لحاظ سے بھی عام اور معمولی دوستی کے بیان کرنے سے مربوط اور ہم آہنگ نہیں ہے، بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ وہی اختیار اور اولویت جو میں تم پر رکھتا ہوں جس طرح میں تمہارا پیشوا اور سرپرست ہوں، یہ سب کچھ علیؑ کے لیے ہے اس جملے کی مذکورہ مطلب کے علاوہ جو بھی تشریح کی گئی ہے وہ حقیقت سے دور اور ناانصافی ہے، خصوصاً ''من انفسکم'' کے لفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے (جس کا مطلب یہ ہے میں تم پر تم سے بھی زیادہ حق رکھتا ہوں)

۳۔ اس تاریخی واقعہ میں حضرت علیؑ کو جو مبارکبادیں گئیں خصوصاً حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے جو مبارک باد دی، یہ ثابت کرتی ہیں یہ مسئلہ خلافت کی تعیینی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا، جس کے لیے تبریک وتہنیت کو ضروری سمجھا گیا کیونکہ اگر مسئلہ دوستی کو بیان کرنا ہوتا جو کہ تمام مسلمانوں کے لیے عمومی لحاظ سے ثابت ہے، تو مبارکباد دینے کا کوئی تک نہیں بنتا مسند ''امام احمد'' میں آیا ہے کہ رسول خدا ﷺ کے بیان کے بعد حضرت عمر نے علیؑ سے کہا:

هنیئاً یَابْنَ اَبِي طالِبٍ اَصْبَحْتَ وَ اَمْسَیْتَ مَولی کُلِّ مُؤمِنٍ و مُؤمِنَةٍ

مبارک ہو تمہیں اے ابوطالب کے بیٹے! آپ ہر مومن مرد اور مومنہ عورت کے مولا بن گئے۔ [۱]

امام فخر رازی نے ''ایها الرَّسولُ بَلِّغ ما انزل اِلَیْكَ'' کی تفسیر میں جو الفاظ ذکر کیے ہیں، ان کے مطابق حضرت عمر نے کہا: ''هنیئاً لَكَ اَصْبَحْتَ مَوْلایَ و مَولی کُلِّ مُؤمِنٍ و مؤمِنَةٍ۔'' یعنی: مبارک ہوائے علی! آپ میرے اور ہر مؤمن ومؤمنہ کے مولا بن گئے۔'' اس طرح حضرت عمر نے حضرت علیؑ کو اپنا اور تمام مومنین کا مولا تسلیم کیا ہے۔ تاریخ بغداد میں روایت اس طرح آئی ہے:

بَخٍّ بَخٍّ لَكَ یَابْنَ اَبی طالِبٍ! اَصْبَحْتَ مَوْلایَ وَمَوْلی کُلِّ مُسْلِمٍ

''واہ واہ اے ابوطالب کے فرزند! آپ میرے اور ہر مسلمان کے مولا ہو گئے۔'' [۲]

---

[۱] مسند احمد، جلد ۴، صفحہ ۲۸۱ (فضائل الخمسہ ج۱، ص ۴۳۲ کے مطابق)

[۲] تاریخ بغداد، جلد ۷، صفحہ ۲۹۰۔

فیض القدیر اور الصواعق میں ذکر ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں نے علیؑ کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا ہے: "اَمْسَیْتَ یَابْنَ ابی طالِبٍ مَوْلا کُلِّ مُؤمِنٍ وَمُؤمِنَةٍ۔"[1] معلوم ہے کہ مومنین کے درمیان عام اور سادہ دوستی کے لیے اس قسم کے تکلفات کی ضرورت نہیں، اس کا تعلق ولایت بمعنی خلافت کے ساتھ ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں ہوسکتا۔

۴۔ حسان بن ثابت کے اشعار جنہیں ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، اپنے مفہوم و مطلب کی وضاحت اور صراحت کے ساتھ ہمارے مدعی پر ایک اور دلیل ہیں اور کافی حد تک اس مطلب کو واضح کرتے ہیں۔ (دوبارہ ان اشعار کا مطالعہ کریں)

واقعہ غدیر کی تائید میں قرآن کی دیگر آیات

سورہ معارج کا آغاز ان آیات سے ہوتا ہے:

سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾

ایک مانگنے والے نے واقع ہونے والے عذاب کا تقاضا کیا، کفار کے لیے اُسے کوئی ٹالنے والا نہیں، بلندیوں کے مالک اللہ کی طرف سے ہے (وہ خدا جس کے ملائکہ آسمانوں کی طرف اوپر چڑھتے ہیں)

ان آیات کی تشریح میں بہت سے مفسرین اور راویان حدیث نے ایک شان نزول بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب غدیر خم میں علیؑ کی خلافت کا اعلان کیا اور ان کے بارے میں فرمایا: "مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلاہُ" تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ "نعمان بن فہری" (جو کہ منافق تھا)[2] حضور اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: آپ نے ہمیں اللہ کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی گواہی دینے کا حکم دیا، ہم نے اس کی شہادت دی، اس کے بعد آپ نے ہمیں نماز، زکوۃ، حج اور جہاد کا حکم دیا، ہم نے ان سب کو مانا، لیکن آپؐ اس پر راضی نہ ہوئے، یہاں تک کہ اس جوان (علی - کی طرف اشارہ کیا) اپنا جانشین بنا دیا اور آپ نے کہا: "مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلاہُ" کیا یہ کام آپ نے اپنی مرضی سے کیا ہے یا خدا کی طرف سے حکم تھا؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، یہ اللہ کی طرف سے حکم تھا۔"

نعمان بن حارث پیچھے مڑا اور اس نے کہا:

"اے اللہ! اگر یہ بات سچ ہے اور تیری طرف سے ہے تو آسمان سے مجھ پر پتھر برسا!"

اچانک آسمان سے ایک پتھر آیا اور اس کے سر پر لگا، اور وہ ہلاک ہوگیا، اس موقعہ پر "سَئَلَ سائل بعذاب واقع" نازل ہوئی۔

---

[1] فیض القدیر، جلد ۶ صفحہ ۲۱۷، صواعق، صفحہ ۱۰۷۔

[2] بعض روایات میں "حارث بن نعمان" اور بعض میں "نضر بن حارث" آیا ہے

مذکورہ بالا مطلب اس روایت کے مطابق ہے جو مجمع البیان میں ابوالقاسم حسکانی سے نقل ہوئی ہے۔[1]

اسی بات کو بہت سارے سنی مفسرین اور روایان حدیث نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان کیا ہے، مثال کے طور پر قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر[2] میں، آلوسی نے تفسیر روح المعانی[3] اور ابواسحاق ثعلبی نے اپنی تفسیر[4] میں اسے جگہ دی ہے۔ علامہ امینی، اپنی کتاب الغدیر میں اس روایت کو اہل سنت کے تیس علماء سے (عین عبارت کو حوالے کے ساتھ) نقل کیا ہے ان میں سے سیرہ حلبی، حمونیی کی ''فرائد السمطین''، شیخ محمد زرندی کی درر السمطین، شمس الدین شافعی کی السراج المنیر، سیوطی کی شرح جامع الصغیر، حافظ ابوعبید هروی کی تفسیر غریب القرآن ابوبکر نقاش موصلی کی تفسیر شفائی الصدور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بعض مفسرین یا محدثین جن پر علیؑ کے فضائل ناگوار گزرتے ہیں اور وہ ان کے فضائل آسانی سے قبول نہیں کرتے، انہوں نے اس شان نزول پر مختلف اعتراضات کیے ہیں ان میں سے چار اہم ترین اعتراضات درج ذیل ہیں جنہیں تفسیر المنار کے مصنف اور بعض دوسرے افراد نے مذکورہ روایت کو نقل کرنے کے بعد بیان کیے ہیں۔

پہلا اعتراض: سورہ معارج مکی ہے اور اس کا واقعہ غدیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جواب: کسی سورت کا مکی ہونا اس بات کی قطعاً دلیل نہیں ہے کہ اس کی تمام آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں قرآن مجید میں متعدد ایسی سورتیں موجود ہیں جنہیں مکی کہا گیا ہے اور قرآن میں انہیں مکی لکھا گیا ہے لیکن ان کی کچھ آیات مدینے میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے برعکس بعض سورتیں قرآن میں مدنی ہیں لیکن ان کی کچھ آیات مکی ہیں۔

مثال کے طور پر سورہ عنکبوت، مکی سورتوں میں سے ہے جب کہ طبری، قرطبی اور دیگر مفسرین کے بقول، اس کی پہلی دس آیات مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔[5]

اس طرح سورہ کہف ہے جو کہ مکی ہے جب کہ قرطبی اور سیوطی کی تفسیروں کے مطابق اس کی پہلی سات آیات مدینے میں نازل ہوئی ہیں اور اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں[6] سی طرح سے کئی سورتیں مدنی ہیں۔ جب کہ ان کی چند آیات مکی ہیں جیسے معروف قول کے مطابق سورہ مجادلہ مدنی ہے جب کہ بعض مفسرین نے صریحاً کہا ہے کہ اس کی پہلی دس آیات مکے میں نازل ہوئی ہیں۔[7]

---

[1] مجمع البیان، جلد ۹، ۱۰ صفحہ ۳۵۲

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ صفحہ ۵۷، ۶۷

[3] مجمع البیان، جلد ۲۹، ۱۰ صفحہ ۵۲

[4] نورالابصار شبلجنی کے نقل کے مطابق ص ۷۱

[5] تفسیر طبری پارہ نمبر ۲۰، صفحہ ۸۶، تفسیر قرطبی، پارہ ۱۳، صفحہ ۳۲۳

[6] اس موضوع پر مزید معلومات کیلئے کتاب الغدیر صفحہ ۲۵۶ اور ۲۵۷ کا مطالعہ کریں۔

[7] ابوالسعود کی تفسیر جو فخر رازی کی تفسیر کے حاشیے پر لکھی ہوئی ہے، پارہ ۸، صفحہ ۱۴۸، اور السراج المنیر، جلد ۴، صفحہ ۳۱۰۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہت سارے مقامات پر سورتیں مکی یا مدنی بتائی گئی ہیں اور قرآن اور تفسیروں میں ان کے ساتھ اور صفحات کے اوپر عنوان یہی تحریر کیا جاتا ہے جب کہ ان کی کچھ آیات کسی اور مقام پر نازل ہوئی ہوتی ہیں۔ لہٰذا کوئی مانع نہیں ہے کہ سورہ معارج بھی ایسی سورتوں میں سے ایک ہو۔

دوسرا اعتراض: اس حدیث کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ حارث بن نعمان ''ابطح'' میں رسول خدا ﷺ کے پاس آیا اور مسلم ہے کہ ''ابطح'' مکہ میں ایک درے کا نام ہے، اس لیے واقعہ غدیر کے بعد، مکہ اور مدینہ کے درمیان اس آیت کے نزول کے ساتھ اس حدیث کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ''ابطح'' کا لفظ بعض روایات میں آیا ہے نہ کہ سب روایات میں، دوسری بات یہ ہے کہ ابطح اور بطحاء ایسی ریتلی زمین کو کہتے ہیں جہاں پر سیلاب جاری ہوتا ہو مدینے اور دیگر علاقوں میں ایسی جگہیں موجود ہیں جنہیں ابطح یا بطحا کہا جاتا ہے اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ روایات میں عربی اشعار میں اس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک مثال شہاب الدین (**المعروف حیص بیص**) کے مشہور اشعار ہیں جو اُس نے اہل بیت - کے مرثیے کے طور پر کہے ہیں۔ ان اشعار میں ان پاکیزہ ہستیوں کی زبانی اپنے قاتلین سے خطاب کو اس نے بیان کیا ہے:

مَلَكْنَا فَكَانَ العَفْوُ مِنَّا سَجِيّةً
فَلَمّا مَلَكْتُمْ سالَ بِالدّمِ اَبْطَحُ
و حَلَّلْتُمْ قَتْلَ الاسارى و طَالَمَا
غَدَوْنَا عَنِ الاَسْرىٰ نَعْفُوا و نَصْفَحُ

ہم نے حکومت کی (پیغمبر اکرم ﷺ کی فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے) معاف کر دینا ہماری عادت اور فطرت تھی (آنحضرتؐ کا عام معافی کا اعلان) لیکن جب تم اقتدار پر آئے ہو ابطح میں خون جاری ہو گیا اور تم نے قیدیوں کے قتل کو حلال سمجھا جب کہ ہم اسیروں کو معاف کر دیتے تھے۔

انتہائی واضح ہے کہ آل رسول ﷺ کے بزرگوں کا قتل زیادہ تر عراق و کربلا، کوفہ اور مدینے میں ہوا ہے اور مکہ میں ابطح کے مقام پر کوئی خون نہیں ہوا ہے، البتہ اہل بیتؑ کے بعض افراد کو فخ کے مقام پر خاک و خون میں غلطان کیا گیا، یہ مقام مکہ سے دو فرسخ (تقریباً ۹ کلومیٹر) کے فاصلے پر ہے جب کہ ابطح مکہ کے پاس ہے۔[1]

سید الشہداؑ حضرت امام حسین - کے مرثیے میں ایک اور شاعر یوں کہتے ہیں:

وَ تَأَنُّ نَفسى لَلرَّبُوعِ وَ قَدْ غَدَا

[1] الغدیر، جلد ا، صفحہ ۲۵۵

بَيْتَ النَّبِيِّ مُقَطَّعُ الْاَطْنَابِ
بَيتُ لِآلِ الْمُصْطَفٰى فِي كَرْبَلَا
ضَرَبُوهُ بَيْنَ اَبَاطِحٍ وَ رَوَابِي

میرا نفس نبی اکرم ﷺ کے ویران گھروں کے باقی ماندہ آثار پر آہ و فریاد کرتا ہے

بالخصوص آل مصطفی کے وہ گھر جو کربلا تھے جو ابطحا اور ٹیلوں کے درمیان برپا ہوئے تھے

(ابطح کا معنیٰ وہ زمین ہے جہاں ریت اور چھوٹی کنکریاں ہوں اور رابیہ کا معنیٰ اونچے ٹیلے ہیں)

اس طرح کہ دیگر بہت سے اشعار ہیں جن میں ''ابطح'' یا ''اباطح'' کے الفاظ آئے ہیں جن کا مطلب مکہ کا خاص علاقہ قطعاً نہیں ہے۔مختصر یہ کہ ابطح کا ایک معنی ،مکہ کا خاص علاقہ ہے لیکن ابطح کا مفہوم اور مصداق اس علاقے میں منحصر نہیں ہے۔

۳۔اِس آیت کا ماقبل اور مابعد کے ساتھ کیا تعلق اور ارتباط ہے؟

بعض مفسرین نے اس آیت میں موجود حقیقت سے پہلوتہی کرنے کے لیے ایک اور بہانہ تلاش کیا ہے اور وہ یہ کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد والی آیات اہل کتاب کے بارے میں ہیں لہٰذا اس آیت کا امامت وولایت اور خلافت کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس قسم کی دوگانگی قرآن کی فصاحت و بلاغت کے منافی ہے۔[1]

وہ افراد جو قرآن کی آیات کی جمع آوری کی کیفیت سے مطلع ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن کی آیات تدریجاً اور مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں،اس دلیل کی بنا پر ایک سورت مختلف موضوعات پر بات کرتی ہے،اس کی بعض آیات اگر کسی غزوہ کے متعلق ہیں تو بعض آیات کسی اسلامی حکم کو بیان کرتی ہیں،بعض منافقین کی بات کرتی ہیں تو بعض مومنین سے مخاطب ہوتی ہیں،مثال کے طور پر اگر ہم سورہ نور کو مدنظر رکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے مختلف حصے ہیں،ان میں سے ہر حصہ ایک مطلب کو بیان کر رہا ہے،توحید اور قیامت سے لے کر حد زنا کے اجراء ''واقعہ افک'' منافقین کے متعلق مسائل اور پردے کے متعلق احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔(قرآن کی دیگر سورتوں کی بھی کم و بیش یہی صورتحال ہے)اگرچہ ایک سورت کے مختلف اجزاء کے درمیان کلی طور پر ایک رابطہ اور تعلق ضرور موجود ہوتا ہے۔

سورت کے مطالب اور مفاہیم میں تنوع کی دلیل وہی ہے جو بیان کی جا چکی ہے کہ قرآن تدریجی طور پر،ضرورت اور احتیاج کے مطابق اور مختلف واقعات کے حوالے سے نازل ہوا ہے یہ ایک مروج اور روایتی کتاب ہرگز نہیں ہے جو پہلے سے معین ایک ہی موضوع پر بحث و گفتگو کرے،اس بنا پر کوئی حرج نہیں ہے کہ سورہ مائدہ کا ایک حصہ اہل کتاب کے بارے میں ہو اور کچھ حصہ واقعہ غدیر کے متعلق نازل ہوا ہو،البتہ ایک لحاظ سے بطور کلی ان دو کا آپس میں تعلق بھی ہے،پیغمبر اکرم ﷺ کے جانشین کے تعین سے اہل کتاب کے معاملات پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے،کیونکہ یہ مسئلہ ان کے لیے اس بات سے مایوسی کا باعث بنے گا کہ رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اسلام ختم ہو جائے گا۔

---

[1] تفسیر المنار،جلد ۶،صفحہ ۴۶۶۔

۴۔علی - نے حدیث غدیر سے کیوں استدلال نہ فرمایا: کچھ اور حیلہ گروں کا کہنا ہے کہ اگر حدیث غدیر اتنی عظمت کے ساتھ حقیقت رکھتی ہے تو پھر حضرت علی، اہل بیت ÷ ان کے اصحاب اور چاہنے والوں نے مختلف مقامات پر اس سے استدلال کیوں نہیں کیا؟ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ علیؑ کی بلافصل خلافت کو ثابت کرنے کے لیے اس اہم دلیل اور سند کو پیش کرتے؟!

یہ اعتراض بھی دوسرے بہت سارے اعتراضات کی طرح حدیث، تاریخ اور تفسیر کی کتب سے ضروری معلومات نہ ہونے کی بنا پر ہے، کیونکہ اہل سنت کے علماء کی کتابوں میں بہت سی جگہوں پر نقل ہوا ہے کہ خود حضرت علیؑ یا ائمہ اہل بیت ÷ یا ان کے چاہنے والوں نے حدیث غدیر کو بطور دلیل پیش کیا ہے، تعجب اس بات پر ہے کہ اعتراض کرنے والوں کو یہ چیزیں کیوں نظر نہیں آئیں۔

خطیب خوارزمی حنفی اپنی کتاب ''مناقب'' میں عامر بن واثلہ سے نقل کرتے ہیں کہ شوریٰ والے دِن (شوریٰ چھ افراد پر مشتمل تھی جو حضرت عمر کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے مقرر کی گئی تھی) میں علی - کے ہمراہ تھا میں نے سُنا کہ وہ شوریٰ کے باقی ارکان سے کہہ رہے تھے: میں تمہارے سامنے ایسی محکم اور پختہ دلیل پیش کرتا ہوں عرب وعجم میں اس کا جواب دینے کی سکت نہیں ہے۔۔۔۔تمہیں اللہ کی قسم! کیا تمہارے درمیان میرے علاوہ کوئی ایسا شخص ہے جس کے حق میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہو: ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ والاهُ وانصر مَنْ نَصَرَهُ لِيُبَلِّغِ الشّاهِدُ الغائِبَ۔'' سب نے جواب دیا: ''نہیں''۔[1]

اس روایت کو حموینی نے فرائد السمطین، باب نمبر ۵۸ میں، ابن حاتم نے ''دُرالنظیم'' اور ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن حجر نے صواعق میں دار قطنی سے اسی مطلب کو بیان کیا ہے۔[2] ''الغدیر'' میں مختلف مقامات پر امیر المومنین علیؑ کے ''مناشدہ'' استدلال پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ خاص طور پر حضرت عثمان کے دور میں، اپنے دور خلافت میں، جنگ جمل میں، دوبارہ کوفہ اور جنگ صفین میں ان کے استدلالات کو وسیع اور متعدد اسناد اور حوالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، علاوہ ازیں حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا، امام حسن مجتبیٰ، امام حسین - سید الشہداء اور چند اصحاب وغیرہ اصحاب سے سولہ مقامات پر استدلال کو ذکر کیا گیا ہے یہ سب ایک لحاظ سے اس عظیم مصنف کی وسیع معلومات اور مطالعے پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے لحاظ سے یہ ثابت کرتا ہے کہ جس حدیث سے استدلال مختلف صدیوں سے قابل توجہ رہا ہے اگرچہ ہر دور میں یہ موضوع خاص قسم کی سیاست کا شکار رہا ہے، جس کے تحت حتی المقدور یہ کوشش کی گئی کہ یہ مسئلہ اہمیت اختیار نہ کرنے پائے۔

اس امر کے پیش نظر کہ اس قسم کی وسیع بحثوں میں پڑنا ہمیں مطلوبہ ہدف سے دور کر دے گا لہٰذا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے خواہش مند افراد کو اُسی کتاب[3] یا دیگر کتابوں کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

---

[1] مناقب، صفحہ ۲۱۷

[2] الغدیر، جلد ا صفحہ ۱۶۱

[3] الغدیر، جلد ا صفحہ ۱۵۹ تا صفحہ ۲۱۳

۲۔آیت ولایت

ایک اور آیت جو امامت خاصہ کے موضوع کو بیان کرتی ہے، وہ آیت ولایت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ﴿۵۵﴾ (مائدہ/ ۵۵)

''تمہارا ولی سر پرست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔''

شان نزول

بہت سارے محدثین اور مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ سیوطی نے الدرالمنثور میں اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ علیؑ رکوع کی حالت میں تھے ایک سائل نے مدد کا سوال کیا، انہوں نے اپنی انگوٹھی سائل کو صدقے میں عطا کر دی، رسول خدا ﷺ نے پوچھا یہ انگوٹھی تمہیں کس نے صدقہ دی ہے؟ اس نے علیؑ کی اطرف اشارہ کیا اور بتایا کہ اُس رکوع میں کھڑے شخص نے دی ہے، اس موقعہ پر یہ آیت 'انما ولیکم اللہ ورسولہ ----' نازل ہوئی۔ [1]

اسی کتاب میں اور بھی متعدد روایات درج ہوئی ہیں جو اسی معنی اور مفہوم کو ابن عباس، سلمۃ بن کھیل اور خود حضرت علیؑ سے نقل کرتی ہیں۔ [2] یہی مطلب واحدی کی اسباب النزول میں جابر بن عبداللہ اور ابن عباس سے بیان ہوا ہے۔ [3] مشہور مفسر جاراللہ زمخشری تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں: ''یہ آیت علیؑ کے بارے میں اس موقعہ پر نازل ہوئی ہے جب ایک سوالی نے سوال کیا اور وہ رکوع کی حالت میں تھے، انہوں نے اپنی انگوٹھی اس کی طرف بڑھا دی۔'' [4]

فخر رازی اپنی تفسیر میں عبداللہ بن سلام سے نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، میں نے رسول خدا ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے حضرت علیؑ نے رکوع کے دوران اپنی انگوٹھی سائل کو بطور صدقہ دی، اسی دلیل کی بنیاد پر ہم اس کی ولایت کو قبول کرتے ہیں۔ نیز وہ حضرت ابوذر سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ایک دِن میں ظہر کی نماز پیغمبر اکرم ﷺ کے

---

[1] تفسیر الدالمنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۳

[2] تفسیر الدالمنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۳

[3] اسباب النزول، صفحہ ۱۴۸

[4] تفسیر کشاف، ج ۱، صفحہ ۶۴۹۔

ساتھ پڑھ رہا تھا کہ مسجد کے دروازے پر کسی سوالی نے آ کر مدد کرنے کا سوال کیا، کسی نے اُسے کوئی چیز نہ دی، سوالی نے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر عرض کیا:

اے اللہ! گواہ رہنا میں نے تیرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد میں سوال کیا ہے کسی نے مجھے کوئی چیز نہیں دی، حضرت علیؑ اس وقت نماز کی حالت میں تھے اپنے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی طرف اشارہ کیا جس میں انگوٹھی تھی، سائل آیا اور اس نے آنحضرتؐ کی آنکھوں کے سامنے انگوٹھی کو اتار لیا۔ اس پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہ ایز دی میں عرض کیا:

''بار االہا! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے مانگا کہ میرا سینہ کھول دے۔۔۔۔ اور میرے بھائی ہارون کو نبوت کے امور میں میرے ساتھ شریک فرما! تو نے ان سے فرمایا: میں جلد ہی تیرے بھائی کے ذریعے تیرے بازو کو مضبوط اور قوی کروں گا اور تمہارے لیے طاقت اور غلبہ قرار دوں گا۔ تو اے اللہ! میں محمد تیرا رسول اور برگزیدہ ہوں، میرے سینے میں وسعت عطا فرما اور میرے لیے میرے کاموں کو آسان فرما اور میرے لیے میرے اہل بیت میں سے وزیر قرار دے اور اس کے ذریعے میری پشت کو مضبوط اور قوی فرما!''

ابوذر کہتے ہیں: خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ جبرئیل - نازل ہوئے اور کہا: ''اے محمد! پڑھیں: 'انما ولیکم الله ورسوله...''[1]۔ البتہ اس شان نزول کو نقل کرنے کے بعد حسب معمول فخر رازی نے اعتراضات کیے ہیں کہ یہ آیت امامت کے مسئلہ پر کیسے دلالت کرتی ہے، انہیں بعد میں ہم ذکر کریں گے۔

طبری نے بھی اپنی تفسیر میں اس آیت کے شان نزول اور تفسیر میں متعدد روایات ذکر کی ہیں جن میں اکثر یہی بیان کرتی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[2] علما کے ایک اور بہت بڑے گروہ نے اسی روایت کو مختلف الفاظ کے ساتھ علیؑ کی شان میں بیان کیا ہے جیسے کنز العمال کی جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۳۱۹ پر اس روایت کو ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے۔

اسی طرح پانچویں صدی ہجری کے معروف عالم حاکم حسکانی حنفی نیشاپوری نے اپنی کتاب شواہد التنزیل میں پانچ ذرائع سے ابن عباس، دو ذرائع سے انس بن مالک، دو ذرائع سے محمد بن حنفیہ ایک ذریعے سے عطا بن السائب اور ایک ذریعے سے عبد الملک بن جریح مکی سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آیت: ''انما ولیّکم الله و رسوله...'' حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے رکوع کی حالت میں انگوٹھی سائل کو عطا کی ہے۔

علامہ امینی نے مذکورہ حدیث اور اس آیت کے علیؑ کی شان میں نازل ہونے کے متعلق اہل سنت کی بہت ساری کتابوں سے

---

[1] تفسیر الکبیر فخر رازی، جلد ۱۲، صفحہ ۲۶

[2] تفسیر طبری، ج ۶، صفحہ ۱۸۶،

نقل کیا ہے تقریباً بیس کتابوں کے مستند حوالے انہوں نے ذکر کیے ہیں، مزید مطالعے کے خواہش مند افراد ان کی کتاب الغدیر کو دیکھیں [1]
کتاب احقاق الحق میں یہی مطلب اس سے زیادہ کتب سے نقل کیا گیا ہے۔[2]
قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے مشہور شاعر حسان بن ثابت نے اس مطلب کو ایک مسلمہ تاریخی واقعہ کے طور پر اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے۔ اپنے مشہور شعر میں علیؑ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

و انت الذی اعطیت اذ کنت راکعا
زکاۃ فدتك النفس یأخیر راکع
فانزل فیك الله خیر ولایة
و بینها فی محکمات الشرایع [3]

یہ آپ تھے جنھوں نے حالت رکوع میں زکوۃ بخشی۔ جان قربان ہو آپ پر اے بہترین رکوع کرنے والے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں بہترین ولایت نازل کی ہے اور اُسے قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔
ایک اور شعر جسے سبط بن جوزی حنفی نے حسانؓ سے نقل کیا ہے۔ یوں کہا ہے:

مَنْ ذا بِخاتَمِهِ تَصَدَّقَ راکِعاً
وَ اَسَرَّها فِي نَفْسِهِ اِسراراً [4]

کس نے رکوع میں اپنی انگوٹھی راہ خدا میں عطا کی اور اسے اپنے دل میں چھپایا!؟ (اور خداوند نے اُسے ظاہر کر دیا۔)
خلاصہ یہ ہے کہ: حضرت علیؑ کی شان میں اس آیت کا نزول کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں شک وشبہہ کی گنجائش ہو، یہاں تک کہ "منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغه" کے مصنف کہتے ہیں: اس بارے میں اہل سنت اور پیروان مکتب اہل بیتؑ کے طرق سے متضافر بلکہ متواتر روایات نقل ہوئی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ آیت کس طرح ولایت اور خلافت بلافصل پر دلالت کرتی ہے۔ اس کی وضاحت ہونی چاہیے۔

---

[1] الغدیر، جلد ۲، صفحہ ۵۲، ۵۳
[2] احقاق الحق، جلد ۲، صفحہ ۳۹۹ تا ۴۰۷
[3] حسان بن ثابت کے اشعار تھوڑے سے فرق کے ساتھ تفسیر روح المعانی اور گنجی شافعی کی کفایۃ الطالب اور دیگر بہت ساری کتب میں نقل ہوئے ہیں۔
[4] تذکرہ الخواص، صفحہ ۱۰، نیز گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب، صفحہ ۱۲۳ میں نقل کیا ہے اور اس کے کہنے والے کو شعراء میں سے شمار کیا ہے۔

آیت ولایت کی مسئلہ خلافت پر دلالت کی کیفیت

مذکورہ آیت میں تمام توجہ "ولی" کے لفظ پر مذکورہ ہے۔ حضرت علیؑ کو مسلمانوں کے ولی کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ "ولی" کے کئی معانی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، اس کا معنی یار اور دوست بھی ہے اور متصرف حاکم اور سرپرست بھی ہے۔ راغب کے بقول اس کا اصلی اور بنیادی معنی یہ ہے کہ دو چیزوں کا ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہونا کہ ان کے درمیان ذرا بھی فاصلہ نہ ہو، وہ مزید کہتے ہیں: واو کی زیر کے ساتھ وِلایت کا معنی مدد و نصرت ہے اور واو کی فتح کے ساتھ ولایت کا مطلب کسی چیز پر صاحب اختیار ہونا ہے۔[1] البتہ آیت میں ایک قرینہ موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں پر ولی کا معنی متصرف، سرپرست اور صاحب اختیار ہے کیونکہ اگر اس کا معنیٰ ناصر، دوست اور مددگار ہو تو اس میں تمام مومنین شامل ہیں، جیسا کہ ہم سورہ توبہ کی آیت نمبر ۷۱ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ

مومن مرد اور مومنہ عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں۔

لیکن زیر بحث آیت میں ولایت خاص فرد میں منحصر شمار کی گئی ہے اور وہ شخصیت وہ ہے جس نے رکوع کی حالت میں صدقہ دیا ہے انما کا لفظ جو حصر پر دلالت کرتا ہے اس کے ساتھ آیا ہے۔ (غور کیجیے گا) یہ لفظ ہمارے اس یقین کا باعث بنتا ہے کہ مذکورہ آیت میں ولایت کا معنی، دوستی اور مدد کرنا ہر گز نہیں ہے۔ (اس طرح اس کے قریب اور مشابہہ دیگر معانی) بنابرایں اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ اس کا معنی سرپرست، متصرف اور صاحب اختیار تسلیم کیا جائے اور اس کی ولایت، اللہ تعالی اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت کے ساتھ قرار پائے۔ اس کے بعد والی آیت یہ ہے:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۵۶

اور جو اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کی ولایت کو اپنائے گا (تو وہ غالب ہے) کیونکہ اللہ کی جماعت ہی غالب آنے والی اور فتح پانے والی ہے۔

درحقیقت یہ آیت سابقہ آیت کے مطلب کو تکمیل کر رہی ہے اور اس میں ولایت کے تصرف اور سرپرستی والے معنی پر ایک اور قرنیہ دکھائی دے رہا ہے کیونکہ حزب اللہ کی اصطلاح اور دشمنوں پر غلبہ حکومت اسلامی کی تشکیل سے مربوط ہے نہ کہ ایک عام دوستی سے۔ یہ امر خود ثابت کرتا ہے کہ سابقہ آیت میں ولی کا مطلب اسلام اور مسلمانوں کے حاکم، سرپرست اور ذمہ دار کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "حزب" میں مشترکہ اہداف کے حصول کے لیے ایک قسم کی تنظیم اور اجتماعی روابط کا معنی پوشیدہ ہے۔

[1] مفردات راغب مادہ "ولی"، بعض بزرگوں نے مولا کے ۲۷ تک معانی بیان کیے ہیں، (الغدیر، جلد اص ۳۶۲) لیکن ان کی اصل اور بنیاد وہی دو معنی میں باقی سب کی بازگشت انہی دو کی طرف ہے۔

اعتراضات اور بہانہ بازی

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ امامت وخلافت کے موضوع پر آیت کی ولایت واضح ہے۔ اگر یہ آیت دوسروں کے بارے میں نازل ہوتی تو شاید ذرا بھی قیل وقال نہ ہوتی! لیکن چونکہ یہ حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور فرقہ ورایت اور تعصب کی بنیاد پر اخذ کیے گئے نتائج سے سازگار نہیں ہے۔ لہٰذا ایک گروہ آیت کی ابتداء انتہا، دلالت اور شان نزول غرض یہ کہ ہر طرف سے اعتراض کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ ان اعتراضات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، بعض اعتراضات ظاہری طور پر علمی ہیں لہٰذا ان کا جواب علمی لحاظ سے دینا چاہیے لیکن بعض اعتراضات واقعاً بہانہ جوی کی غمازی کرتے ہیں ان کی بھی اجمالی طور پر چھان پھٹک ہونی چاہیے۔

۱۔ پہلے اعتراض کا تعلق پہلی قسم سے ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں ضمیروں اور موصولات جمع کی صورت میں آئی ہیں جیسے "الّذِین آمَنُو" "وَ الّذِینَ یقیمون" "و یُؤتون"، "وهم را کعون" اس حالت میں یہ کس طرح ایک شخص پر منطبق ہوسکتی ہیں آیت یہ کہہ رہی ہے کہ ان اوصاف کے حامل افراد تمہارے ولی ہیں نہ کہ ایک خاص شخص جو کہ علیؑ ابن ابی طالب ہیں

جواب

اس آیت کے شان نزول کے پیش نظر جو مستفیض بلکہ متواتر طور پر شیعہ اور سنی کے ذرائع سے نقل ہوا ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اس آیت کا مطمع نظر ایک ہی شخص ہے، باالفاظ دیگر احادیث اور اسلامی تاریخ گواہی دیتی ہیں کہ رکوع کے دوران سائل کو صدقہ دینا صرف اور صرف علیؑ سے متعلق ہے نہ یہ کہ چند افراد نے یہ کام انجام دیا ہے، بنابریں یہ کہنا درست ہے کہ جمع کے صیغے اور ضمیریں اُس شخصیت کی تعظیم اور احترام کی وجہ سے استعمال ہوئی ہیں۔

عربی ادب میں بارہا مفرد کے لیے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً آیت مباہلہ میں نسائنا کا لفظ جمع کی صورت میں آیا ہے حالانکہ متعدد شان نزول کے مطابق اس سے مراد سے صرف فاطمہ زہراؑ ہیں۔ نیز اسی آیت میں "اَنفُسنا" کا لفظ بھی جمع ہے حالانکہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ مباہلہ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ باقی مردوں میں سے صرف اور صرف علیؑ نے شرکت کی تھی۔ "غزوہ حمراء الاسد" کے واقعہ میں ارشاد ہوا ہے:

الّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النّاسُ إِنَّ النّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُم فَزَادَهُمْ إِيماناً۔

وہ لوگ جن سے کچھ افراد نے کہا کہ لوگ تمہارے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں ان سے ڈریں تو (نہ صرف وہ ڈرے نہیں بلکہ) ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا۔

یہاں پر بات کرنے والے کے لیے "ناس" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ جمع کا معنی رکھتا ہے حالانکہ تاریخوں میں آیا ہے کہ یہ بات کرنے والا نعیم بن مسعودؔ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ اسی طرح سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۲:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ

وہ افراد جن کے دِلوں میں نفاق کی بیماری ہے ان (یہودی اور عیسائیوں) کے ساتھ (دوستی کے لیے) ایک دوسرے پر سبقت لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے (اور ہمیں ان کی مدد کی ضرورت پڑ جائے)

اس کے شان نزول میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب کہ ضمیریں اس میں بھی جمع کی استعمال ہوئی ہیں۔ اسی طرح سورہ ممتحنہ کی پہلی آیت میں بھی خطاب عام ہے جب کہ شان نزول ایک شخص جس کا نام حاطب بن ابی بلتعہ ہے، کے بارے میں ہے، سورہ منافقون کی آیت نمبر ۸ (يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ) میں بھی الفاظ جمع کے آئے ہیں حالانکہ یہ بات کہنے والا عبداللہ بن اُبی تھا۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۴: (اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔ یعنی: جو لوگ اپنے اموال دن رات میں خرچ کرتے ہیں۔'') بہت ساری احادیث کے مطابق حضرت علیؑ کی شان میں نزول ہوئی ہے حالانکہ اس کی تمام ضمیریں جمع کی ہیں۔ نیز سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۵ جو کہ چیزوں کے خرچ کرنے کے متعلق سوال سے مربوط ہے۔ (يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۔۔۔) میں الفاظ جمع کے ہے حالانکہ سوال کرنے والا عمرو بن جموح نامی ایک شخص تھا۔[1]

ان مقامات پر کس دلیل کی بنا پر کلام جمع کی صورت میں آیا ہے حالانکہ مدنظر ایک فرد ہے؟ ممکن ہے بعض مقامات پر اس کی دلیل احترام ہو اور بعض جگہوں پر اس شخص کے ساتھ دوسروں کی ہم فکری اور ہم آہنگی کی طرف اشارہ ہو۔ مذکورہ موارد میں غور و فکر کرنے سے احترام اور ہم فکری کے مقامات کو ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

ان سب کو چھوڑتے ہوئے ہمیں معلوم ہے کہ قرآن کی بہت ساری آیات میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی بات کی ہے تو جمع متکلم کی ضمیر استعمال کی ہے، جب کہ اس کی ذات اقدس تو وحدہ لاشریک ہے یکتا و یگانہ ہے، وہ ہر لحاظ سے 'واحد' اور 'احد' ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ بڑی شخصیات کے کارندے ہوتے ہیں جو ان کے ارادوں کے مطابق کاموں کو انجام دیتے ہیں اور مطیع و فرمانبردار ہوتے ہیں، اسی کے پیش نظر عین مفرد ہونے کے اللہ تعالیٰ اپنے لیے باوجود ضمیر جمع کا استعمال کرتا ہے دوسرے الفاظ میں جمع کی ضمیر اس کی عظمت و بزرگی اور بلند مقام و منزلت کی علامت اور نشانی ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں حضرت علیؑ ولایت بمعنا حاکمیت اور قیادت مسلمین ہرگز نہیں رکھتے تھے پس آیت کا مذکورہ معنی کیونکر کیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب واضح ہے روز مرہ کے محاورات اور گفتگو میں بہت زیادہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک نام یا عنوان ایسے افراد کے لیے بولا جاتا ہے جو اس مقام و منصب کے لیے نامزد یا انتخاب ہوئے ہوتے ہیں اگرچہ عملی طور پر انہوں نے وہ منصب اور عہدہ نہیں سنبھالا ہوتا یا دیگر الفاظ

---

[1] ان روایات کے حوالوں کے بارے میں مزید معلومات کیلئے اس آیت کی تفسیر میں تفسیر نمونہ کا مطالعہ کریں۔

میں وہ بالقوہ اس مقام کے حامل ہوتے ہیں نہ کہ بالفعل مثال کے طور پر ایک شخص اپنی زندگی میں کسی کو اپنا ''وصی'' مقرر کرتا ہے باوجود اس کے وہ ابھی زندہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں اس کا وصی ہے یا اس کے بچوں کا نگران اور سرپرست ہے۔

حضرت علیؑ کا رسول خدا ﷺ کی زندگی میں ان کا وصی، خلیفہ اور جانشین ہونا اسی قبیل سے ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں اس مقام ومنصب کے لیے اذن الٰہی سے انہیں منتخب کیا اور اپنی رحلت کے بعد انہیں اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کیا۔ سورہ مریم کی آیت نمبر ۵ میں بھی یہی مفہوم اور مطلب سامنے آتا ہے کہ حضرت زکریا - خدا سے مانگتے ہوئے کہتے ہیں:

فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۝

بارالٰہا! مجھے میرا ولی اور جانشین عطا فرما۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور انہیں یحییٰ عطا فرمایا۔ مسلم بات ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت زکریا کی زندگی میں تو ان کے جانشین ولی اور وراث نہ تھے بلکہ ان کی زندگی کے بعد کے لیے مقرر اور معین ہوئے تھے۔ اسی قسم کی بات یوم الانذار کے واقعہ میں دکھائی دیتی ہے (جس دن پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے رشتہ داروں کو کھانے پر بلایا اور پہلی مرتبہ انہیں اسلام کی دعوت دی) کیونکہ اسلامی مورخین اعم از شیعہ وسنی کی تحریروں کے مطابق اور بڑے بڑے محدثین کے قول کے مطابق اس دن حضرت رسول خدا ﷺ نے علیؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ هذا اَخی و وصییّ وَ خَلیفَتی فیکُمْ فَاسْمِعُوا لَهُ وَ اَطِیْعُوهُ

یہ میرے بھائی، میرے وصی اور تمہارے درمیان میرے جانشین اور خلفیہ ہیں ان کی بات سنو اور اس کے فرمان پر عمل کرو۔[1]

کیا مذکورہ بالا اصطلاح حیات رسول ﷺ میں کسی مشکل کا سبب بنتی ہے؟ قطعاً نہیں بنتی۔ پس زیر بحث آیت میں ''ولی'' کی اصطلاح بھی بالکل اسی طرح کی ہے۔

دوسرے (بہانہ باز) گروہ کے اعتراضات بھی کافی تعداد میں ہیں۔ ان میں چند یہ ہیں:

۱۔ وہ کہتے ہیں علیؑ پر کونسی زکوۃ واجب تھی حالانکہ انہوں نے دنیا کے اموال سے اپنے لیے کچھ جمع نہیں کیا تھا؟ اور اگر مراد مستحب صدقہ ہے تو اُسے زکوٰۃ نہیں کہتے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید میں زکوٰۃ مستحب پر زکوٰۃ کا اطلاق بہت زیادہ ہوا ہے چنانچہ بہت ساری مکی سورتوں میں زکوٰۃ کا

---

[1] اس حدیث کو بہت سارے علمائے اہل سنت جیسے ابن ابی جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم، بیہقی، ثعلبی اور طبری نے نقل کیا ہے۔ ابن اثیر نے اپنی کتاب تاریخ الکامل کی دوسری جلد میں اس بات کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح ابوالفداء نے اپنی تاریخ کی کتاب کی پہلی جلد میں اور دیگر افراد نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے

(مزید وضاحت کیلئے آئندہ ابحاث کا انتظار کریں)

ذکر آیا ہے اور اس سے مراد مستحب زکوٰۃ اور صدقہ ہے کیونکہ زکوٰۃ ہجرت کے بعد مدینے میں واجب ہوئی ہے۔ سورہ نمل کی آیت نمبر ۳، سورہ ہود کی ۳۹، سورہ لقمان کی ۴ حم سجدہ کی آیت ان موارد میں سے ہے جن میں زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور چونکہ یہ سورتیں مکی ہیں۔ لہٰذا ان سورتوں میں زکوٰۃ سے مراد مستحب زکوٰۃ ہے۔

دوسری بات کہ درست ہے کہ حضرت علیؑ نے مال دنیا سے اپنے لیے کچھ ذخیرہ نہیں کیا ہوا تھا اپنے خون پسینے کی تھوڑی بہت کمائی ضرور تھی۔ مذکورہ انگوٹھی بھی چاندی کی تھی اور ظاہراً کم قیمت تھی۔ اس بنا پر اتنی تھوڑی مقدار میں ان پر زکوٰۃ کا واجب ہونا کوئی بعید بھی نہیں ہے، اس انگوٹھی کی قیمت کے متعلق جو مبالغہ آمیز باتیں کی گئی ہیں ان کی کوئی اساس نہیں ہے۔

۲۔ کیا نماز کی حالت میں سائل کی طرف متوجہ ہونا نماز میں حضور قلب اور مناجات الٰہی میں غرق ہونے کے منافی نہیں ہے (جب کہ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ نماز کی حالت میں پاؤں سے تیر نکالا گیا لیکن انہیں بالکل محسوس نہ ہوا)[1] پس کس طرح ممکن ہے کہ انہوں نے نماز کی حالت میں سوالی کی درخواست پر توجہ کی ہو؟!

جواب: جس کسی نے یہ اعتراض کیا ہے وہ اس نکتے سے غافل ہے کہ سائل کی آواز سننا اور اس کی مدد کرنا غیر خدا یا اپنی طرف یا امور دنیوی میں مشغول ہونا نہیں بلکہ یہ بھی اللہ کی طرف توجہ اور انہماک ہے۔ حضرت علیؑ کا پاکیزہ دل سائلین کی صدا پر حساس تھا ان کی فریاد اور آواز کا جواب دیتے تھے انہوں نے ایک عبادی کام کو دوسری عبادت سے مخلوط کر دیا اور نماز کی حالت میں زکوٰۃ ادا کی اور یہ دونوں خدا کے لیے تھیں اور خدا کی راہ میں تھیں۔

ایک لحاظ سے یہ اعتراض اور نکتہ چینی درحقیقت قرآن پر اعتراض ہے کیونکہ اس آیت میں رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دینے کو اللہ تعالیٰ بڑی قدر و منزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اگر یہ عمل ذکر خدا سے غفلت اور بے خبری ہوتا تو اس پر ایک عظیم اور غیر معمولی قدر و قیمت کی حاصل صفت کے عنوان سے زور نہ دیا جاتا۔ درحقیقت یہ متعصب افراد، حضرت علیؑ کی فضلیت کا انکار کرنا چاہتے تھے لیکن اعتراض خدا پر کر بیٹھے ہیں۔

یہاں فخر رازی کے بیان پر پوری توجہ کریں وہ کہتے ہیں ''حضرت علیؑ کے حالات سے یہی مناسب اور لائق ہے کہ وہ ذکر خدا میں غرق رہیں اور جس کی یہ حالت ہو وہ کسی اور کے کلام کو کیسے سن اور سمجھ سکتا ہے'' (بنابرایں سائل کی طرف توجہ کرنا آداب نماز کے خلاف ہے)[2]

فخر رازی سے پوچھنا چاہیے کہ اگر یہ کام آداب نماز اور حضور قلب کے برخلاف ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی کیوں تعریف کی ہے اور مومنین پر ولایت کے لیے اس جیسے شخص کو لائق سمجھا ہے؟!

---

[1] روایت کا متن یوں ہے: روی انه وقع نصل فی رجله فلم یمکن من اخراجه فقالب فاطمة سلام الله اخرجوه فی حال صلاته فانه لا یحس بما یجری علیه حنیئذٍ فاخرج فهو فی صلاته (محجۃ البیضاء جلد اول، صفحہ ۳۹۸، احقاق الحق، ج ۲ ص، ۴۱۴۔

[2] تفسیر کبیر، جلد ۱۲، صفحہ ۳۰۔

بہرحال اس میں شک وشبہہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ نماز میں ضرورتمند اور محتاج شخص کی صدا سننا اور اس کی حاجت کو پورا کرنا، دوگنا عبادت ہے جو ایک لمحے میں انجام پائی، ان تعصّبات سے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہیے جو ہمیں حقائق سے دُور کر دیتے ہیں۔

۳۔ان بہانوں میں سے ایک جو اعتراض کی شکل میں بیان ہوا ہے، یہ ہے کہ سائل کو انگوٹھی دینا فعل کثیر ہے جو نماز کے منافی اور بطلان کا سبب ہے۔

جواب: واقعاً کتنا عجیب ہے جب انسان حقیقت کو قبول نہ کرنا چاہے تو اس کے لیے وہ کن بہانوں کا سہارا لیتا ہے؟! اس اعتراض کے جواب میں پہلی بات یہ ہے کہ ایک اشارے سے انگوٹھی دے دینا کسی فتویٰ کے تحت بھی نہ تو فعل کثیر ہے اور نہ ہی نماز کے باطل ہونے کا سبب ہے خصوصاً جب نمازی نے اشارہ کیا ہو اور سوالی نے خود آ کر اُسے اتارا ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ فقہا نے بڑی صراحت سے کہا ہے کہ چند صورتوں سے نماز پر بالکل اثر نہیں پڑتا جیسے نماز میں موذی جانور مثلاً بچھو وغیرہ کو مارنا، چھوٹے بچے کو اٹھانا، یا بٹھانا نماز کی رکعتوں کو کنکریوں سے شمار کرنا، یہاں تک کہ اگر نماز کی حالت میں لباس کا کنارہ نجس ہو جائے تو اُسے پاک کرنا، ان سے کاموں کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی جب کہ سائل کو انگوٹھی دینا یا اُسے اتارنا ان سب سے معمولی کام ہے۔

۴۔ بہانے تراشنے والے کہتے ہیں وہ غیر معمولی انگوٹھی حضرت علیؑ نے کہاں سے لی تھی؟ کیا اس طرح کی انگوٹھی پہننا فضول خرچی نہیں ہے؟

جواب: کس نے کہا ہے کہ اس انگوٹھی کی قیمت غیر معمولی تھی؟ ہم اس قسم کی بے بنیاد اور فضول باتوں پر کیوں توجہ دیں اور بتدریج ایک قرآنی آیات کے انکار تک جا پہنچیں۔صرف ایک ضعیف مرسلہ روایت میں آیا ہے کہ اس انگوٹھی کی قیمت شام کے خراج کے برابر تھی، یہ بات حقیقت سے زیادہ افسانہ لگتی ہے شاید اس عظیم فضلیت کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے جعل سازوں کے ذریعے اس حدیث کو گھڑا گیا ہو۔

اس طرح کے مقامات پر گراں قیمت مال کا خرچ کرنا اہم نہیں بلکہ اہم یہ ہے کہ جو خود کسی چیز کا محتاج ہو وہ اُسے راہ خدا میں خرچ کرے اور اپنی ضرورت سے چشم پوشی کر لے اور یہ کام انتہائی خلوص کے ساتھ انجام پائے۔ جہاں خدا کی خاطر مسکین، یتیم اور اسیر کو چند روٹیاں دینے پر (البتہ بھوک اور شدید ضرورت کے وقت) قرآن مجید کی ایک پوری سورہ (اھل اتی) نازل ہوسکتی ہے تو کیا نماز کی حالت میں فقیر کو ایک انگوٹھی دینے پر ایک آیت نازل نہیں ہوسکتی؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

اس طرح کے دیگر اعتراضات بھی ہیں ان سب کا ذکر کرنا اور جواب دینا وقت کے ضیاع کا باعث ہوگا۔

۳۔آیت اولی الامر

سورہ نساء کی آیت نمبر ۵۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔

ولایت عامہ کی بحث میں اس آیت اور اس سے مراد کون افراد ہیں، کے بارے میں مفصل گفتگو ہوئی ہے۔ جیسا کہ اشارہ ہوا کہ اولی الامر کی مطلق (بلا قید و شرط) اطاعت کا حکم اور وہ بھی حضرت رسول خدا ﷺ کی اطاعت کے ساتھ، اس بات کی دلیل ہے کہ ''اولی الامر'' میں وہی افراد شامل ہو سکتے ہیں جو رسول خدا ﷺ کی طرح ہوں یعنی ان کے معصوم جانشین ہوں، کیونکہ مطلق اطاعت غیر معصومین کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

مذکورہ مقام پر ''اولی الامر'' کی تفسیر اور تشریح میں جتنے مشہور احتمالات تھے ان کا ذکر ہوا اور ان پر بحث و تمحیص کی گئی اور نتیجہ یہی نکلا تھا کہ ''اولی الامر'' کا صحیح معنی اور مفہوم معصوم امام ہی ہے۔

یہاں (ولایت خاصہ اور حضرت علیؑ کی بلافصل خلافت کی بحث میں) جس چیز کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے، وہ اُس مشہور حدیث کی تشریح اور وضاحت ہے جو مشہور اسلامی ماخذ (بالخصوص اہل سنت کے مشہور ماخذ) میں اس آیت کی حضرت علی۔ پر تطبیق کے سلسلے میں نقل ہوئی ہے۔ قابل قدر مفسر حاکم حسکانی حنفی نیشاپوری نے اس آیت کے حوالے سے پانچ حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان سب میں (ایک واضح اور روشن مصداق کے طور پر) اولی الامر کا عنوان حضرت علیؑ پر منطبق کیا گیا ہے۔

پہلی حدیث انہوں نے خود حضرت علیؑ سے بیان کی ہے کہ جب حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے ساتھ شریک وہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا اور میرا نزدیکی قرار دیا ہے، اور ان کے بارے میں آیت 'یا ایها الّذین آمَنوُ اطیعو الله۔۔۔ کو نازل فرمایا ہے۔ میں نے آنحضرتؐ سے پوچھا:

یا نبی الله من هم؟

اے اللہ کے نبی وہ کون ہیں؟

قال: انت اوّلهم

آپؐ نے فرمایا: آپ ان میں سے پہلے ہیں۔

دوسری حدیث مشہور مفسر مجاہد سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت امیر المومنین علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس وقت جب آنحضرتؐ نے انہیں مدینے میں اپنا جانشین بنایا تھا (اور خود غزوہ تبوک کی طرف روانہ ہونے والے تھے)۔ تیسری حدیث میں اسی مطلب

کو وہ ابوجعفر امام باقر -سے نقل کرتے ہیں۔ چوتھی حدیث میں سعد بن ابی وقاص سے بیان کرتے ہیں کہ جب پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم تبوک جانے کے لیے (مدینے کے نزدیک مقام) جُرف پر پہنچے۔ حضرت علیؑ آپؐ کے پیچھے اسلحہ اٹھائے ہوئے موجود تھے، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے اپنی جگہ پر چھوڑ کر جا رہے ہیں (مجھے اپنے سے جدا کر دیا) جب کہ میں کسی غزوہ میں بھی آپؐ سے جدا نہیں ہوا ہوں، منافقین نے میرے بارے میں افواہیں پھیلا دی ہیں کہ چونکہ آپؐ مجھے ساتھ نہیں لینا چاہتے، اس لیے مجھے مدینے میں چھوڑ کر جا رہے ہیں، حضرت سعد کہتے ہیں میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا کہ رسول خدا صلى الله عليه وآله وسلم نے فرمایا:

یا علی: اَلاَ تَرْضٰی اَنْ تَکُونَ مِنّی بِمَنْزَلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسیٰ اِلاَّ اَنَّه لاَ نَبِیّ بَعْدِی فَاُرْجِعْ فَاخْلُفْنِی فِی اَهْلِی وَ اَهْلِكَ۔

اے علی! کیا آپ اس پر راضی نہیں ہے کہ آپ کو میرے سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے (تمہارے پاس ہارون کے تمام عہدے ہیں سوائے نبوت کے) لہٰذا واپس جائیں اور میرے گھر والوں اور اپنے گھر والوں میں میرے جانشین اور نائب بنو (اور مدینے کو منافقین کے شر سے محفوظ رکھو)

اسی طرح کی بات پانچویں حدیث میں خود حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے۔[1]

''ابوحیان اندلسی کی تفسیر ''البحر المحیط'' میں ''اولی الامر'' کے معنی کے بارے میں جو اقوال بیان کیے گئے ہیں ان میں سے مقاتل، میمون اور کلبی (تینوں مفسرین) سے وہ نقل کرتے ہیں کہ ان سے مراد سرایا (جن جنگوں میں آنحضرتؐ خود شریک نہیں ہوئے) کے کمانڈر یا آئمہ اہل بیتؑ ہیں۔[2] اس کے بعد مذکورہ شخص نے علیؑ کے بارے میں اس آیت کے نزول کے حوالے سے دو اعتراض کیے ہیں۔

پہلا اعتراض: علیؑ ایک فرد تھے جب کہ ''اولی الامر'' جمع کا صیغہ ہے۔

دوسرا اعتراض: آیت ظاہر کر رہی ہے کہ لوگوں پر اولی الامر کی اطاعت، رسول خدا صلى الله عليه وآله وسلم کے دور میں ضروری تھی جب کہ حضرت علی -رسول خدا صلى الله عليه وآله وسلم کے دور میں امام نہ تھے۔[3] اسی طرح کے اعتراضات اور بہانے بازی کی مثالیں آیت ولایت میں بھی گزر چکی ہیں جن کا وہاں پر بڑی تفصیل کے ساتھ جواب دیا جا چکا ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ اشخاص اپنی زندگی میں ہی اپنے وصی مقرر کر دیتے ہیں اور اپنی گفتگو اور تحریروں میں کہتے ہیں کہ فلاں میرا وصی ہے اُسے ایسا کرنا چاہیے ویسا کرنا چاہیے یا مثلاً میری اولاد کو اس کی پیروی کرنا چاہیے وغیرہ اور ان سب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری وفات کے بعد اُسے ان کاموں کو انجام دینا چاہیے۔

---

[1] ان پانچ حدیثوں کو شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۱ میں ذکر کیا ہے۔

[2] بحر المحیط جلد ۳، ص ۲۷۸

[3] بحر المحیط جلد ۳، ص ۲۷۸

جیسا کہ ہم نے کہا کہ جمع کے صیغے کی بھی کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ قرآن اور قرآن کے علاوہ شعر وادب اور عربی نثر میں جمع کا استعمال مفرد کے لیے بہت زیادہ ہے، علاوہ ازیں یہاں پر اولوالامر کا مفہوم واقعاً جمع کا ہے اور یہ تمام معصوم اماموں کو شامل ہے، اگر چہ ہر دور میں امام معصوم ایک ہی ہوتا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ ایک جماعت اور گروہ ہوں گے۔ ان دو اعتراضات کے جواب کی مزید تفصیل آیت ولایت کے بارے میں گفتگو کا مطالعہ کریں۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ شواہد التنزیل میں حاکم حسکانی کے علاوہ اور افراد نے بھی اپنی کتب میں اس آیت کی شان نزول کے حوالے سے کچھ روایات نقل کی ہیں وہ یہی کہتی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی خلافت کے متعلق ہے۔ ان افراد میں سے ایک بڑے عالم ابوبکر بن مومن شیرازی ہیں جو اپنے رسالہ اعتقاد (مناقب کاشی کے نقل کے مطابق) میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب حضرت رسول اکرم ﷺ (تبوک کی طرف جاتے وقت) انہیں مدینے میں چھوڑا تو حضرت علیؑ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کی طرح مدینے میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

اَمَا تَرْضٰى اَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزَلَةِ هَارُونَ مِنْ موسىٰ حينَ قال: اُخْلُفْنِي فِي قومي وَ اصلح، فقال عَزَّوَجَلَّ وَ اَوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ [۱]

کیا آپ خوش نہیں ہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی، اس وقت جب موسیٰ نے اس سے کہا تھا بنی اسرائیل میں میرے جانشین بن کر رہو اور اصلاح کرو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: "وَ اَوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔"

"ینابیع المودۃ" کے مصنف شیخ سلیمان حنفی قندوزی، اپنی کتاب میں سلیم بن قیس ہلالی کی کتاب "مناقب" سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص حضرت علیؑ کے خدمت میں آیا اور پوچھا: سب سے چھوٹی چیز کونسی ہے جس کی وجہ سے انسان مومنین میں شمار ہوگا، نیز سب سے چھوٹی چیز کونسی ہے جس کی بنا پر وہ کافروں اور گمراہوں میں سے ہو جائے گا؟ امام نے فرمایا:

"سب سے کمتر چیز جس کی وجہ سے انسان گمراہوں میں شامل ہو جائے گا وہ اللہ کے نمائندے اور حجت (جس کی اطاعت اور ولایت کو تسلیم کرنا واجب ہے) اور اس کے گواہ اور شاہد کو نہ پہچاننا ہے۔"

اس شخص نے کہا: یاامیرالمومنین! انکا مجھے تعارف کرائیں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا:

"وہی ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ اپنے اور رسول ﷺ کے ساتھ کیا ہے اور فرمایا ہے: "یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُو اَطِیْعُو اللهَ وَاَطِیْعُو الرَّسُولَ وَاُولِی الاَمْرِ مِنْكُمْ۔" [۲]

---

[۱] احقاق الحق، جلد سوم صفحہ ۴۲۵

[۲] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۱۶) طبع دار الکتب العراقیہ)

یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ اولی الامر اللہ کا نمائندہ اور حجت ہے نہ کہ لوگوں کی رائے سے انتخاب ہوا ہے۔

تفسیر برہان میں اہل بیتؑ کے حوالوں سے اس آیت کے متعلق دسیوں ایسی روایات نقل ہوئی ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ مذکورہ آیت حضرت علیؑ یا آپ اور دیگر ائمہ اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض روایات میں بارہ اماموں میں سے ایک ایک کے نام بھی ذکر ہوئے ہیں۔[1]

[1] تفسیر برہان جلد ۱، صفحہ ۳۸۱۔۳۷۸

۴۔آیت صادقین

سورہ توبہ کی آیت ۱۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ ﴿۱۱۹﴾

اے ایمان لانے والو، تقوی الٰہی اختیار کرو اور (ہمیشہ) سچوں کے ساتھ رہو۔

اس آیت کی تفسیر ولایت عامہ کی بحث میں بطور مفصل گزر چکی ہے۔ یہاں پر جس چیز کی زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے وہ ان روایات کی تشریح ہے جو اس آیت کو علیؑ یا تمام اہل بیتؑ پر منطبق کرتی ہیں:

۱۔معروف مفسر جلال الدین سیوطی ''الدر لمنثور'' میں حضرت ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے آیت ''اِتَّقُو اللهَ وَ كُونُوا مَعَ الصَّادقِين'' کی تفسیر میں کہا: ''مع علی بن ابی طالب۔'' یعنی علی ابن ابی طالب کے ساتھ رہو۔ اسی طرح کی بات خوارزمی نے ''مناقب'' میں ''زرندی'' نے ''درر السمطین'' میں، عبداللہ الشافعی نے ''مناقب'' میں اور حاکم حسکانی نے ''شواہد التنزیل'' میں بیان کی ہے البتہ اس فرق کے ساتھ بعض کے الفاظ یہ ہیں ''هو علی بن ابی طالب'' اور بعض میں یہ الفاظ آئے ہیں ''نَزَلَتْ فِي علی ابن ابی طالب خاصّةً'' اور بعض میں ''مع علی و اصحاب عليٍّ'' کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔[۱]

۲۔حافظ سلیمان قندوزی حنفی نے ینابیع المودة میں حضرت سلمان فارسی سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت (يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ) نازل ہوئی تو حضرت سلمان نے عرض کیا: ''یا رسول الله! هذا عامّةٌ أَمْ خاصَّه'' یعنی: اے اللہ کے رسول! آیت کا مفہوم عام ہے یا خاص؟ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''أَمَّا المامورون فَعَامَّةُ الْمؤمنينَ، وَ أَمَّا الصَّادِقُونَ فخاصَّة، أَخِي عَلِيٌّ وَ أَوْصِيائَه مِنْ بَعْدِهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيامَةِ۔''

ترجمہ: جن افراد کو اس کا حکم دیا گیا ہے وہ عام مومنین ہیں البتہ صادقوں خاص افراد ہیں اور وہ میرے بھائی علیؑ اور ان کے بعد قیامت تک ان کے اوصیاء ہیں۔[۲]

۳۔حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں عبداللہ بن عمر سے ''کونوا مع الصادقین'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: یعنی ''محمّداً وَ اَهْل بيته۔'' یعنی: ''صادقین سے مراد محمدؐ اور ان کے اہل بیت ہیں۔''[۳]

---

[۱] مناقب، صفحہ ۸۹، درر السمطین، صفحہ ۹۱، مناقب عبداللہ الشافعی، صفحہ ۱۵۴، شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۲۵۹۔

[۲] ینابیع المودة، صفحہ ۱۵۵

[۳] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۲۶۲

۴۔اہل سنت کے بعض بزرگ علماء جیسے علامہ حموینی نے فرائد السمطین میں اور شیخ ابوالحسن کازرونی نے ''شرف النبی'' میں حضرت امام محمد باقر - سے مذکورہ آیت کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ: ''مَعَ آل محمد'' یا ''مع محمد و آلِہٖ'' یا ''مَعَ محمد و علی''۔سب کا معنی تقریباً ایک جیسا ہے یعنی: ''محمد وآل محمد کے ساتھ ہو جاؤ۔''[1]

ایسے علماء جنہوں نے مذکورہ بالا روایات کو زیر بحث آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ فقط مذکورہ دو افراد میں منحصر نہیں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ مومنین سچوں کے ساتھ رہیں، ایک مطلق اور قید و شرط کے بغیر ہے اور یہ امر معصومین کے علاوہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ غیر معصوم کے لیے امکان خطا ہے لہٰذا خطا کے وقت اس سے جدا ہونا چاہیے، جن کے ساتھ ہر وقت ساتھ رہا جائے اور پیروی کی جائے وہ معصومین کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتے۔اس بنا پر اس آیت میں صادقین سے مراد ہر سچا آدمی نہیں ہے بلکہ وہ سچے مراد ہیں، جو نہ ہی جان بوجھ کر اور نہ ہی بھول کر غلط بات کرتے ہیں۔

اس کے باوجود بعض بڑے مفسرین پر تعجب ہوتا ہے جیسے آلوسی روح البیان میں چندان روایات جو صادقین سے علیؑ کو ثابت کرتی ہیں کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ شیعوں نے علیؑ کی حقانیت پر اس آیت سے استدلال کیا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں یہ استدلال باطل ہے اور اپنے دعویٰ پر دلیل کے طور پر ایک لفظ کہے بغیر اس سے گزر جاتے ہیں۔اس طرح کا طرز عمل ثابت کرتا ہے کہ تعصب کے دبیز پردے سوچ اور فکر کے نور کے چمکنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور حریت فکر کو علماء سے بھی سلب کر دیتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ڈاکٹر محمد تیجانی جیسے حریت فکر رکھنے والے افراد سامنے آتے ہیں جو اسی آیت اور اس سے مربوط روایات کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کر لیتے ہیں اور بڑی بہادری سے علیؑ اور باقی ائمہ اہل بیتؑ پر اپنے ایمان کا واضح طور پر اعلان کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اس بارے میں بڑی نفیس کتاب بعنوان ''لا کون مع الصادقین'' (میں سچوں کے ساتھ ہو جاؤں) تحریر کی ہے، بہت سارے مسلمانوں پر اس کا عجیب اثر ہوا ہے۔

[1] مزید معلومات کیلئے دیکھیں، احقاق الحق، جلد ۱۴، صفحہ ۲۷۴، ۲۷۵، الغدیر، جلد ۲، صفحہ ۲۷۷، احقاق الحق: جلد ۳ صفحہ ۲۹۶ کے بعد اور جلد ۱۴ صفحہ ۲۷۰ تا ۲۷۷۔

۵۔آیت قُربیٰ

سورہ شوری آیت ر ۲۳ میں حضرت رسول اکرم ﷺ سے خطاب ہوتا ہے:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ

کہہ دیں میں تم سے کوئی بھی اجر رسالت نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے قریبوں سے مودّت رکھو۔

اس آیت میں ''ذوی القربیٰ'' سے کیا مراد ہے؟ تمام شیعہ مفسرین اور بعض سنی مفسرین نے کہا کہ ذوی القربی سے مراد حضرت رسول خدا ﷺ کے قریبی یعنی رشتہ دار ہیں۔اس تفسیر کے مقابلے میں دیگر احتمالات اور تفسیریں ذکر کی گئی ہیں لگتا یوں ہے کہ ان کا اصلی محرک امامت اور خلافت رسولؐ کے مسئلہ کی اہمیت کو کم کرنا اور اہل بیتؑ کے مقام کو گھٹانا ہے،ان میں سے تین تفسیریں یہ ہیں۔

۱۔اس سے مقصود یہ ہے کہ رسالت کا اجر اور جزا ایسے امور سے محبت کرنا ہے جو تمہیں قرب الٰہی کی دعوت دیں،بنابرایں ''القربیٰ'' وہ امور میں جو خدا کے قرب کا باعث ہیں۔واضح ہے کہ یہ تفسیر آیت کے مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ قرب الٰہی کے اسباب یعنی نماز،روزہ جہاد اور اس طرح کے دیگر امور کے لیے جو چیز اہم ہے وہ ان پر عمل کرنا ہے نہ کہ ان سے محبت اور مودت لہٰذا اس موضوع سے محبت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔اور کیا رسول اکرم ﷺ کے سامعین کے درمیان کوئی ایسا تھا جو ان چیزوں سے محبت نہ کرتا ہو بلکہ وہ افراد جو ان پر عمل کرنے میں کوتاہی کرتے تھے وہ بھی اللہ اور قرآن پر ایمان کی رو سے ان چیزوں سے محبت کرتے تھے اگر چہ عمل نہیں کرتے تھے۔

ان سب سے ہٹ کر ''القربیٰ'' کا معنی قریب اور نزدیک ہے نہ کہ نزدیک کرنے والا،لہٰذا وہ تمام مقامات جہاں قرآن مجید میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے(اس آیت کے علاوہ ۱۶ دفعہ) ان افراد کے معنی میں یہ آیا ہے جو قربت اور نزدیکی رکھتے ہیں (اور زیادہ تر رشتہ داری کی قربت) کیوں اور کس دلیل کی بنا پر زیر بحث آیت میں قرآن کے تمام موارد استعمال اور لغوی معنی کے برخلاف اس کی تفسیر کی گئی ہے،کیا اس کا محرک وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے؟

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بہت سارے ارباب لغت نے تصریح کی ہے کہ قربی یا ذی القربی،نسب میں قرابت اور نزدیکی کے معنی میں ہے۔مقائیس اللغۃ کا کہنا ہے:**فلان ذو قرابتی، هو مَنْ يَقْرُبُ مِنْكَ رَحِماً** وہ مزید کہتا ہے:القربی،القرابۃ یعنی دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور لسان العرب میں آیا ہے:**و القربة و القرابی: الدُّنُوُّ فِي النَّسَبِ**،قرابت اور قربی نسبی طور پر قریب اور نزدیک ہونا ہے۔

۲۔کچھ اور افراد کا کہنا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم مسلمان اجر رسالت کے طور پر اپنے رشتہ داروں سے محبت کرو! حالانکہ اپنے رشتہ داروں سے محبت اور دوستی کا اجر رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔مزید حیران کن بات ہے کہ یہاں پر بہترین معنی رسول خدا ﷺ کے ذوالقربی سے محبت ہے اس کو چھوڑ کر اپنے رشتہ داروں کی محبت کو اجر رسالت کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے!

۳۔کچھ مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری (یعنی رسول) کی رشتہ داری کا تم اجر و رسالت کے عنوان سے لحاظ اور خیال رکھو۔تم میں سے بہت سے قبائل کے ساتھ میری سببی (سسرالی) یا نسبی رشتہ داری ہے اس حوالے سے تم مجھے اذیت نہ پہنچانا۔

آیت کی تفسیر میں یہ بدترین معنی ہے جو کیا گیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اجر رسالت صرف ان سے طلب کیا جارہا ہے جو رسالت پر ایمان لاچکے ہیں پھر ان لوگوں کی طرف سے پیغمبر اکرم ﷺ کو تکلیف اور آزار پہنچانے کا کیا مطلب! یعنی ان کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا، لیکن اگر مراد ان کے دشمن ہیں جو انہیں ایذائیں اور تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ان کا اجر رسالت ادا کرنا تو درکنار یہ افراد تو سرے سے آپ کی نبوت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے، پس یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ان افراد سے کہیں کہ میری رسالت کا صلہ یہ ہے کہ میری جو تم سے رشتہ داری ہے اس کی وجہ سے مجھے اذیت و آزار مت پہنچانا۔

زیر بحث آیت میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ایک طرف قرآن مجید، بہت سے انبیاء الٰہی سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے واضح طور پر یہ کہا کہ ہم تم سے ذرا بھی اجر اور صلہ نہیں چاہتے ہمارا صلہ اور اجر تو عالمین کے پروردگار پر ہے: ''وَمَا اَسْئَلُکُم علیہ من اجر اِن اجریَ اِلاَّ علٰی رَبِّ العالمین۔'' مذکورہ جملہ صرف سورہ شعراء میں انبیاء الٰہی میں سے پانچ افراد (حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب) کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔[1] دوسری طرف زیر بحث آیت میں خود آنحضرتؐ کے بارے میں ارشاد ہورہا ہے میں تم سے کوئی اجر اور صلہ نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے رشتہ داروں سے دوستی اور محبت رکھو۔تیسری جانب سورہ فرقان کی آیت ۵۷ میں رسول اکرم ﷺ کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا﴿۵۷﴾

کہہ دو میں تم سے رسالت کی تبلیغ پر کسی معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرتا مگر یہ کہ جو شخص چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔

چوتھی جانب سورہ سباء کی آیت ۴۷ میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہی فرمایا گیا ہے:

قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۚ

کہہ دیں! میں نے جو صلہ مانگا ہے وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے، میرا اجر تو صرف اور صرف اللہ پر ہے۔

ان چار قسم کی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی دیگر انبیاء کی طرح اپنی ذات کے لیے لوگوں سے کوئی اجر اور صلہ نہیں مانگا بلکہ آپ کی ذوی القربی کی مودت خدا کی طرف راستہ ہے اور یہ بات سو فی صد ان کے فائدہ کے لیے ہے کیونکہ یہ امامت و خلافت اور رسول خدا ﷺ کی جانشینی کے مسئلے، امت میں آنحضرتؐ کے رہبریت کے طریقہ کار کا تسلسل اور اس کے سایے میں لوگوں کی ہدایت کا ایک دریچہ ہے۔(غور کیجیے گا)

جب ہم ان چار قسم کی آیات کی اس طرح تفسیر کریں گے تو پھر ان کے مفہوم میں کسی قسم کا ابہام، پیچیدگی اور مشکل باقی نہیں

[1] سورہ شعراء بالترتیب آیات، ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰۔

رہے گی بصورت دیگر ایک طرف تو ان میں تضاد نظر آئے گا اور دوسری طرف ہمیں ایسی تشریحات کا سہارا لینا پڑے گا جو کسی بھی لحاظ سے آیات کے ظاہر سے میل نہیں کھاتیں۔

چونکہ مذکورہ تفسیر بعض مفسرین کے مزاج اور طبیعت کے موافق نہیں ہے، کیونکہ ان کی پہلے سے طے شدہ آراء اور افکار سے یہ متصادم ہے اس لیے انہوں نے اس تفسیر کو نظر انداز کرتے ہوئے کبھی کہا اجر کا مطالبہ کرنا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے منافی ہے۔ لہٰذا ''اِلاَّ المودّۃ فی القربیٰ'' کو استثناء منقطع شمار کرنا چاہیے۔ کبھی کہا یہ آیت ''قُل مَا اَسئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ'' کی آیت کے منافی ہے اور کبھی دیگر غیر معقول توجیہات کے شکار ہوئے۔

یہ حقیقت اس وقت اور زیادہ آشکار ہو جاتی ہے جب ہم اس آیت کی شرح اور تفسیر میں منقولہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ کرتے ہیں اور انہیں آیت کے ساتھ ملا کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں بیان ہونے والی روایات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بلاشک وتردید زیر بحث آیت مسئلہ امامت وخلافت پر ناظر ہے جو کہ اجر رسالت کا عنوان ہوسکتا ہے، ایسا اجر جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرتا ہے اور اس کا فائدہ خود انہی کی طرف لوٹتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے ان چند مفسرین کو واضح جواب مل جاتا ہے جو ہمیشہ امامت سے مربوط آیات کے بارے میں متعصب رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ''روح المعانی'' میں اس آیت کی تفسیر میں ''آلوسی'' کہتے ہیں: شیعہ اس آیت کے صغریٰ اور کبریٰ ملانے کے بعد اسے حضرت علیؑ کی امامت پر دلیل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: ان کی محبت (آیت کے مطابق) واجب ہے اور جس کی محبت واجب ہو، وہ واجب الاطاعۃ ہے اور جس کی اطاعت واجب ہو وہ امام ہوتا ہے پس حضرت علیؑ امام ہیں۔ اس کے بعد وہ اس صغریٰ اور کبریٰ پر اعتراضات کرتے ہیں۔[1]

لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا گفتگو سے ثابت ہوا ہے کہ ہم کبھی بھی اس طرح کی کمزور دلیلیوں سے استفادہ نہیں کرتے۔ آیت میں اہم نکتہ کوئی اور چیز ہے اور وہ یہ کہ آیت میں ذوی القربیٰ کی محبت، اجر رسالت کے طور پر بیان ہوئی ہے اور دیگر آیات میں مذکورہ اجر، قرب الٰہی کا وسیلہ اور لوگوں کے لیے مفید قرار دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر مندرجہ بالا تشریح کے مطابق اس سے امامت وخلافت کا مسئلہ اجاگر ہوتا ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ اس استدلال کو مضبوط اور محکم کرتی ہیں۔

آیت قربیٰ، احادیث کی روشنی میں

آیت ''قُل لا اَسئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجرًا اِلَّا المودَّۃَ فِی القُربیٰ'' کے متعلق شیعہ وسنی کتب میں بہت ساری روایات نقل ہوئی ہیں جو اس آیت کے مفہوم کی تفسیر اور تشریح میں بہت زیادہ موثر ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ پانچویں صدی ہجری کے مشہور عالم حاکم حسکانی شواہد التنزیل میں سعید بن جبیر اور ابن عباس سے یوں نقل کرتے ہیں:

---

[1] روح المعانی، جلد ۲۵ صفحہ ۳۰۔

لمّا نزلت قُلْ لَا اَسئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلاَّ الْمَودَّۃَ فِی الْقُرْبیٰ، قالُوا: یا رَسُولَ اللّٰہِ مَنْ ھٰؤُلاءِ الّذِیْنَ اَمَرَنَا اللّٰہُ بِمَوَدَّتِہِمْ؟ قال: عَلِی وَ فاطِمَۃُ وَ وُلدُھُما۔

جب آیت "قُلْ لَا اَسئَلُکُمْ" نازل ہوئی تو اصحاب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ کون افراد ہیں جن سے محبت کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے دو بیٹے ہیں۔[1] اسی کتاب میں اسی مضمون پر مشتمل چند دیگر روایات مختلف طرق سے ابن عباس سے بیان ہوئی ہیں۔[2]

۲۔ مذکورہ کتاب میں ابوامامہ باھلی سے ایک اور حدیث منقول ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الاَنبیاءَ مِنْ اَشْجار شتّی وَ خُلِقْتُ وَ علیّ مِنْ شَجَرَۃ واحدَۃ فَانا اَصْلُھا وَ علیّ فَرعُھا، (وَ فاطِمَۃُ لُقاحُھا) وَ الْحَسَنُ وَ الْحُسَیْنُ ثِمارُھا وَ اَشْیاعُنا اَورقُھا، فَمَنْ تَعَلَّقَ بِغُصْنٍ مِنْ اَغْصانِہا نَجی وَ مَنْ زاغَ ھَوی وَ لَو اَنَّ عَبْداً عَبَدَ اللّٰہَ بَیْنَ الصَّفا وَ المَروَۃِ اَلْفَ عام ثُمَّ اَلْفَ عام، ثُمَّ اَلْفَ عام، حَتّی یَصیرُ کَالشَّنِّ البالس، ثُمَّ لَمْ یُدرِكْ مَحَبَّتَنا اَکَبَّہُ اللّٰہُ عَلی مِنْخَرَیْہِ فی النّارِ ثُمَّ قَرَءَ: قُلْ لا اَسْئَلُکُمْ عَلَیہِ اَجراً اِلاَّ المَودَّۃَ فِی القُربی۔"

"اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مختلف درختوں سے خلق کیا ہے لیکن مجھے اور علیؑ کو ایک ہی درخت سے خلق فرمایا ہے۔ میں اس کی جڑ ہوں اور علیؑ اس کی شاخ ہیں (اور فاطمہ اس کا پھول ہیں) حسن - اور حسین - اس کا پھل ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے پتے ہیں۔ پس جو شخص بھی اس کی شاخوں میں سے کسی شاخ کو تھام لے گا وہ نجات پائے گا اور جو ان سے روگردانی کرے گا وہ ہلاک ہوگا۔ اگر کوئی بندہ صفا اور مروہ کے درمیان ایک ہزار سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، پھر ایک ہزار سال، اس کے بعد پھر ایک ہزار سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور خشک اور کہنہ مشک کی طرح ہو جائے لیکن ہماری محبت اس کے دِل میں نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے (دلیل کے طور پر) اس آیت کی تلاوت فرمائی:

"قُلْ لَا اَسئَلُکُمْ عَلَیہِ اَجراً اِلاَّ المَودَّۃَ فِی القُربی۔"[3]

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۳۰

[2] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۵

[3] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۴۱

۳۔اہل سنت کے مشہور مفسر سیوطی الدر المنثور میں زیر بحث آیت کے حوالے سے مجاہد کے ذریعے ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت "قُل لا اَسئَلُکُمۡ عَلَیہِ اَجراً" کی تشریح میں فرمایا:

اَنۡ تَحۡفَظُونِی فِی اَهۡلِ بیتی وَ تُوَدُّوهُمۡ بی۔ [۱]

"مقصود یہ ہے کہ میرے اہل بیت کے بارے میں میرے حق کی حفاظت کرو اور ان سے میری خاطر محبت کرو۔"

۴۔ احمد بن حنبل "فضائل الصحابہ" میں سعید بن جبیر کے ذریعے عامر سے نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت "قُلۡ لَا اَسئَلُکُمۡ عَلَیہِ اَجراً اِلاَّ المَودَّةَ فِی القُربیٰ" نازل ہوئی تو لوگوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ آپ کے ذوی القربی، جن کی مودت اور محبت ہم پر واجب ہے کون ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا:

"علی و فاطمة وَ ابناهما و قالها ثلاثاً"

"علی، فاطمہ، اور ان کے دو بیٹے۔ اور اس بات کو آپؐ نے تین بار دہرایا۔" [۲]

اسی مطلب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرطبی نے اسی آیت کی تفسیر میں سعید بن جبیر کے ذریعے ابن عباس سے بیان کیا ہے۔

۵۔حافظ ابونعیم اصفہانی، حلیۃ الاولیاء میں جابر سے نقل کرتے ہیں کہ ایک عربی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: اے محمد! "میرے سامنے اسلام پیش کرو" آپؐ نے فرمایا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں؟ اس نے عرض کی: کیا اس کے مقابلے میں مجھ سے اجر اور جزا کا بھی مطالبہ کرتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا: لا، اِلَّا المودّة فی القربیٰ۔ یعنی: "نہیں! صرف ذوی القربی کی محبت چاہتا ہوں۔" میں نے پوچھا: آپؐ کے ذوی القربی یا میرے رشتہ دار؟ آپؐ نے فرمایا: میرے قریبی اور رشتہ دار اس نے کہا: آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں تمہاری بیعت کروں: فعلی مَنۡ لایُحِبُّكَ وَ لایُحِبُّ قُرۡباكَ لَعنَةُ اللهِ۔ یعنی: "پس جو شخص آپ سے محبت نہ رکھے اور آپ کے قربیوں سے محبت نہ رکھے اس پر اللہ کی لعنت ہو" پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آمین! [۳]

۶۔ابن جریر طبری نے مذکورہ آیت کے ضمن میں ابن جبیر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

هِیَ قُربی رَسُولِ اللهِ

ان سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی ہیں۔

---

[۱] الدر المنثور جلد ۶، صفحہ ۷

[۲] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲

[۳] حلیۃ الاولیاء جلد ۳، صفحہ ۲۰۱

۷۔حاکم نے ''مستدرک الصحیحین''میں علی بن الحسین ÷ سے نقل کرتے ہیں: جب علیؑ کی شہادت ہوئی تو امام حسن- نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔(خطبے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے اس جملے پر پہنچے)

اَنَا مِنْ اَهْلِ البَیْتِ الّذِینَ اِفْتَرَضَ اللهُ مَوَدَّتَهُمْ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فَقَالَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی لِنَبِیِّهٖ قُلْ لااَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْراً اِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِی القربیٰ۔

میں اس خاندان کا فرد ہوں جس کی محبت اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر فرض کی ہے۔خداوند تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا ہے: کہہ دیں تم سے رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے اہل بیت ÷ سے محبت کرو۔[1]

اہل سنت کے جن اکابرین نے اس حدیث کو نقل کیا ہے: ان میں سے کچھ یہ ہیں: محب الدین طبری نے ذخائر میں (صفحہ ۱۳۸)،ابن حجر نے صواعق (صفحہ ۱۰۱) میں اور سیوطی نے الدر المنثور میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں۔

۸۔بہت بڑے مفسر ابوجعفر محمد بن جریر طبری جامع البیان میں ابوالدیلم سے بیان کرتے ہیں:

جب علی ابن الحسین -کو قید کر کے (شام) لایا گیا اور انہیں دمشق کے دروازے کی سیڑھیوں پر بٹھایا گیا،ایک شامی اٹھا اور اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کیا اور تمہارا قلع قمع کیا۔علی بن الحسین -نے فرمایا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟اس نے کہا: ہاں! انہوں نے فرمایا: کیا آل حامیم کو پڑھا ہے؟اس نے جواب دیا: میں نے قرآن مجید تو پڑھا ہے لیکن آل حامیم کو نہیں پڑھا،انہوں نے کہا: کیا تم نے:

قُلْ لااَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْراً اِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِی القربیٰ۔

نہیں پڑھا؟اس نے عرض کیا: کیا آپ وہی ہیں؟فرمایا: ہاں![2]

۹۔ابن حجر ''الصواعق المحرقہ''میں حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

فِینَا آلِ حم آیة، لا یَحْفَظُ مَوَدَّتَنَا اِلَّا کُلُّ مُؤْمِنٍ ثُمَّ قَرَءَ قُلْ لااَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْراً اِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِی القربیٰ۔

ہمارے بارے میں آیت آل حم اتری ہے اور وہ یہ کہ ہماری مودت کو صرف مومن ہی اپنے دِل میں محفوظ رکھیں گے اس کے بعد: قل لا اسئلکم ... کی تلاوت فرمائی۔[3] اسی طرح کی روایت کنز العمال

---

[1] مستدرک الصحیحین جلد ۳،صفحہ ۱۷۲۔

[2] جامع البیان طبری،جلد ۲۵،صفحہ ۱۶

[3] صواعق المحرقہ،صفحہ ۱۰۱

میں بھی آئی ہے۔[1]

اس حدیث سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں ''قربی'' سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوی القربی ہیں۔ ''آل حم'' سے مراد وہ تمام سورتیں ہیں جن کے شروع حم آیا ہے اور وہ یہ سات سورتیں ہیں، مومن، فصلت (حم سجدہ) شوری، زخرف دخان، جاثیہ اور احقاف زیر بحث آیت انہی میں سے ایک سورہ میں ہے۔[2]

۱۰۔ جناب زمخشری نے تفسیر کشاف میں، اسی طرح سے فخر رازی نے تفسیر الکبیر میں اور قرطبی نے اپنے تفسیر میں زیر بحث آیت کے حوالے سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے جو آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مودت اور محبت کی اہمیت کو عجیب انداز سے آشکار کرتی ہے۔ یہاں پر حدیث کی عین عبارت کو تفسیر کشاف سے نقل کرتے ہیں۔ اس نے کہا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلا وَ مَنْ ماتَ علی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ فُتِحَ لَهُ فی قَبْرِهِ بابانِ اِلَی الْجَنَّة اَلا وَ مَنْ ماتَ علی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ (ص) جَعَلَ اللّٰهُ قَبْرَهُ مَزارَ مَلائِكة الرَّحْمَةِ اَلا وَ مَنْ ماتَ عَلی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ (ص) ماتَ عَلَی السُّنَّةِ وَ الْجَماعَةِ۔

اَلا وَ مَنْ ماتَ عَلی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ (ص) جاءَ یَوْمَ الْقِیامَة مَکْتُوب بَیْنَ عَینیهِ اٰیسٌ مِنْ رَحْمَة اللّٰه اَلا وَ مَنْ ماتَ عَلی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ ماتَ کافِرا. اَلا وَ مَنْ ماتَ عَلی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ (ص) لَمْ یَشُمَّ رائِحَةَ الْجَنَّةِ۔

جو بھی محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے ساتھ مرا وہ شہید مرا ہے، آگاہ رہو! جو بھی محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرا وہ بخشا ہوا مرا ہے، آگاہ رہو! جو شخص بھی محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت مرا وہ توبہ کے ساتھ دنیا سے گیا ہے۔ آگاہ رہو! جو بھی محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرا وہ اس دنیا سے کامل الایمان رخصت ہوا ہے۔ آگاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرے گا، موت کا فرشتہ اُسے بہشت کی خوشخبری سنائے گا، اس کے بعد منکر اور نکیر اُسے بشارت دیں گے (برزخ میں سوال و جواب پر مامور فرشتے)

آگاہ رہو! جو شخص آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرے گا اُسے اس طرح احترام کے ساتھ بہشت لے جایا جائے گا جس طرح دولہن کو دولہا کے گھر لایا جاتا ہے۔ آگاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے ساتھ اس دنیا سے جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو رحمت کے فرشتوں کی زیارت گاہ قرار دے گا۔ آگاہ رہو! جو بھی

---

[1] کنز العمال، جلد ۱، صفحہ ۱۱۸

[2] تفسیر مجمع البیان، سورہ مومن کی ابتداء میں اس کے حاشیہ کو دیکھیں (جلد ۷، اور ۸، صفحہ ۵۱۲)

آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرا وہ سنت و جماعت پر مرا ہے۔

آ گاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عداوت اور دشمنی کی حالت میں مرے گا، قیامت کے دن وہ اس حالت میں محشر میں داخل ہوگا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا، رحمت الٰہی سے مایوس۔ آ گاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بُغض اور دشمنی کے ساتھ دنیا سے گیا وہ کافر ہو کر مرا ہے۔ آ گاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عداوت پر مرے گا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا۔[1]

تعجب ہے کہ تفسیر کشاف کے بعض حاشیوں پر جو کہ متعصب افراد کی طرف سے تحریر ہوئے ہیں، اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''و آثار الوضع علیه لائحة''یعنی اس کے جعلی ہونے کی اثرات آشکار ہیں۔لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ کس دلیل کی بنا پر یہ حدیث جعلی ہے اور اس کے جعلی ہونے کے حدیث میں کہاں اثرات آشکار ہیں؟ اور یہ کبھی بھی واضح نہیں ہوں گے، سوائے اس کے کہ اس میں آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اور ان کی شان ومنزلت اجاگر ہوئی ہے، کیا یہی اس کے جعلی ہونے کا ثبوت ہے یا سابقہ عقیدے اور افکار سے یہ حدیث متصادم ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے پہلی دفعہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اس حد تک حدیث شریف نبوی میں ملاحظہ کیا ہو اور وہ بھی ان کے اکابرین اور ہم عقیدہ افراد میں سے تین مفسروں نے اُسے نقل کیا ہو، اُسے صحیح تسلیم کیا ہو اور اس پر کوئی اعتراض بھی نہ کیا ہو۔

صورتحال یہ ہے کہ فخر رازی اسی حدیث کے نیچے لکھتے ہیں: اگر چہ ''آل'' کے معنی میں اختلاف اور بحث وتمحیص ہے، لیکن:

لا شَكَّ اَنَّ فاطمةَ و عَلِيًّا وَ الْحَسَنَ وَ الْحُسَيْنَ كَانَ التَّعَلُّقَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ رَسولِ اللهِ اَشَدَّ التَّعَلُّقاتِ وَ هَذا كَالمَعلُومِ بِالنَّقلِ المُتَواتِرِ فَوَجَبَ اَنْ يَكونُوا هُمُ الآلُ۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فاطمہؑ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گہرا اور زبردست تعلق تھا اور یہ بات متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ اس بنا پر (سب کے عقیدے کے مطابق) فقط یہی ہستیاں ہی آل رسول ہیں۔

فخر رازی اس مطلب پر بہت زیادہ شواہد اور قرائن بھی پیش کرتے ہیں کہ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ یقینا اِس آیت میں شامل ہیں[2]

مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا ہے کہ اس آیت کے حوالے سے جو بعض روایات نقل ہوئی ہیں اور وہ یہ بیان کرتی ہیں کہ اس آیت میں مخاطب کفار قریش ہیں اور معنی یہ ہے کہ ''میری تمہارے سے جو رشتہ داری اور قرابت ہے اسے نظر انداز نہ کریں اور اس قرابت کی وجہ سے تکلیف اور اذیت نہ پہنچائیں'' وہ نا قابل قبول ہیں۔ اور یہ احتمال ہے کہ جعلی حدیثیں بنانے والوں نے اہل بیت ÷ کے مقام کے

---

[1] تفسیر کشاف: جلد ۴، صفحہ ۲۲۰ م ۲۲۱ تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷ صفحہ ۱۶۶۔۱۶۵ تفسیر قرطبی جلد ۸، صفحہ ۵۸۴۳۔

[2] مزید معلومات کیلئے دیکھیں: تفسیر الکبیر فخر رازی، جلد ۲۷، صفحہ ۱۶۷۔۱۶۶۔

بارے میں کثیر روایات کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے اس قسم کی روایات کو نقل کر دیا ہو، کیونکہ کفار مکہ سے اس قسم کا خطاب آیت کے مفہوم سے پورے طور پر متصادم ہے، اس لیے کہ یہ امر ممکن ہی نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کفار سے کہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ میری تم سے جو قرابت اور رشتہ داری ہے اُسے فراموش نہ کریں۔ وہ تو آنحضرتؐ کی رسالت کو سرے سے قبول نہیں کرتے تھے کہ تا اینکہ وہ آپؐ کے لیے کسی اجر اور جزا کے قائل ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اس قسم کی روایات کا سہارا لے کر یہ چاہا ہے کہ آیت سے اہل بیتؑ کا رابطہ کاٹ دیا جائے درحقیقت انہوں نے آیت کے معنی و مفہوم سے انکار کیا ہے، کیونکہ منکران رسالت سے رسالت پر اجر مانگنا بالکل غیر معقول ہے۔ اس بحث کا اختتام ان اشعار پر کرتے ہیں جو فخر رازی نے تفسیر الکبیر میں اور آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں مذکورہ آیت کے حوالے سے نقل کیے ہیں تا کہ ''ختامہ مسک'' کے عنوان سے اس بحث کا اختتام بابرکت ہو جائے۔

یہ اشعار امام شافعی کے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ اہل بیت ÷ کی محبت کا پختہ عقیدہ رکھتے تھے وہ کہتے ہیں:

یَا رَاکِباً قِف بِالمُحَصَّبِ مِن مَنی

وَ اهتِف بِساکِنِ خَیفِها وَ النّاهِضِ

سَحَراً، اِذا فاضَ الحَجِیجُ اِلی مِنی

فَیضاً کَمُلتَطِمِ الفُراتِ الفائِضِ

اِن کانَ رَفضاً حُبُّ آلَ مُحَمَّد

فَلیَشهَدِ الثَّقَلانُ اِنّی رافِضی

اے خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے جانے والی سواری! منی کے نزدیک جہاں رمی جمرات کے لیے کنکریاں جمع کرتے ہیں (جو حاجیوں کے اجتماع کا بہت بڑا مرکز ہے) وہاں رک جا! اور ان افراد سے جو مسجد خیف میں (عبادت میں مشغول) ہیں یا (بیت اللہ کی جانب) رواں دواں ہیں، پکار کر کہو: ''اگر آل محمد ﷺ کی محبت سے انسان رافضی ہوتا ہے تو تمام جن و انس گواہی دیں کہ میں رافضی ہوں۔''[1]

(آخر میں ہماری دعا ہے کہ) اے اللہ! ہم سب کو آل محمد ﷺ کے محبوں میں قرار دے، انہی کا محب جن پر ہم نماز میں درود بھیجتے ہیں اور اس کے بغیر ہماری نماز، نماز نہیں ہے۔ اے اللہ! اس محبت اور دوستی کو ان کے ''مقام ولایت'' کی معرفت حاصل کرنے کا مقدمہ اور وسیلہ قرار دے اور ہم یہ تصور بھی نہ کریں کہ اس طرح کا اہم ترین مسئلہ صرف ایک معمولی دوستی اور سادہ سی محبت کے عنوان سے بیان ہوا ہے، اس کے بعد اس معرفت کو ان کے مکتب کی پیروی کے لیے ذریعہ قرار دے۔

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷، صفحہ ۱۶۶؛ تفسیر روح المعانی، جلد ۲۵، صفحہ ۳۲۔

حصہ دوم

فضائل کی آیات

اشارہ

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ اس حصے میں ہم قرآن مجید کی ان آیات کو ذکر کریں گے جو بلا واسطہ تو امامت وخلافت کے موضوع کو بیان نہیں کرتیں، لیکن حضرت علیؑ کے بڑے بڑے فضائل کو ثابت کرتی ہیں اور مجموعی طور پر یہ آیات اس موضوع کو تمام زاویوں سے ان اشخاص کے لیے واضح کرتی ہیں جو اصل واقعات سے آگاہ نہیں ہیں۔ ان آیات سے کلی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کا معاملہ، دیگر افراد و اصحاب سے جدا ہے۔ اور امت میں ان کی طرح کی شخصیت کی موجودگی میں امامت وخلافت کے لیے کوئی اور اہل نہیں ہوسکتا۔

دوسرے الفاظ میں ایک واضح عقلی مقدمہ ضمیمہ کرنے سے ان سے امامت وخلافت کے مسئلے کا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم ہے وہ کبھی بھی مفضول کو افضل پر حاکم اور اس کا رہبر نہیں بنائے گا۔ یہاں تک دنیا کے عقلاء میں سے اگر کوئی اس کام کو انجام دے تو اس کی سرزنش اور مذمت کی جاتی ہے اور اس کے کام کو اس کی انتظامی صلاحیتوں کی کمزوری اور عدم تدبیر سمجھا جاتا ہے کہ اس نے کیوں ایک اعلیٰ اور برتر شخص کو ایک پست شخص کے تابع کر دیا۔

ان آیات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بعض علماء نے ان کے بارے میں علیحدہ کتابیں لکھی ہیں، لیکن ہم نے ان میں سے ان چند آیات کا انتخاب کیا ہے جن کا مطلب اور مفہوم واضح ہے اور اس کتاب کے اختصار کے ساتھ بھی مناسب ہیں۔ یہاں پر پھر ہم اہل سنت کے ماخذ اور کتب کو پیش کریں گے اور جو باتیں صرف شیعہ کتب میں نقل ہوئی ہیں ان کے بارے میں کم گفتگو کریں گے تا کہ کوئی یہ نہ سوچے کہ مکتب اہل بیت کے پیروکاروں نے کوئی بات تعصب کی وجہ سے کی ہے۔ بہرحال یہ آیات زیادہ ہیں ہم نے ان میں سے ۲۴ آیات کا انتخاب کیا ہے۔

۱۔ آیت مباہلہ

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۶۱ میں ارشاد ہوا ہے:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

آپ کے پاس علم آجانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ (حضرت عیسیٰ کے بارے میں) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

یہاں پر چند نکات کی وضاحت کی ضرورت ہے:

اوّل: آیت کا مفہوم اور مطلب۔

دوم: اس آیت کی تفسیر میں جو روایات اسلامی کتب میں مذکورہ ہیں وہ کن افراد کا تعارف کراتی ہیں؟

سوم: اس آیت سے علیؑ، فاطمہ سلام اللہ علیہا اور حسن وحسین ÷ کی فضلیت اور برتری پر کس طرح استدلال کیا جاسکتا ہے۔

چہارم: اس آیت کے حوالے سے بعض اعتراضات اور نکتہ چینی کا جواب۔

آیت مباہلہ کا مطلب ومفہوم

مذکورہ آیت اپنے سیاق وسباق کے ساتھ یہ بتا رہی کہ عیسائیوں کے اپنے باطل عقائد پر اصرار بالخصوص حضرت مسیح کے خدا ہونے کا دعوی اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے مقابلے میں منطق اور استدلال کی ناکامی کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مباہلہ کا طریقہ کار اپنائیں اور اپنی باتوں کی سچائی کو اس خاص روحانی ذریعے سے منوائیں اور ثابت کریں یعنی ان کے ساتھ مباہلہ کریں تاکہ سچے اور جھوٹے کی پہچان ہوجائے۔

مباہلہ اصل میں بَہْل (بروزن اَھْل) سے نکلا ہے جس کا معنی چھوٹ دینا ہے۔ اسی وجہ سے جب مادہ حیوان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کے پستان پر (اس کے بچے کو دودھ پینے سے روکنے کے لیے) تھیلی نہ چڑھائی جائے تو اسے ''باھل'' کہتے ہیں اور دعا میں ''ابتہال'' کا مطلب تضرع وزاری اور کام کو خدا پر چھوڑ دینا ہے۔

کبھی اس لفظ کا ہلاکت، لعنت اور خدا سے دوری کا معنی کیا جاتا ہے اور وہ اس لحاظ سے کہ جب بندے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ لطف الٰہی اور رحمت الٰہی کے سایے سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ تو تھا اس کا لغوی معنی، مروجہ مفہوم کے اعتبار سے جس کی طرف آیت میں بتایا گیا ہے، مباہلہ دو افراد کا ایک دوسرے پر نفرین اور لعنت کرنا ہے، اس طرح کہ جب منطقی دلائل بے سود ثابت ہوں وہ تمام افراد جو کسی اہم دینی مسئلے پر بحث کر رہے ہوں وہ ایک جگہ جمع ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کریں اور اس سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا کرئے اور اُسے سزا وعذاب دے، جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کے مقابلے پر کیا تھا، جس کی نشاندہی آیت کر رہی ہے۔

آیت کہہ رہی ہے، جب بھی علم ودانش کے آپ تک پہنچنے کے بعد (حضرت عیسیٰ کی الوھیت کی نفی اور انحرافی نظریہ تثلیت اور دیگر اسی طرح کے مسائل) پر (عیسائی) آپ سے بحث وتکرار کریں تو ان سے کہیں کہ ہم اپنے بیٹے لے کر آئے ہیں تم اپنے بیٹوں کو لے آؤ: "فَقُلْ تَعَالَوا نَدْعُ اَبْنَائَنا وَاَبْنَائَکُمْ۔" یعنی: کہہ دیجئے! ہم اپنی عورتیں لے آتے ہیں تم اپنی عورتوں کو لاؤ (وِنِسَائَنا وِنِسَاءَ لَکُمْ) ہم اپنے نفسوں کو لاتے ہیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ (وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ)۔ پھر مباہلہ کریں (تاکہ اس طرح جھوٹے اور سچے کی پہچان ہو جائے) پس اللہ کی لعنت، جھوٹوں پر کریں گے (ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللهِ عَلَى الكاذبينَ)

تاریخی اعتبار سے اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، یعنی پیغمبر اکرم ﷺ نے چند افراد کا انتخاب کیا اور انہیں مباہلہ کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ اسلامی روایات جنہیں مفسرین اور محدثین نے بیان کیا ہے، میں آیا ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے نجران کے عیسائیوں کو مباہلہ کی تجویز دی، ان کے بزرگوں نے ایک دِن کی مہلت طلب کی تاکہ اس بارے میں آپس میں مشورہ کرلیں ان کے بڑے پادری نے ان سے کہا: دیکھو اگر کل محمد ﷺ اپنے بیٹوں اور گھر والوں کے ساتھ مباہلہ کے لیے آئیں تو ان سے مباہلہ نہ کرنا اور اگر اپنے یار واصحاب کے ساتھ آئیں تو ان سے مباہلہ کر لینا کیونکہ اس صورت، میں ان کی بنیاد اور اساس نہ ہوگی۔

جب دوسرا دن شروع ہوا تو رسول اکرم ﷺ علیؑ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تشریف لائے اس طرح سے کہ حسن -اور حسین - آپ کے آگے چل رہے تھے اور فاطمہ زہرا ×ان کے پیچھے تھیں، عیسائی اپنے خیموں سے باہر آئے ان کی قیادت ان کے بڑے پادری کر رہے تھے جب اُس نے رسول اکرم ﷺ کو ان کے ہمرائیوں کے ساتھ دیکھا تو پوچھا: یہ کون افراد ہیں؟ جواب دیا گیا کہ ایک ان کے چچا زاد اور داماد ہیں، دو ان کے نواسے ہیں اور خاتون ان کی بیٹی ہیں جو ان کے نزدیک سب سے زیادہ معزز ہیں، بڑے پادری نے دیکھا اور کہا: میں ایک ایسے شخص کو دیکھ رہا ہوں جو جرات مندی کے ساتھ مباہلہ کے لیے مصمم ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ سچا ہو اور اگر وہ سچا ہو تو ہم پر عظیم مصیبت آئے گی اس کے بعد اس نے کہا: اے ابوالقاسم (محمد)! ہم آپ سے مباہلہ نہیں کرتے، آیئے ہم آپ سے صلح کرتے ہیں!''

بعض روایات میں منقول ہے کہ بڑے پادری نے کہا: میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ سے چاہیں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو وہ ہٹ جائے گا! پس ان کے ساتھ مباہلہ نہ کرو ورنہ تباہ وبرباد ہو جاؤ گے۔ [1] یہی مطلب کچھ فرق کے ساتھ جس

[1] مجمع البیان، جلد اول اور دوم، صفحہ ۴۵۲، یہاں پر اس کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔

سے اصل واقعے پر اثر نہیں پڑتا بہت ساری دیگر تفسیروں میں بھی بیان ہوا ہے جیسے تفسیر فخر رازی (جلد ۸، صفحہ ۱۰) تفسیر قرطبی (جلد ۲، صفحہ ۱۳۴۶) روح البیان (جلد ۲، صفحہ ۴۴) روح المعانی جلد ۳، صفحہ ۱۸۸) بحر المحیط (جلد ۲، صفحہ ۴۷۲) تفسیر بیضاوی (زیر بحث آیت کے ساتھ) اور دیگر تفاسیر۔اب ہم احادیث کی کتابوں کا رخ کرتے ہیں:

مباہلہ محدثین کی زبانوں پر

مکتب اہل بیت اور اہل سنت کی مشہور اور درجہ اول کی کتب میں بہت ساری روایات نقل ہوئی ہیں جو بالکل واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ آیت مباہلہ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ ×، حضرت حسن -اور حضرت حسین- کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔صحیح مسلم میں کتاب ''فضائل الصحابہ'' میں باب فضائل علی ابن ابی طالب -میں سعد بن ابی وقاص سے نقل ہوا ہے کہ معاویہ نے سعد سے کہا: تم کیوں ابوتراب (علیؑ) پر سب وشتم نہیں کرتے؟ اس نے جواب دیا: مجھے پیغمبر اکرم ﷺ کی تین باتیں یاد ہیں ان کی وجہ سے میں علیؑ پر سب وشتم نہیں کر سکتا، اگر ان میں سے ایک بھی میرے لیے ہوتی تو میرے لیے سرخ بالوں والے کئی اونٹوں سے بہتر تھی (یہ عربوں کے لیے بہت ہی قیمتی جانور سمجھا جاتا ہے) اس کے بعد وہ حدیث منزلت (جنگ تبوک کے موقعہ پر) اور جنگ خیبر میں علیؑ کو علَم دینے کے واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔اس نے مزید کہا:

و لما نَزَلَتْ هٰذِهِ الآيَةُ (قُلْ تَعَالَوا نَدْعُ اَبْنَا ئَنا وَ اَبْنَائَكُمْ) دَعَا رَسُولُ اللهِ عَلِيًّا و فَاطِمَةَ و حَسَناً و حُسَيْناً فَقَالَ اللّٰهُمَّ هؤُلاءِ اَهْلِي۔

جب آیت مباہلہ نازل ہوئی، رسول خدا ﷺ نے علیؑ، فاطمہ × اور حسن- وحسین- کو بلایا پھر بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: اے اللہ! یہ ہیں میرے گھر والے (اور اس آیت کے مصداق ہیں) [1]

اس حدیث کو اہل سنت کے بڑے بڑے علماء کے ایک اور گروہ نے بھی نقل کیا ہے، جیسے جناب ترمذی نے اپنی صحیح میں [2] وہ حدیث کو نقل کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ ابوعیسیٰ کہتے ہیں یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے (شاید اس کے غریب ہونے کی وجہ پہلے سے طے شدہ متعصب آراء سے عدم مطابقت ہو) احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں [3] بیہقی نے سنن الکبری [4] اور سیوطی نے درالمنثور [5] میں

[1] صحیح مسلم، جلد ۴ صفحہ ۱۸۷۱، حدیث نمبر ۲۳ باب ۴۔
[2] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۳۸، حدیث ۳۷۲۴ (باب ۲۱، باب مناقب علیؑ)
[3] مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۱۸۵۔
[4] السنن الکبری، فضائل الخمسہ کے نقل کے مطابق، جلد ۱، صفحہ ۲۹۱۔
[5] الدر المنثور، آل عمران کی آیت ۶۱۔

اِسے ذکر کیا ہے۔

۲۔صحیح ترمذی میں ایک اور مقام پر بھی سعد بن ابی وقاص سے حدیث بیان ہوئی ہے کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ ،فاطمہ ×،حسن-،حسین -کو اپنے پاس بلایا اور بارگاہ خداوندی میں عرض کیا:"اللّٰهُمَّ هٰؤُلاءِ اَهْلِي"یعنی:اے اللہ! "یہ ہیں میرے اہل بیت"[۱]۔اِسی حدیث کو حاکم نے "مستدرك الصحيحين" میں نقل کرتے ہوئے آخر میں کہا ہے:یہ حدیث صحیح ہے اور شیخین یعنی بخاری اور مسلم کے حدیث کی صحت کے اصول کے عین مطابق ہے اور ان کی صحت کی شرائط پر پوری اترتی ہے۔[۲] نیز بیہقی نے سنن الکبری میں اسے نقل کیا ہے[۳]

۳۔سیوطی نے"درالمنثور"میں حاکم اور ابن مردویہ سے اور ابونعیم نے"دلائل"میں جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے"جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ کرنے کا فیصلہ کیا تو دوسرے دن آپؐ نے علیؑ،فاطمہؑ،حسینؑ اور حسینؑ کے ہاتھوں کو پکڑا اور انہیں مباھلے کے لیے لے گے لیکن وہ لوگ مباہلہ کے لیے آمادہ نہ ہوئے،جابر مزید کہتے ہیں: آیت: (تَعالَو نَدْعُ اَبْنَائَنا وَاَبْنَائَکُمْ...)انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[۴] سیوطی کہتے ہیں:حاکم نے اس حدیث کو صحیح شمار کیا ہے۔

۴۔درالمنثور میں ہی سیوطی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت آیا(مباہلہ کے واقعہ کی تفصیل اور عیسائیوں کے مباہلہ سے انکار کے بعد)وہ مزید لکھتے ہیں اس وقت صورت حال یہ تھی کی آنحضرتؐ اس حالت میں باہر آئے کہ ان کے ساتھ علیؑ ،فاطمہ ×،حسن-اور حسین -تھے آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا میں دعا کروں گا اور تم امین کہنا،لیکن نجران کے عیسائی مباہلہ کے لیے تیار نہ ہوئے اور انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صلح کرلی اور جزیہ دینے پر آمادہ ہوگئے۔[۵]

۵۔اُسی کتاب میں وہ ابن جریر کے ذریعے علباء بن احمر الیشکری سے نقل کرتے ہیں کہ جب آیت:(قُلْ تَعَالَو انَدْعُ اَبْنَائنا...) نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ ،فاطمہ ×،حسن-،اور حسین -کو بلانے کے لیے بھیجا اور مدمقابل سے کہا کہ مباہلہ کے لیے تیار ہوجاؤ(اور وہ مباہلہ کے لیے آمادہ نہ ہوئے)[۶]

۶۔علامہ طبری اپنی تفسیر میں اپنی سند سے زید بن علی سے اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ:کان النبیّ و علی و فاطمۃَ وَالحَسَنْ

---

[۱] صحیح ترمذی،جلد ۵،صفحہ ۲۲۵(باب ۴،حدیث ۲۹۹۹،طبع بروت،دار احیاء الترات العربی)

[۲] مستدرک الصحیحین:جلد ۳،صفحہ ۱۵۰۔

[۳] السنن الکبری:۰ جلد ۷،صفحہ ۶۳۔

[۴] الدر المنثور،جلد ۲،صفحہ ۳۸ زیر بحث آیت کے بارے میں(تھوڑے سے اختصار کے ساتھ)

[۵] الدر المنثور،جلد ۲،صفحہ ۳۹

[۶] الدر المنثور،جلد ۲،صفحہ ۳۹

و الحُسَینُ [1] ۔یعنی: وہاں پر نبی اکرمؐ علیؑ، وفاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ تھے۔

۷۔موصوف مذکورہ کتاب میں اپنی سند سے سدّی سے یوں نقل کرتے ہیں کہ: اَخَذَ النَّبیُّ بِیَدِ الحَسَنِ وَ الحُسَیْنِ و فاطِمَۃَ و قالَ لِعلِیٍّ اَتَبِعْنا [2] یعنی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسنؑ، حسینؑ اور فاطمہؑ کا ہاتھ پکڑا اور علیؑ سے فرمایا ہمارے پیچھے آئیں۔

۸۔علامہ ابوبکر جصّاص چوتھی صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں وہ اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں بڑے واضح الفاظ میں مباہلہ کے بارے میں کہتے ہیں: اِنَّ رُواۃَ السِیَّرِ و نَقَلَۃَ الاَثَرَ لَمْ یَخْتَلِفُوا فِی اَنَّ النَّبِیَ (ص) اَخَذَ بِیَدِ الحَسَنِ و الحُسَیْنِ و عَلِیٍّ و فاطِمَۃَ (رَضِیَ اللہُ عنہم) وَ دَعَی النَّصارَی الَّذِیْنَ حاجُّوہُ اِلَی المباھَلَۃَ۔ [3] یعنی: سیرت نگاروں اور روایان حدیث کا اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ کو اپنے ساتھ لیا اور عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دی جو آنحضرتؐ سے بحث ومناظرہ کر رہے تھے۔ جصاص کے بقول اس مسئلہ میں تمام علماء حدیث اور تاریخ کا اتفاق اور اجماع ہے۔

۹۔جصاص ہی اپنی ایک اور کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' میں مباہلہ کے واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

قالَ الحاکِمُ وَقَدْ تَوَاتَرَتِ الاَخْبَارُ فِی التَّفاسِیرِ عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ عّباس وَغَیْرِہ اَنَّ رَسُولَ اللہِ (ص) اَخَذَ یَوْمَ المُباھَلَۃِ بِیَدِ عَلِیٍ وحَسَنٍ وَحُسَینٍ وَجَعَلُوا فاطِمَۃَ وراءَھُمْ ثُمَّ قَالَ ھٰؤلاءِ اَبْنَائَنَا وَ اَنْفُسَنا و نِسائَنا۔ [4]

حاکم کا بیان ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں عبد اللہ ابن عباس اور دوسروں سے متواتر روایات نقل ہوئی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مباہلہ کے دن علیؑ فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کا ہاتھ پکڑا اور فاطمہ کو اپنے پیچھے قرار دیا پھر فرمایا: یہ ہیں ہمارے بیٹے، ہماری عورتیں اور ہمارے نفوس اور تم اپنے بیٹے، اپنی عورتوں اور اپنے ہم جیسوں کو لے آؤ تاکہ مباہلہ کریں۔

واقعہ مباہلہ اور اس آیت کے پنجتن پاک کی شان میں نازل ہونے کے بارے میں یہ روایات کا صرف ایک حصہ تھا۔ان روایات میں جزوی فرق اصل مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوتا مثلا یہ کہ فاطمہؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھیں یا ان کے پیچھے تھیں یا حضرت علیؑ آنحضرتؐ ساتھ چل رہے تھے یا آپؐ کے پیچھے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سارے مسلم تاریخی واقعات جیسے جنگ بدر، خیبر، احزاب اور فتح مکہ کے بارے میں جزئیات میں اختلاف

---

[1] تفسیر طبری، جلد ۳، صفحہ ۱۹۲ (احقاق الحق کے نقلے کے مطابق، جلد ۳ صفحہ ۴۷)

[2] تفسیر طبری، جلد ۳، صفحہ ۱۹۲ (احقاق الحق کے نقلے کے مطابق، جلد ۳ صفحہ ۴۷)

[3] احکام القرآن جصاص، جلد ۳، صفحہ ۱۴۔

[4] معرفۃ علوم الحدیث صفحہ ۵۰، طبع مصر (احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۴۸ سے نقل کیا بناپ)

ضرور پایا جاتا ہے اور اہم ترین تاریخی واقعات میں سے ایسا واقعہ بہت کم ہی ملے گا جس میں اس طرح کے جزئی اختلاف موجود نہ ہو۔

بہرحال مذکورہ بالا روایات، اہل سنت کے بزرگ علماء کی تائید اور گواہی کے ساتھ اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ حد تواتر کو پہنچ رہی ہیں، اس کے باوجود حیرانی کی بات ہے کہ تفسیر المنار کے مصنف زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

قالَ الاستاذُ الإمامُ: الرّوایات مُتَّفِقه عَلی اَنَّ النَّبِیّ (ص) اِختَارَ لِلْمُباهَلَةَ عَلِیّاً وَ فاطِمَةَ وَ وَلَدَیهِمَا وَ یَحمِلُونَ کَلِمَةَ نِسائَنا عَلی فاطِمَةَ و کَلِمَةَ اَنْفُسَنَا عَلی عَلِیٍّ فقط، مَصَادِرُ هٰذِهِ الرَّوایاتِ الشِّیْعَه وَ مَقْصَدُهُمْ مِنْها مَعْرُوف۔

تمام روایات بالاتفاق بتا رہی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے مباہلہ کے لیے علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے دو بیٹوں کو اپنے ساتھ لیا، اور نِسائنا کے لفظ کو فقط فاطمہؑ پر اور اَنْفُسَنَا کے لفظ کو فقط علیؑ پر انہوں نے منطبق کیا ہے۔

ان سب روایات کا ماخذ اور منبع شیعہ ہیں اور ان کا ان روایات سے مقصد معلوم ہے۔[1]

واقعاً عجیب ہے جب پہلے سے طے شدہ افکار اور فرقہ وارانہ تعصب درمیان میں ہو تو المنار کے مصنف جیسے مشہور عالم اور دانشور بھی ایسی کمزور اور غیر معقول بات کر جاتے ہیں جس کی کمزوری سب پر عیاں ہوتی ہے کیا صحیح مسلم، صحیح ترمذی اور مسند احمد، شیعہ کی مشہور کتب ہیں؟ کیا سنن بیہقی، سیوطی کی در المنثور، جصاص کی احکام القرآن، تفسیر طبری اور مستدرک حاکم، شیعہ علماء کی لکھی ہوئی ہیں؟

اس طرح کی بڑی غلطی تعصب کے پردے کا اثر ہو سکتی ہے اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی ایک طرف تو موصوف یہ کہتے ہیں کہ روایات متفقہ طور پر یہ بات نقل کر رہی ہیں اور دوسری طرف سب کو مشکوک قرار دے رہے ہیں۔ اگر صحیح مسلم صحیح ترمذی، مسند احمد اور اس طرح کی دیگر بڑی بڑی کتب کی یہ حالت ہو کہ شیعہ جعلی روایات کو ان کے اندر داخل کر سکیں اور اس حد تک کہ وہ حدیث متواتر کی صورت اختیار کر لے تو پھر ان کتب کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے؟ ان پر کیونکر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس طرح تو ان کی ایک حدیث بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

درحقیقت اپنی اس بات سے المنار کے مصنف نے اہل سنت کے تمام مشہور کتب کو غیر معتبر کر دیا ہے اور ان کی اہمیت کو بالکل ختم کر دیا ہے، البتہ وہ چاہتے تھے کہ علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے فرزندوں کی فضلیت کا انکار کریں لیکن اس سے اہل سنت کے مذہب کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ یہاں پر صرف ایک اعتراض کا جواب دینا باقی رہ جاتا ہے جو کہ صاحب المنار اور بعض دوسروں نے آیت میں موجود ''جمع کی ضمائر'' کے بارے میں کیا ہے، اس کا جواب ہم بعد میں تفصیل سے دیں گے۔

مباہلہ کی اہمیت

[1] تفسیر المنار، جلد ۳، صفحہ ۳۲۲۔

اس آیت میں پہلا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ مباہلہ کے مسئلہ کو دعوی رسالت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت اور صداقت پر روشن اور واضح دلیل قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ امر ممکن نہیں ہے کہ جو اپنے پروردگار سے اپنے رابطہ اور تعلق پر قطعی ایمان نہ رکھتا ہو وہ اس قسم کے میدان میں وارد ہو، یعنی اپنے مخالفین کو دعوت دے کہ آؤ مل کر خدا کی بارگاہ میں جائیں اور اس سے جھوٹے کو رسوا کرنے کی دعا مانگیں، اور میرا وعدہ ہے کہ میری نفرین مخالفین پر عملی جامعہ پہنے گی، اور اس کا نتیجہ سب دیکھیں گے۔ یقینا اس قسم کے میدان میں اترنا انتہائی خطرناک ہے کیونکہ اگر نفرین قبول نہ ہوئی اور اس کا اثر مخالفین پر مترتب نہ ہوا تو اس کا نتیجہ دعوت دینے والے کی رسوائی کے سوا کچھ نہ نکلے گا اور کوئی بھی سمجھدار انسان نتیجہ کے اطمینان کے بغیر ایسے خطرناک میدان میں قدم نہیں رکھتا۔

اسی دلیل کی بنا پر اسلامی روایات میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب بات مباہلہ تک پہنچی تو نجران کے عیسائیوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مہلت مانگی تاکہ وہ اس کے متعلق غور وفکر کرلیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط ان افراد کو مباہلہ کے لیے لائے ہیں جن کی دُعا مستجاب ہوسکتی ہے اور آپؐ ہر طرح کے شور شرابے، رعب و دبدبے کے بغیر میدان مباہلہ میں اترے ہیں تو اس چیز کو انہوں نے آپ کے دعوی کی صداقت کی دلیل سمجھا اور مباہلہ سے راہ فرار اختیار کی مبادا عذاب الٰہی میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چند خاص قریبی افراد، اپنے کمسن بچوں اور اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ کے ساتھ میدان میں آئے ہیں تو وہ سخت وحشت زدہ ہوگئے اور صلح پر آمادہ ہوگئے۔

دوسرے پہلو سے یہ آیت اہل بیت رسول یعنی علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے اعلیٰ مقام ومنزلت پر واضح اور روشن دلیل ہے۔ کیونکہ آیت میں تین الفاظ آئے ہیں ''اَنْفُسَنا''، ''نِسائَنا'' اور ''اَبْنَائَنا''۔ بے شک ''اَبْنَائَنا'' سے مراد امام حسن اور امام حسین علیہما السلام تھے اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے ''نِسائَنا'' جناب فاطمہ صلی اللہ علیہا کے علاوہ کسی پر منطبق نہیں ہوتا، رہی بات ''اَنْفُسَنا'' کی تو یقینا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس سے مراد نہیں ہوسکتے، کیونکہ آیت کہہ رہی ہے نَدْعُ ......اَنْفُسَنا 'ہم بلائیں اپنے جیسوں'' کو پس اگر مراد خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں تو اپنے آپ کو بلانا کوئی معنی نہیں رکھتا لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم کہیں اس سے مراد صرف اور صرف علیؑ ہیں۔

یہ بات اہم ہے کہ فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں ایک شیعہ عالم ''محمود بن الحسن الحمصی'' کے بیان کو نقل کیا ہے، اس نے مذکورہ آیت سے ثابت کیا ہے کہ علیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام انبیاء اور سب اصحابہ سے افضل ہیں، اس کا کہنا ہے کہ ممکن نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو بلائے اور خود کو کسی کام کی دعوت دے پس اَنْفُسَنا سے مقصود آنحضرتؐ کے علاوہ کوئی اور ہے اور علماء متفق ہیں کہ آنحضرتؐ کے ہمراہ علیؑ کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، اس بنا پر آیت کہہ رہی ہے کہ علیؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ پر اور آپ جیسے میں یقینا علی بعینہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں لیکن مقام نبوت اور آنحضرتؐ کی سب پر افضلیت کے علاوہ دیگر تمام جہات اور پہلوؤں میں آپ جیسے ہیں۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں پس علیؑ کو بھی افضل ہونا چاہیے، اس کے بعد اس نے ایسی حدیث کو (اپنے کلام کی تکمیل کے لیے) بطور دلیل پیش کیا ہے۔ جسے دوست و دشمن سب تسلیم کرتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَرادَ اَنْ یَرَی آدَمَ فِی عِلْمِہٖ وَ نُوحاً فِی طاعَتِہٖ وَاِبْرَاھِیْمَ فِی خُلَّتِہٖ و موسیٰ فِی ھَیْبَتِہٖ وَ عیسیٰ فِی صَفْوَتِہٖ، فَلْیَنْظُرْ اِلی عَلِیِّ بن ابی طالب۔ (ع)

جو شخص آدم کو مقام علم میں، نوح کو اطاعت میں، (اپنے پروردگار کی نسبت) ابراہیمؑ کو دوستی اور خلیل الٰہی ہونے میں، موسیٰ کو ھیبت میں اور عیسیٰ کو ان کی برگذیدگی میں دیکھنا چاہتا ہے تو وہ علی بن ابی طالب۔ کی طرف دیکھے۔

یہ حدیث کہہ رہی ہے آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ یعنی اچھے لوگوں میں جو صفات الگ الگ پائی جاتی ہیں وہ تمام ان کی ذات میں یکجا تھیں۔ اس بیان کو نقل کرنے کے بعد فخر رازی لکھتے ہیں: دوسرے شیعہ بھی ماضی اور حال میں اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ علیؑ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفس اور جان کی مانند ہیں مگر ان خصوصیات میں نہیں جو دلیل صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ثابت کرتی ہیں۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ آنحضرتؐ تمام اصحاب سے افضل تھے پس علیؑ کو بھی تمام اصحاب سے افضل ہونا چاہیے۔[1]

فخر رازی اس دلیل کو ذکر کرنے کے بعد انتہائی سادگی سے اس سے گزر جاتے ہیں اور صرف اس جواب پر قناعت کرتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی بن ابی طالب۔ سے افضل ہیں اسی طرح مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ہر نبی ان تمام افراد سے افضل ہے جو نبی نہیں ہیں اور یقیناً علیؑ نبی نہیں تھے؛ پس نتیجہ یہ نکلے گا کہ دیگر انبیاء الٰہی علیؑ سے افضل تھے۔[2]

اگر فخر رازی کی گفتگو میں خوب غور وفکر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اس محکم اور قوی استدلال کا جواب نہیں ہے گویا اس نے چاہا ہے کہ بات بالکل جواب کے بغیر نہ رہے ورنہ یہ بات کہ ہر نبی غیر نبی سے افضل ہے، مکمل طور پر قابل بحث ہے کیونکہ انبیاء اور پیغمبروں کی دیگر افراد پر فضلیت اور برتری صرف وحی کے حوالے سے مسلم اور مورد اتفاق ہے لیکن وحی کے علاوہ ممکن ہے ایسی بزرگ ہستیاں ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ باقی تمام انبیاء سے افضل ہوں۔ علاوہ ازیں بات تو علیؑ کی تمام امت پر فضلیت کی ہے اور یہ امر ان کی تمام انبیاء پر برتری کے ثابت ہونے کا محتاج نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

بہر حال اس آیت اور اس کی تفسیر میں منقولہ متواتر احادیث سے جو فضلیت ثابت ہوتی ہے وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کے مسئلہ کو واضح کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی راضی نہیں ہوگا کہ ایک افضل اور برتر شخص ماموم ہو اور غیر افضل امام ہو، وہ شخص جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفس اور جان کی طرح ہو وہ پیروکار ہو اور اس سے کمتر درجے والے اس کے پیشوا ہوں۔!

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۸، صفحہ ۱۸

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۸، صفحہ ۱۸

اس مسئلہ میں فرق نہیں پڑتا چاہے ہم امامت کو منصوص من اللہ سمجھیں (جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے) یا عوامی انتخاب کے ذریعے قرار دیں جس طرح اہل سنت کا عقیدہ ہے، کیونکہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کبھی مفضول کو افضل پر مقدم نہیں کرے گا اور دوسری صورت میں بھی لوگوں کو حکمت کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دینا چاہیے اور اگر وہ ایسا کریں تو وہ کام ناپسندیدہ اور غیر معقول ہوگا۔

آیت مباہلہ سے استدلال پر نکتہ چینی

یہاں پر ایک مشہور اعتراض ہے جسے المنار کے مصنف اور بعض دوسروں نے اس آیت کے اہل بیت کے حق میں نازل ہونے پر ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''ابنائنا'' (ہمارے بیٹے) سے مراد حسن -اور حسین -کس طرح سے ہو سکتے ہیں حالانکہ ''ابنائنا'' جمع کا صیغہ ہے اور عربی زبان میں جمع کا اطلاق دو افراد پر نہیں ہوتا؟ اس طرح یہ بھی کیسے ممکن ہے کہ ''نسائنا'' (ہماری عورتیں) جو کہ جمع کا صیغہ ہے صرف خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس کا اطلاق ہو؟ نیز یہ بھی کیسے ہوسکتا ہے کہ انفسنا سے مراد صرف علیؑ ہوں؟ کیونکہ یہ بھی جمع کا صیغہ ہے اور علیؑ ایک فرد ہیں۔

جواب

اس سوال کے جواب میں آپ کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

۱۔ جیسا کہ پہلے بھی تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے کہ اس آیت کے اہل بیتؑ کے بارے میں نازل ہونے کے متعلق روایات کی ایک کثیر تعداد اسلام کی مشہور اور معتبر کتابوں اعم از شیعہ و سنی میں نقل ہوئی ہے ان روایات میں واضح طور پر مذکورہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ علی،-فاطمہؑ، حسن -اور حسین -کے علاوہ کسی کو اپنے ساتھ مباہلے میں نہیں لے گئے اور یہ بات آیت کی تفسیر میں خود ایک بڑا واضح قرینہ ہوگی، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آیات قرآن کی تفسیر کرنے والے جملہ قرائن میں سے ایک ''سنت اور قطعی شان نزول بھی ہے۔ بنابرایں یہ اعتراض فقط شیعہ پر نہیں ہے بلکہ تمام علمائے اسلام کو اس کا جواب دینا ہوگا۔

۲۔ صیغہ جمع کا واحد یا تثنیہ پر اطلاق کوئی نئی بات نہیں ہے قرآن اور غیر قرآن عربی ادب بلکہ غیر عربی ادب اس طرح کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے اس کی وضاحت یوں ہے کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی قانون بیان کیا جاتا ہے یا کسی معاہدہ کو تحریر کیا جاتا ہے تو حکم کو بطور کلی اور صیغہ جمع کی صورت میں لایا جاتا ہے، مثلاً معاہدہ میں یوں لکھا جاتا ہے کہ اس پر دستخط کرنے والے اور ان کے فرزندان معاہدے پر علمدر آمد کرنے کے پابند ہوں گے، جب کہ یہ ممکن ہے کہ معاہدے کے فریقین میں سے کسی کے ایک یا دو فرزند ہوں، لہٰذا یہ بات قانون سازی یا عہد نامے کا جمع کی صورت میں لکھنے سے قطعاً منافی نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمارے پاس دو مرحلے میں ایک مرحلہ تدوین کا اور دوسرا عملدر آمد کا تدوین کے مرحلے میں ممکن ہے کئی دفعہ الفاظ جمع کی صورت میں تحریر کیے جاتے ہیں تا کہ تمام مصادیق پر اس کا اطلاق ہو لیکن عمل درآمد اور نفاذ کے مرحلے میں مصداق فرد واحد

میں منحصر ہو اور مصداق میں انحصار مسئلہ کے کلی ہونے کے منافی نہیں ہے۔

دوسرے الفاظ میں پیغمبر اکرم ﷺ نجران کے عیسائیوں سے کیے گئے وعدے کے مطابق پابند تھے کہ آپؐ اپنے تمام بیٹوں، اپنے خاندان کی تمام خاص عورتوں اور ان سب کو اپنے ساتھ مباہلہ میں لے آتے جو آپ کی جان اور نفس کے مقام پر تھے، مگر اس کے مصداق، دو بیٹوں، ایک خاتون اور ایک مرد کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ (غور کیجیے گا) قرآن کی آیات میں ایسے متعدد موارد موجود ہیں جہاں الفاظ اور عبارت جمع کے صیغے میں آئی ہے لیکن اس کا مصداق مختلف وجوہات میں سے کسی وجہ سے ایک فرد میں منحصر ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران کی آیت ۱۷۳ میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

''وہ لوگ جنہوں نے ان سے کہا دشمن (تم پر حملے کے لیے) اکٹھے ہو چکے ہیں ان سے ڈریں''

اس آیت سے الناس سے مراد بہت سارے مفسرین کے بقول نعیم بن مسعود ہے جس نے ابوسفیان سے پیسے لیے تھے تا کہ مسلمانوں کو مشرکین کی طاقت سے ڈرائے اور خوفزدہ کرے۔ اسی طرح سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۱ میں ہے:

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ

اللہ تعالیٰ نے ان کی بات سن لی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ محتاج وفقیر ہے اور ہم بے نیاز ہیں۔ اس لیے وہ ہم سے زکوٰۃ مانگتا ہے۔

اس آیت میں بہت سارے مفسرین کے مطابق الذین سے مقصود ''حی بن اخطب'' یا ''فنحاص'' ہے کبھی لفظ جمع کا مفرد پر اطلاق بزرگی اور عظمت کے عنوان سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں آیا ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ

''ابراہیم اللہ کی بارگاہ میں ایک خاضع امت تھا'' (نحل/۱۲۰)

یہاں پر لفظ ''امت'' اسم جمع ہے جس کا اطلاق ایک فرد پر ہوا ہے (اس سے پہلے بھی اس بارے میں تفصیلاً بحث ہو چکی ہے)۔

۳۔ آیت مباہلہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیٹی کے بیٹوں کو بھی حقیقت میں ''ابن'' کہا جاتا ہے برخلاف اس کے جو دور جاھلیت میں مرسوم تھا کہ صرف بیٹوں کے بیٹوں کو اپنا بیٹا سمجھا جاتا تھا اور وہ کہتے تھے۔

بَنُوْنَا بَنُو اَبْنَائِنا وَ بَناتِنَا
بُنُوهُنَّ اَبْنَاءُ الرِّجالِ اَباعِدِ

یعنی: ہمارے بیٹے صرف ہمارے پوتے ہیں۔ ہمارے نواسے غیروں کے بیٹے ہیں نہ کہ ہمارے

یہ طرز تفکر اُسی غلط جاہلی سنت کی پیداوار تھا کہ جو بیٹیوں اور عورتوں کو انسانی معاشرہ کا اصلی جز نہیں سمجھتے تھے اور انہیں بیٹوں کی

حفاظت اور پرورش کے لیے ظروف کے طور پر سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ان کا شاعر کہتا ہے:

وَ اِنَّما اُمَّهاتُ النَّاسِ اَوْعِيَة
مُسْتَودَعاتُ و لِلْاَنْسَابِ آباء

لوگوں کی مائیں صرف ان کی پرورش کے لیے ظروف کا حکم رکھتی ہیں اور نسب کے لیے صرف باپ پہچانے جاتے ہیں۔

لیکن اسلام نے اس طرز فکر کی سختی سے مخالفت کی اور اسے ختم کرتے ہوئے بیٹوں کے احکام کو پوتوں اور نواسوں پر یکساں طور پر جاری کیے۔ قرآن مجید کی سورہ انعام کی آیت ۸۵ میں حضرت ابراہیمؑ کے فرزندوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ابراہیم کے فرزندوں میں سے داود، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ ھارون تھے اور اسی طرح ہم نیک افراد کو جزا دیتے ہیں نیز زکریا، یحیٰ، عیسی اور الیاس بھی ان کے بیٹے تھے جو سب کے سب صالحین تھے:

اس آیت میں حضرت عیسیٰ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹوں میں شمار کیے گئے ہیں حالانکہ وہ ان کی بیٹی کے بیٹے تھے۔ شیعہ وسنی ذرائع سے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں منقولہ روایات میں ''ابن رسول اللہ'' (رسول خدا کے بیٹے) کا اطلاق مکرر سامنے آیا ہے۔

جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان آیات میں آیا ہے: ''وحلائل ابنائکمْ'' (یعنی تمہارے بیٹوں کی بیویاں) فقہائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ مسلم ہے کہ بیٹوں کی بیویاں اور پوتوں اور نواسوں کی بیویاں حرام ہیں اور مذکورہ آیت کے حکم میں پوتوں اور نواسوں دونوں کی بیویاں ہیں۔

آیت مباہلہ کے حوالے سے قابل توجہ نکات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مشہور حدیث میں آیا ہے کہ مامون عباسی نے امام علی بن موسی الرضاؑ سے سوال پوچھا کہ آپ کے جد علی بن ابی طالبؑ کی بلافصل خلافت پر کونسی دلیل ہے؟ انہوں نے جواب دیا آیت ''اَنْفُسَنَا''، مامون نے کہا اگر ''نسائنا'' کا لفظ نہ ہوتا تو! امام - نے جواب میں فرمایا: اگر ''ابنائنا'' نہ ہوتو!

علامہ طباطبائی ان پر معنی اور مختصر جملات کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

امام - کا آیت ''انفسنا'' سے استدلال اس پہلو سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کو پیغمبر اکرم ﷺ جیسا اور ان کے نفس اور جان کی منزلت پر قرار دیا ہے، (اس بنا پر وہ سب سے افضل اور امامت کے لیے لائق اور قابل ترین شخص تھے اور رسالت و نبوت کے مقام کے علاوہ باقی تمام امور میں آپؑ جیسے تھے)

مامون کا جواب دراصل اس استدلال پر اعتراض تھا اُس نے کہا کہ نسائنا (ہماری عورتیں) کا لفظ یہ دلیل ہوسکتا ہے کہ

"انفسنا" کا معنی "رجالنا" (ہمارے مرد) ہونہ کہ جان اور نفس نبی ہونے کے معنی میں، امام -کا دوبارہ جواب اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر "انفسنا" "رجالنا" کے معنی میں ہوتا تو پھر "ابنائنا لانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ افراد بھی رجال اور نساء کے الفاظ میں داخل ہیں۔ (اگر اولاد مونث ہوتو نساء میں اور اگر مذکر ہوتو رجال میں داخل ہے) پس "انفسنا" "رجالنا" کے معنی میں نہیں ہے۔[1] (غور کیجیے گا)

بحارالانوار میں مأمون والا واقعہ ایک اور طرح سے بیان ہوا ہے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ امام رضا -سے کسی اور مقام پر سوال و جواب ہوا ہے، یہ روایت کہتی ہے: ایک دن مامون نے امام علی بن موسیٰ الرضا -سے عرض کیا کہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کی سب سے بڑی فضلیت جو قرآن نے بتائی ہے بیان کریں۔ امام -نے فرمایا آیت مباہلہ ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ فَمَنْ حاجّك فيه ..... جب یہ آیت نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین ÷ کو بلایا، پس یہ دو افراد "ابنائنا" کے مصداق ٹھہرے، آپؐ نے فاطمہؑ کو بھی بلایا اس بنا پر "نسائنا" کی مصداق وہ ٹھہریں اور امیر المومنین -کو بھی ساتھ لیا، اور وہ حکم الٰہی سے رسول اللہ کے نفس اور جان تھے اور جب مخلوق خدا میں سے کوئی بھی رسول خدا ﷺ سے افضل اور بالاتر نہیں ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ کوئی بھی نفس رسول اللہ، یعنی علیؑ سے کوئی بھی افضل نہیں ہے۔

مامون نے کہا: ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ "انفسنا" کا مصداق خود حضور ﷺ کی ذات اقدس ہیں نہ کوئی اور۔ امام -نے جواب میں فرمایا: کیا کوئی اپنے آپ کو بھی بلاتا اور دعوت دیتا ہے؟ اور چونکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے علاوہ علیؑ کو بھی بلایا ہے پس معلوم ہوا کہ علیؑ نفس رسول اور جان رسول ہیں۔[2]

[1] تفسیر المیزان، جلد ۳، صفحہ ۲۳۰۔

[2] بحارالانوار جلد ۱۰، صفحہ ۳۵۰ (اختصار کے ساتھ)

۲۔آیت خیرالبریہ

سورہ بینہ کی آیت ۷ اور ۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓـئِكَ هُمۡ خَيۡرُ الۡبَرِيَّةِ ؕ‏ ﴿۷﴾ جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَآ اَبَدًا ‌ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ‌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾

جولوگ ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیئے یہی بہترین مخلوق ہیں ان کا صلہ ان کے رب کے پاس دائمی باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جن میں وہ ابد تک ہمیشہ رہیں گے۔اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور یہ (بلند و بالا مقام) ان کے لیے جو اپنے رب (کے عذاب) سے ڈرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اور اس سے پہلے والی آیات میں بہترین اور بدترین مخلوق کا تعارف کرایا ہے اہل کتاب میں سے کافر اور مشرک مختلف قسم کے حیلوں اور سازشوں کے ذریعے نور حق کو بجھانے کی فکر میں ہیں یہ لوگ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ان کا تعارف اللہ تعالیٰ نے شر البَرِیّۃ [1] (بدترین مخلوق) کے طور پر کرایا ہے۔ان کے برعکس مومن افراد ہیں جو اپنے ایمان کے سایے میں راہ حق کو پا چکے ہیں یہ لوگ اعمال صالح کا منبع تھے اور ہیں یہ خود بھی ہدایت یافتہ ہیں اور دوسروں کے لیے چراغ ہدایت ہیں ان کا تعارف اللہ تعالیٰ نے خیر البریۃ (بہترین مخلوق) کے عنوان سے کرایا ہے۔

یہ درست ہے کہ آیت کا معنی و مفہوم وسیع ہے اور کسی ایک خاص فرد یا خاص افراد میں منحصر نہیں ہے لیکن شیعہ و سنی احادیث کی کتابوں میں متعدد روایات میں خاص اشخاص پر انگلی رکھی گئی ہے کہ خیر البریۃ کے درجات میں سے اول درجے کے افراد یہ ہیں۔ان احادیث کے معنی میں غور و خوض کرنے سے بہت سارے ایسے حقائق روشن ہو سکتے ہیں جو کچھ افراد کے لیے ابھی تک مبہم تھے، اور اس سے بہت سارے نادانستہ طور پر لگائے گئے الزامات کا بھی واضح جواب مل سکتا ہے۔یہاں پر ہم قارئین کی توجہ ان میں سے بعض روایات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

ا۔مشہور معروف مفسر سیوطی اپنی کتاب الدر المنثور میں مذکورہ آیت کے حوالے سے ابن عساکر کے ذریعے جابر بن عبداللہ انصاری سے

---

[1] بریہ کا مصدر ''بَرء'' ہے جس کا معنی خلق ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو باری یعنی خالق اور مخلوقات کو بریہ کہا جاتا ہے بعض افراد کا کہنا ہے کہ ''بریہ''، ''بَرَی'' (بروزن برگ) سے ہے جس کا معنی خاک مٹی ہے اور چونکہ مخلوقات کو خاک سے خلق کیا گیا ہے، اس لئے انہیں ''بریہ'' کہا گیا ہے۔بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بریہ ''بَرَیۡتُ القَلَمَ'' (''میں نے قلم تراشا'') سے اخذ کیا گیا ہے۔اور چونکہ مخلوقات اپنی شکل و قامت کے لحاظ سے حکم الٰہی سے مختلف صورتوں میں بنی ہیں گویا یہ قلم ہی جو قدرت کے خارکانے میں تارشے جاتے ہیں اس لئے انہیں بریہ کہتے ہیں۔دیکھیں: تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۷۲۳۵، مفردات راغب اور دیگر لغت کی کتابیں۔

بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں علیؑ ہماری طرف تشریف لائے۔ جب پیغمبر اکرم ﷺ کی نظران پر پڑی تو فرمایا:

وَ الَّذِی نَفْسِی بِیَدِہِ اِنَّ ھذا وَ شِیْعَتَہُ لَھُمُ الفَائِزُونَ یَوْمَ القِیَامَۃِ و نَزَلَتْ اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوا و عملوا الصالحات اولئك هم خير البرية فكان اصحاب النبی اذا اقبل عَلِیٌّ قالوا جاء خير البرية۔

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہ اور اس کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب وکامران ہوں گے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی وجہ سے جب علیؑ تشریف لاتے تو اصحاب رسول کہتے تھے خیر البریہ (بہترین مخلوق) تشریف لائے ہیں۔[1]

یہی روایت اسی مضمون اور الفاظ کے ساتھ حاکم حسکانی کی شواہد التنزیل میں بھی ذکر ہوئی ہے۔[2]

۲۔ایک روایت میں ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ جب آیت: "اِنَّ الّذِین آمَنُو وعملو الصالحات اُولئكَ هُمْ خَيْرُ البريّة" نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم ﷺ نے علیؑ سے فرمایا: هُوَ اَنْتَ وَشِيْعَتّكَ تَاتی اَنْتَ وَشِيْعَتُكَ يَوْمَ القَيامَةِ راضينَ مَرْضِيينَ ويَأتِي عَدُوكَ غضباناً مُقْمِحين۔ یعنی: یہ تم اور تمہارے شیعہ ہیں، تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے دن اس طرح سے آئیں کہ اللہ تم سے راضی ہوگا اور تم اللہ سے راضی ہوگے جب کہ تمہارا دشمن ناراحت اور زحمت (اور عذاب) میں ہوگا[3]

(بعض حدیث کے نسخوں میں مقمحین کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب ہے زنجیروں میں جکڑا کر الٹا لٹکانا ہے)

۳۔ایک حدیث ابوبرزہ سے منقول ہے کہ جب آنحضرتؐ اس آیت کی تلاوت فرماتے تھے تو علیؑ کی طرف رخ کر کے فرماتے تھے: هُمْ اَنْتَ و شِيعَتُكَ يا علی و مِعَيادُ ما بَيْنِی وَبَيْنَكَ الحوض۔ یعنی: اے علی! خیر البریۃ آپ اور آپ کے شیعہ ہیں، میری اور آپ کی وعدہ گاہ حوض کوثر ہے۔[4]

۴۔تفسیر الدر المنثور میں بیان ہوا ہے کہ ابن مردویہ نے علیؑ سے نقل کیا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے مجھے فرمایا:

اَلَمْ تَسمَعْ قَوْلَ اللہِ اِنَّ الّذِیْنَ آمَنَوا و عَمِلُوا الصالحاتِ اُولئكَ هُمُ البَرِيَّة اَنْتَ وَ شِيْعَتُكَ و مَوْعِدى و مَوْعِدُ كم الحَوْضُ اِذَا جِئْتُ الاُمَمَ لِلحِسابِ تُدْعَوْنَ غُرّاً

---

[1] الدر المنثور، جلد ۶۔صفحہ ۳۷۹

[2] شواہد التنزیل

[3] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۳۵۷، حدیث ۱۱۲۶، اسی مطلب کو ابن حجر نے صواعق ص ۹۶ پر اور شبلنجی نے نور الابصار ص ۷۰ اور ۱۰۱ پر ذکر کیا ہے۔

[4] شواہد التنزیل، جلد ۲ صفحہ ۳۵۹، حدیث ۱۱۳۰۔

مُحَجَّلِيْنَ

کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں سنا کہ جولوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے وہ بہترین مخلوق ہیں، اور وہ آپ اور آپ کے شیعہ میں میری اور تمہاری وعدہ گاہ حوض کوثر ہے جب میں امتوں کے حساب و کتاب کے لیے آؤں گا تمہیں پکارا جائے گا اس حالت میں کہ آپ کی پیشانی سفید اور جانی پہچانی ہوگی۔[1]

۵۔ اسی طرح سے شواہد التنزیل میں مذکورہ ہے کہ عطیہ عوفی کا بیان ہے کہ ہم جابر بن عبداللہ انصاری کے پاس پہنچے اس وقت بڑھاپے اور کبر سنی کی وجہ سے ان کے ابرو ان کی آنکھوں پر پڑ چکے تھے، ہم نے کہا: ''اخبرنا عن عليٍ'' یعنی: ہمیں حضرت علیؑ کے بارے میں بتاؤ۔ جابر نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ابروں کو اوپر کیا اور کہا: ذالك مِنْ خَيْرِ البَرِيّه۔ یعنی: وہ اللہ کی بہترین مخلوق سے ہے۔[2]

۶۔ گنجی شافعی نے کفایہ المطالب میں عطا سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عائشہ سے علیؑ کے متعلق پوچھا انہوں نے جواب میں کہا: ذاك خَيْرُ البشرِ لا يَشُكُّ فِيه اِلَّا كافِرًا۔ یعنی: وہ بہترین بشر ہے اس میں کافر کے سوا کوئی شک نہیں کرتا۔[3]

اسی کتاب میں حذیفہ یمانی سے نقل ہوا ہے کہ میں نے پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: عَلِيٌّ خَيْرُ الْبَشَرِ مَنْ اَبَى فَقَدْ كَفَر ۔ یعنی: علی بہترین انسان ہے جو اس سے انکار کرے وہ کافر ہے۔[4]

بڑی واضح سی بات ہے کہ یہ تمام الفاظ رسول خدا صلى الله عليه وآله وسلم کے بعد علیؑ کی شخصیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ یعنی حضرت رسول خدا صلى الله عليه وآله وسلم کے بعد وہ خیر البشر ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اہلسنت کے بڑے مفسر آلوسی جو کہ علیؑ کے فضائل کی احادیث کے بارے میں خاص طور پر بڑا سخت رویہ رکھتے ہیں (اس کتاب میں کئی مرتبہ اس کے نمونے پیش کے گئے ہیں) اس نے اس آیت کے ضمن میں احادیث نبوی قابل توجہ تعداد نقل کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ ان روایات کا مطلب یہ نہیں کہ یہ آیت علیؑ اور ان کے شیعوں اور پیروکاروں کے لیے مخصوص ہے اگر چہ بلا شک وشبہہ وہ اس آیت میں داخل ہیں اور اول درجے پر فائز ہیں۔

اس کے بعد وہ وضاحت کرتے ہیں کہ اگر چہ امامیہ علیؑ کو انبیاء اور فرشتوں سے افضل سمجھتے ہیں لیکن رسول خدا صلى الله عليه وآله وسلم کو ان سے افضل جانتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خیر البریۃ سے مربوط احادیث کو بہت سارے افراد نے مشہور اسلامی کتب میں نقل کیا ہے، اور یہ علیؑ کی تمام مسلمانوں اور اصحاب پر رسول خداؐ کے بعد برتری اور افضلیت پر بہترین ادلہ ہیں۔

اس بات کو ان حالات کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے جب علیؑ کے دشمنوں نے ان سے عداوت اور دشمنی کی بنا پر بنی

---

[1] الدر المنثور، جلد ۶۔ صفحہ ۳۷۹

[2] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۳۶۴، حدیث ۱۱۴۲۔

[3] کفایۃ الطالب، صفحہ ۱۱۸ (احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۸۸ کے نقل کے مطابق)

[4] کفایۃ الطالب، صفحہ ۱۱۸ (احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۸۸ کے نقل کے مطابق)

امیہ کے تاریک اور ظالمانہ دور میں فضائل علیؑ کو چھپانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور علیؑ کے دوستوں نے ان ظالموں سے خوف کی بنا پر فضائل علیؑ کو کتمان کیا اور چھپایا۔ لیکن پھر بھی یہ تمام بڑے فضائل ان تاریک اور ظالمانہ ادوار کو عبور کر کے سالوں اور صدیوں کا سفر طے کر کے ہم تک پہنچ گئے ہیں اور یہی حیرانی کی بات ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس آیت سے احادیث کی مدد سے دو نکات اچھی طرح سے ثابت ہوتے ہیں۔

ا۔ تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے علیؑ کا افضل ہونا

چونکہ غیر افضل کو افضل پر مقدم کرنا اور اُسے ترجیح دینا ایک ناپسندیدہ اور بُرا کام ہے، لہٰذا کسی بھی صورت میں علیؑ پر اس کے غیر کو مقدم نہیں کیا جا سکتا، اس بنا پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا خلیفہ اور جانشین انہیں ہونا چاہیے تھا خواہ خلافت کا تقرر اللہ کی جانب سے ہو (جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے) یا لوگوں کی طرف سے ہو جس طرح دوسروں کا عقیدہ ہے۔

۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر حضرت علیؑ کے پیروکاروں کا نام ''شیعہ''

دوسرا نکتہ ان متعدد احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ کے پیروکاروں کا شیعہ نام ہونا خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے کئی مرتبہ جاری ہوا ہے، جو لوگ اس عنوان سے دشمنی رکھتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں اور کبھی اس کی شین کو شوم (بدبخت) اور شر جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں وہ درحقیقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے ہیں اور نعوذ باللہ وہ ان کے قول سے نفرت کرتے ہیں۔

یقیناً اگر وہ دانستہ طور پر ایسی باتیں کریں تو ان کا م انتہائی دشوار ہے۔ کیا ہی اچھا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ وہ ان احادیث نبوی سے آگاہ نہیں ہیں۔ سچ یہ ہے کہ لقب شیعہ، نفرت کا موجب نہیں ہے بلکہ ان متعدد اور معتبر روایات کے مطابق ایسا افتخار کا تاج ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکتب علی- کے پیروکاروں کے سر پر سجایا ہے، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کو اس افتخار کے لائق اور قابل بنا دے۔

۳۔آیت شب ہجرت (لیلۃ المبیت)

سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۷ میں ارشاد رب العزت ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ ۢ بِالۡعِبَادِ﴿۲۰۷﴾

ورلوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی مرضی کی خاطر اپنی جان کو بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

اس آیت کے شان نزول میں بہت ساری روایات اہم ترین اسلامی کتب میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔اہل سنت کے مشہور مفسر ثعلبی اپنی تفسیر میں اس آیت کا شان نزول یوں بیان کرتے ہیں: جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تو قرض اور امانتیں جو لوگوں نے آنحضرتؐ کے سپرد کی تھیں، واپس لوٹانے کے لیے آپؐ نے علی ابن ابی طالبؑ کو ذمہ داری سونپی ہجرت کی رات جب آنحضرتؐ غار کی طرف روانہ ہوئے تو آپؐ کے گھر کو کفار نے گھیرے میں لے رکھا تھا اس حالت میں آپؐ نے علیؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا، اور فرمایا میرے سبز رنگ کی جو چادر ہے (جسے میں سوتے وقت اوڑھ لیتا ہوں) وہ اپنے اوپر اوڑھ لیں اور میرے بستر پر سو جائیں انشااللہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

علی –نے حکم کی تعمیل کی اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے جبرائیل اور مکائیل کو وحی فرمائی کہ میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ لمبی قرار دی ہے تم میں سے کون اپنی زندگی کو دوسرے پر قربان کرسکتا ہے (اور زیادہ عمر دوسرے کے لیے چاہے) دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے لیے لمبی زندگی کا تقاضا کیا۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا تم دونوں نے علیؑ کا طرز عمل کیوں اختیار نہ کیا میں نے علیؑ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے اور علیؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سو گئے اور اپنی جان کو ان پر قربانی کے لیے پیش کر دیا اب تم دونوں زمین پر جاؤ اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کرو، وہ دونوں زمین پر اترے، جبرئیل سرہانے کھڑے ہو گئے اور میکائیل پائنتی کی طرف کھڑے ہو گئے۔ جبرئیل کہنے لگے واہ واہ! اے علی! تیری کیا بات ہے! تیرے جیسا کون ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے فرشتوں کے درمیان فخر و مباہات فرما رہا ہے۔اس موقع پر جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے کی طرف رواں دواں تھے تو یہ آیت (وَ مِنَ النّاسِ مَنۡ یَشۡرِی نَفۡسَهُ ابۡتِغاءَ مَرۡضاةِ اللهِ) علیؑ کی شان میں نازل ہوئی:

ثعلبی کی اس حدیث کو اسی تفصیل کے ساتھ امام غزالی نے احیا العلوم (جلد ۳، صفحہ ۲۳۸) میں گنجی نے کفایۃ الطالب (صفحہ ۱۱۴) میں۔۔ابن صباغ مالکی نے الفصول المھمہ (۳۳) میں سبط بن جوزی حنفی نے تذکرۃ الخواص (صفحہ ۲۱) میں اور

شبلنجی نے نورالابصار (صفحہ ۸۲) میں بیان کیا ہے۔[1]

۲۔حاکم حسکانی نے ''شواہدالتنزیل'' میں ابوسعید حذری سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُسی مطلب کوذکر کیا ہے۔[2]

۳۔مذکورہ کتاب میں ہی ابن عباس سے منقول ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ کالباس زیب تن کرنے والے اورآپ کے بستر پرسونے والے علیؑ تھے (لیکن اس نے اس بیان میں آیت کی طرف اشارہ نہیں کیا۔)[3]

۴۔نیز مذکورہ کتاب میں عبداللہ بن سلیمان (کسی اور نسخے میں عبداللہ بن عباس) سے یہی مطلب بیان ہوا ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس رات غار کی طرف چلے گئے اوراپنے بستر پرعلیؑ کوسُلایا، حضرت ابوبکر، آپؐ کے پیچھے گئے، کفار مکہ ساری رات حضرت علیؑ کو دیکھتے رہے اور پہرہ دیتے رہے (اوروہ سمجھتے رہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورہے ہیں) جب صبح ہوئی تو اچانک انہوں نے دیکھا یہ تو علیؑ ہیں، انہوں نے پوچھا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہاں ہیں؟

علی -نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں، انہوں نے کہا: ہم حیران ہورہے تھے کہ جب ہم تم پر پتھر پھینکتے تھے توتم پیچ وتاب کھاتے اور پہلو بدلتے تھے جب کہ ہم جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پتھر پھینکتے تھے تو وہ بالکل نہیں ہلتے تھے۔اور یہ آیت اسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ[4]

۵۔حاکم نیشاپوری اپنی مشہور کتاب ''مستدرک الصحیحین'' میں ابن عباس سے یوں نقل کرتے ہیں: علیؑ نے اپنی جان اللہ تعالیٰ کو بیچ دی، پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لباس کو پہنا اور پھران کے بستر پرسو گئے۔۔۔اس حدیث کے آخر میں وہ کہتے ہیں: هذا حديث صحيحُ الاَ سنَادِ وَلَمْ يُخرِ جاه۔ یعنی: یہ حدیث معتبر اورصحیح السند ہے اگر چہ بخاری اور مسلم نے اسے اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا۔

۶۔مذکورہ کتاب میں ہی حکیم بن جبیر کے ذریعے علی بن الحسین -سے منقول ہے کہ :اِنَّ اَوَّلَ مَنْ شَرَى نَفْسَهُ ابتغاء مرضاةِ اللهِ عَلِيّ ابن ابی طالبٍ۔ یعنی: سب سے پہلے جس نے اپنی جان اللہ کی رضاوخوشنودی کے عوض فروخت کی ہے وہ علی بن ابی طالب ہیں[5] اس کے بعدوہ مزید لکھتے ہیں کہ جب علیؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پرسونے کی تیاری کررہے تھے تو اپنی زبان پر یہ اشعار گنگنارہے تھے:

وَقَيْتُ بِنَفْسى خَيْرَ مَنْ وَطَئَ الْحَصَى
وَ مَنْ طَافَ بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ وَ بِالْحِجْرِ

---

[1] الغدیر، جلد۲، صفحہ ۴۸۔

[2] شواہدالتنزیل جلد۱، صفحہ ۹۸

[3] شواہدالتنزیل جلد۱، صفحہ ۱۰۰

[4] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۴، (دارالمعرفہ، بیروت)

[5] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۴، (دارالمعرفہ، بیروت)

رَسُوْل اِللّٰهِ خافَ اَنْ یَمْکُروا بِهِ
فَنَجّاهُ ذُو الطَّولِ الِالٰهِ مِنَ الْمَکْرِ
و بَاتَ رَسُولُ اللّٰهِ فی الْغارِ آمِناً
مُوَقّیً وفی حِفْظِ الالِهِ وَ فی سَتْرِ
وَ بِتُّ اُرائیهِمْ وَ لَمْ یَتَّهِمُوْنَنی
و قَدْ وَطَّنْتُ نَفْسی عَلَی الْقَتْلِ وَ الاَسْرِ

میں نے اپنی جان پر کھیل کر اس ہستی حفاظت کی ہے جو روئے زمین پر سب سے اعلیٰ اور اشرف انسان ہے وہی جس نے خانہ کعبہ اور حجر اسود کا طواف کیا۔ وہی رسول خدا کی ذات جو دشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے پریشان تھے اور قادر مطلق نے انہیں دشمن کی مکروہ چالوں سے بچا لیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غار میں امن وامان سے رات گزاری وہ اللہ کی حفاظت اور پناہ میں تھے۔ اور میں دشمنوں کا خیال رکھے ہوئے تھا انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ پر سویا ہوا ہوں جب کہ وہ قتل کرنے اور اسیر کرنے کی غرض سے آئے تھے۔[1]

مندرجہ بالا اشعار دیگر کتب میں بھی ذکر ہوئے ہیں، یہ اشعار جہاں علیؑ کے انتہائی ایثار اور جذبہ قربانی کی غمازی کررہے ہیں وہاں ان کے افتخار اور سر بلندی کو بھی بیان کررہے ہیں۔

۷۔ مشہور مورخ طبری ہجرت کے واقعے کو یوں لکھتے ہیں: ''علی - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سوئے ہوئے تھے دشمن نگرانی کر رہے تھے اور ان کو سوتے ہوئے دیکھ رہے تھے جب کہ انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اپنے اوپر اوڑھ رکھی تھی وہ کہتے تھے! خدا کی قسم یہ وہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں! یہاں تک کہ صبح ہوگئی، علیؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر سے اٹھے! طبری نے اس واقعے کو اس آیت: **''وإِذ یمکُرُ بِكَ الَّذِینَ کَفَرُوا لِیُثْبِتُوكَ''** (آیت نمبر ۲۰ رسورہ انفال) کے ساتھ ذکر کیا ہے یہ آیت بھی واقعہ ہجرت سے متعلق ہے۔''[2]

۸۔ ابن اثیر ''اسد الغابہ'' میں علیؑ کے فضائل کے باب میں ذکر کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ فرمایا اور اپنے پاس موجود امانتوں کو لوٹانے اور قرض کی ادائیگی کے لیے آپؐ نے علیؑ کو مکہ میں ٹھہرایا، جس رات آنحضرتؐ مکے سے غار کی طرف گئے جبکہ کفار نے آپؐ کے گھر کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ آپؐ نے علیؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا، علیؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اپنے اوپر تان لی (اس کے بعد اس نے شب ہجرت کا قصہ اور جبرئیل اور میکائیل کو وحی الٰہی کو نقل کیا) آخر میں وہ لکھتے ہیں: اس کے

[1] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۴

[2] تاریخ طبری، جلد ۲، صفحہ ۱۰۰

بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیت: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ" کو اپنے رسول پر نازل کیا اور آپ اُس وقت مدینے کی طرف رواں دواں تھے۔ [1]

۹۔ احمد بن حنبل، اہل سنت کے چار مشہور اماموں میں سے ایک ہیں ان کی کتاب مسند بڑی مشہور کتاب ہے اس میں وہ اس آیت: "وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ ..." جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یاد کریں جب کفار نے یہ منصوبہ بنایا تمہیں قید کریں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی مکروہ چالیں چل رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کرنے والا ہے) کی تفسیر میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ کفار مکہ نے آپس میں مشاورت کی بعض نے کہا انہیں صبح کے وقت دیکھیں گے اور قید کر کے زندان میں ڈال دیں گے (ان کی مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے) بعض نے کہا انہیں قتل کر دیں اور بعض نے کہا انہیں شہر بدر کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سازش سے آگاہ فرمایا۔ اس موقعہ پر علیؑ بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سوئے۔ (اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکے سے نکل گئے) [2]

امام احمد آیت "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ" کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے لیکن "و اذ یمکر بك الذین" پر جو کہ ہجرت کے واقعے کے متعلق ہے، بات کرتے ہیں۔

جو کچھ ذکر ہوا ہے روایات فقط اسی میں منحصر نہیں ہیں دیگر اہم ترین کتب میں بہت ساری روایات اس بارے میں منقول ہیں، مزید مطالعہ کے لیے ان کتب کو پڑھا جا سکتا ہے:

احقاق الحق [3] شواہد التنزیل [4] فضائل الخمسہ [5] الغدیر [6] اور تفسیر برھان [7]

☆☆☆☆

---

[1] اسد الغابہ، جلد ۴، ص ۲۵

[2] مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۳۴۸ (طبع دار صادق، بیروت)

[3] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۳ تا ۴۵، جلد ۶، صفحہ ۴۷۹ تا ۴۸۱، اور جلد ۸، صفحہ ۳۳۵، تا ۳۴۸، اور جلد ۱۴، صفحہ ۱۱۶ تا ۱۳۰

[4] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۹۶ کے بعد

[5] فضائل الخمسہ، جلد ۲، صفحہ ۳۴۵ کے بعد

[6] الغدیر، جلد ۲، صفحہ ۴۹ کے بعد

[7] تفسیر برھان، جلد ۱، صفحہ ۲۰۶ اور ۲۰۷

۴۔ آیت حکمت

سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۹ میں ارشاد الٰہی ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے (جو اُس لائق ہوتا ہے) اُسے حکمت و دانائی عطا کرتا ہے اور جسے بھی حکمت و دانائی دی جائے اُسے کثیر خیر عطا کی گئی ہے۔

حاکم حسکانی شواہد التنزیل میں ربیع بن خیثم سے نقل کرتے ہیں کہ علیؑ کا نام اس کے سامنے لیا گیا تو اس نے کہا:

لَمْ اَرهُم يَجِدُونَ عَلَيْهِ فِي حُكْمِهِ وَ اللهُ تعالىٰ يَقُولُ وَ مَنْ يُؤتَ الحكمة فَقَدْ اُوتِيَ خَيْراً كثيراً

میں نے کسی کو نہیں پایا جو ان کے فیصلوں اور احکام پر اعتراض کرے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس کو علم و دانائی دی گئی ہو اُسے خیر کثیر دی گئی ہے۔[1]

اسی کتاب میں بالکل اسی معنی و مفہوم یا اس سے قریب معنی کی چند احادیث اور بھی بیان ہوئی ہیں۔ وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **مَنْ ارادَ اَنْ يَنْظُرَ اِلى ابراهِيمَ فِي حِلْمِهِ وَ اِلى نوح في حِكْمَتِهِ وَ اِلٰى يُوسف فِي اِجْتِماعِهِ فَلْيَنْظُر اِلى عَلِيِّ بن ابي طالِبٍ**۔ یعنی: جو شخص ابراہیم کا حلم، نوح کی حکمت و دانائی اور یوسف کی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ علی ابن ابی طالب کو دیکھے۔[2]

ایک اور مقام پر ابوالحمراء سے نقل ہوا ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں علیؑ ہماری طرف تشریف لائے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "**مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَنْظُرَ اِلى آدَمَ فِي عِلْمِهِ وَنُوحٍ فِي فَهْمِهِ وَاِبراهِيمَ في خُلَّتِهِ فَلْيَنْظُرْ اِلى عَلِيِّ بن ابي طالب**۔" یعنی: جو شخص اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ وہ آدم کے علم کو، نوح کی فہم و فراست کو اور ابراہیم کو خلیل الٰہی ہونے میں دیکھے تو اُسے چاہیے کہ علی ابن ابی طالب کی طرف دیکھے (کیونکہ ان میں یہ تمام صفات اکٹھی ہوگئی ہیں)[3]

نیز عبداللہ ابن عباس سے ہی انہوں نے ایک اور حدیث نقل کی ہے کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھا، کسی نے حضرت علیؑ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **قُسِّمَتْ الحِكْمَةُ عَشَرَةَ اَجزاءٍ فَاُعْطِيَ عَلِيٌّ تِسعَةَ اَجْزاءٍ**

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۱۰۷، حدیث ۱۵۰

[2] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۱۰۶، حدیث ۱۴۷

[3] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۷۹، حدیث ۱۱۶

وَ اُعْطِیَ النَّاسُ جُزْءً واحِدًا۔ یعنی: حکمت ودانائی کودس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے،اس میں سے نو حصے علیؑ کودیئے گئے ہیں اور ایک حصہ باقی تمام لوگوں کودیا گیا ہے۔[۱]

یہ الفاظ اچھی طرح واضح کرتے ہیں کہ امت اسلامی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی بھی علم ودانش اور حکمت ودانائی میں علیؑ کے پایے کا نہیں ہے۔ اور چونکہ امامت کا اہم ترین رکن علم وحکمت ہے لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امامت وخلافت کے لیے لائق ترین اور قابل ترین شخصیت علی ابن علی ابی طالب - تھے۔صحیح ترمذی میں بھی منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَنَا دَارُ الحِکْمَۃِ وَعَلِیٌّ بَابُہَا

میں علم وحکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔[۲]

مسلم بات ہے کہ جوبھی گھر میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اُسے دروازے سے ہی آنا پڑے گا،جس طرح قرآن مجید نے ہمیں حکم دیا ہے:"وَ اتُو البُیُوتَ مِنْ اَبْوَابِہَا یعنی: گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ۔"(بقرہ/۱۸۹) بنابرایں جوشخص یہ چاہتا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم وحکمت کےخزانوں تک رسائی حاصل کرے تو اُسے علیؑ کی خدمت میں آنا پڑے گا اوران خزانوں کی چابی ان سے مانگنی پڑے گی۔

---

[۱] شواہدالتنزیل،صفحہ ۱۰۵،حدیث ۱۴۶

[۲] صحیح ترمذی، ج۵،ص ۶۳۷ (کتاب المناقب،بان مناقب علی بن ابی طالب،حدیث ۳۷۲۳)

۵۔ سورہ ھل اَتی

سورہ ھل اَتی یا دہر علیؑ اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضلیت پر ایک اور اہم دلیل اور سند ہے، اس سورت کے مفاہیم میں اور الفاظ میں غور و فکر اور اس کے شان نزول میں تدبر بہت سارے حقائق سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اس سورت کی آیات ایک کلی موضوع کو بیان کر رہی ہیں لیکن اس کی سترہ آیات جو ''اِنَّ الابرار یشرَبون مِنْ کأسٍ کان مزاجھا کافوراً'' سے شروع ہوتی ہیں اور بائیسویں آیت پر ختم ہوتی ہیں، ''ابرار'' (نیک افراد) کے بارے میں ہیں۔ اس حوالے سے جو شان نزول بیان ہوئے ہیں، نیز اسلامی کتب میں متعدد روایات موجود ہیں، ان سب کے مطابق اس آیت میں ابرار کے اتم اور اکمل مصداق، حضرت علیؑ حضرت فاطمہؑ، حضرت حسن- اور حضرت حسین - ہیں۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان سترہ آیات میں بہشت کی نعمتوں کی انواع و اقسام، اس کی بہترین اور اعلیٰ ترین نعمتوں (خواہ وہ مادی ہوں یا معنوی) کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جنت کے باغات، شراب طہور کے بہشتی چشمے، لباس، زینتیں، غذائیں، پلنگ اور مسہریاں، نوکر اور غلام اور عظیم نعمات اور عظیم سلطنت کی باتیں کی گئی ہیں۔ ان نعمتوں کے درمیان صرف بہشتی بیویاں اور حوروں کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ قران کے اسرار و موز سے واقف بعض افراد کا کہنا ہے کہ ایسا خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی بہت کم ایسی سورتیں ہیں جن میں اعلیٰ قسم کی ان تمام بہشتی نعمتوں کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ''ابرار'' سے مراد عام افراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد عظمت کی بلندیوں اور قرب الٰہی کی اعلیٰ منزل پر فائز نیک اور پاکیزہ افراد ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس سورہ کی آیت نمبر ۷ سے ۱۰ تک میں ان ابرار اور نیک افراد کی صفات اور نشانیاں بیان کی گئی ہیں جن سے ان کی صورت حال اور بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا۝ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا۝

نیکی کے مرتبے پر فائز افراد (ابرار) ایسا مشروب پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایسا چشمہ ہے جس سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور خود اسے جہاں چاہیں گے جاری کر دیں گے۔ یہ لوگ نذر پوری کرتے ہیں اور اس دِن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی ہر طرف پھیلی ہوگی اور اپنی خواہش اور ضرورت کے باوجود اپنا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو کھلا دیتے ہیں۔ (اور وہ ان سے کہتے ہیں) ہم تمہیں صرف اللہ کے لیے کھانا کھلا رہے ہیں؛ ہم تم سے نہ کوئی معاوضہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکر گزاری۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس

دِن کا خوف ہے جو بڑا سخت اور شدید بدنظر ہوگا۔

شان نزول

زمخشری اپنی مشہور تفسیر کشاف میں ابن عباس سے یوں نقل کرتے ہیں کہ حسنؑ اور حسینؑ مریض تھے۔ رسول اکرمؐ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اصحاب نے حضرت علیؑ سے کہا: اے ابوالحسن! اگر اپنے بیٹوں کی شفایابی کے لیے نذر کر لیتے تو اچھا ہوتا، علیؑ، فاطمہؑ اور ان کی خادمہ فضہ نے نذر کی کہ اگر یہ شفا پا گئے تو ہم تین دن روزے رکھیں گے۔ (بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ امام حسن- اور امام حسین- نے بھی نذر کی تھی) [1]

دونوں بہت جلد شفایاب ہو گئے، چونکہ ان کے گھر میں خوراک نہیں تھی اس لیے علیؑ نے تین سیر جو قرضہ لیا۔ جناب فاطمہؑ نے ایک سیر کا آٹا گوندھا اور گھر والوں کی تعداد کے مطابق پہلے دن افطار کے لیے پانچ روٹیاں بنائیں، افطار کے موقعہ پر دروازے پر ایک فقیر نے آکر صدا لگائی اور کہا: السَّلامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ بَيْتِ مُحَمَّدٍ: میں ایک مسلمان مسکین ہوں مجھے کھانا کھلائیں اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ تمہیں بہشتی کھانے عطا کرے گا۔ انہوں نے مسکین کو اپنے پر ترجیح دی اور اپنا کھانا اٹھا کر مسکین کو دے دیا۔ اس رات پانی ہی سے روزہ افطار کیا، دوسرے دِن پھر روزہ رکھا، غروب کے وقت پہلے دِن کی طرح جب افطاری کے لیے کھانا آمادہ ہوا تو یتیم دروازے پر آ گیا، ان سب نے یتیم کو ترجیح دیتے ہوئے اپنا تمام کھانا یتیم کو دے دیا، تیسرے دِن ایک قیدی آ گیا اور انہوں نے سابقہ طرزِ عمل اپنایا، اگلی صبح کو حضرت علیؑ نے امام حسن -اور امام حسینؑ کو ساتھ لے کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت آئے۔

رسول خدا ﷺ نے دیکھا کہ وہ بھوک کی شدت سے لرز رہے تھے آپؐ نے فرمایا: میرے لیے تمہیں اس حالت میں دیکھ کر کتنا تکلیف دہ امر ہے، آنحضرتؐ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ فاطمہ زہرا ﷺ کے گھر تشریف لائے دیکھا کہ فاطمہؑ محراب عبادت میں مشغول عبادت ہیں لیکن بھوک کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ سخت پریشان ہوئے۔ اتنے میں جبرئیل نازل ہوئے اور کہا: اے محمد ﷺ یہ سورت لے لو! اللہ تعالیٰ اس قسم کے تمہارے اہل بیت ہونے پر تمہیں مبارک باد دے رہا ہے پھر اُس نے سورہ اہل اتی آپؐ پر تلاوت کی۔ [2]

اسی بات کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں زیر بحث آیات کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا ہے، یہاں پر اس واقعے کے حوالے سے اُس نے سائلین اور خاتون جنت کے چند اشعار کا بھی ذکر کیا ہے۔ [3]

نیز فخر رازی نے اپنی تفسیر میں واحدی کتاب الوسیط سے اور زمخشری نے کشاف میں اس واقعہ کو من وعن نقل کیا ہے۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے مزید لکھا ہے کہ ''اِنَّ الابرار یشربون...'' کا جملہ جمع کی صورت میں آیا ہے اور تمام نیکیوں کو شامل ہے۔ لہٰذا

---

[1] امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی نذر کا تذکرہ قرطبی کے نقل کے مطابق جعفی کی روایت میں ہوا ہے۔ تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۹۲۲۔

[2] تفسیر کشاف، جلد ۴، صفحہ ۶۷۰، اس سورت کی آیات کی تفسیر میں۔

[3] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۹۲۲۔

اس ایک فرد (علی ابن ابی طالب-) سے مختص نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ علیؑ آیات کے عمومی مفہوم میں داخل ہیں لیکن یہ ان سے مختص نہیں کیا جاسکتا البتہ اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ علیؑ ان آیات کے عمومی مفہوم میں داخل ہیں لیکن یہ ان سے مختص نہیں ہیں؛ مگر یہ کہا جائے گا کہ یہ سورہ علیؑ کی طرف سے مخصوص اطاعت انجام دینے کے موقعہ پر نازل ہوئی ہے۔ لیکن اصول فقہ میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ معیار لفظ کا عام ہونا ہے نہ کہ سبب کا مخصوص ہونا۔[1]

شاید فخر رازی اس بات کو بھول گئے کہ شان نزول یہ بتا رہا ہے کہ یہ آیات علیؑ، فاطمہؑ، حسن-، حسین- کے بارے میں نازل ہوئی ہیں نہ کہ صرف علی ابن ابی طالب- کے لیے تا اینکہ صیغہ جمع کی مشکل پیش آئے۔ علاوہ ازیں شان نزول سے مراد، آیت کے معنی کی عمومیت کو محدود کرنا ہرگز نہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پہلی بار یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب اس خاندان کی طرف سے خصوصی عبادت، اطاعت اور ایثار انجام پایا اور یہ بذات خود بہت بڑا انعام اور عظیم فضلیت ہے کہ ان کے عمل انجام پانے کے بعد ان آیات کا نزول ہوا دوسرے الفاظ میں علیؑ اور ان کے گھر والے ان آیات کے اعلیٰ مصداق ہیں بلکہ ان کا کامل ترین نمونہ شمار ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا پاکیزہ عمل ان آیات کے نزول کا موجب بنا ہے اگر کوئی اس عظیم فضلیت کا انکار کرنا چاہے تو اس نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔

آلوسی نے بھی روح المعانی میں اس واقعے کو مکمل طور پر ابن عباسؓ سے بیان کیا ہے آخر میں اس نے اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ لوگوں کے درمیان مشہور ہے۔ اس کے بعد جو اس کا طریقہ ہے اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی اہمیت کو کم کرے اور اسے معمولی واقعہ ثابت کرئے۔ اس مقصد کے لیے کچھ مطالب کو بیان کرنے کے بعد وہ اس حدیث کی اسناد کے متعلق اپنی رائے بیان کرتا ہے۔ کہ اس بات کا احتمال ہے کہ یہ آیات علیؑ اور فاطمہؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہوں لیکن اس کا اثبات اور نفی کوئی بھی قطعی نہیں ہے کیونکہ اس بارے میں متضاد اور مختلف روائیتیں موجود ہیں۔

بالفرض اگر ہم اس کے بھی قائل ہونا چاہیں کہ یہ آیات ان ہستیوں کی شان میں نازل نہیں ہوئیں تو پھر بھی ان کی فضلیت اور عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی کیونکہ ان کا ابرار کے عنوان میں داخل ہونا بڑی واضح بات ہے، بلکہ دوسروں سے اولیٰ اور بہتر ہیں، انسان ان دو بڑی شخصیتوں کے متعلق کیا کہہ سکتا ہے سوائے اس کے کہ علیؑ مومنین کے مولا اور وصی رسول ہیں اور فاطمہؑ رسول اکرمؐ کا ٹکڑا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود کا حصہ ہیں۔ حسنین ÷ جنت کے روح وریحان اور جوانان جنت کے سردار ہیں لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ دوسروں کو چھوڑ دیا جائے۔[2]

لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم اتنی مشہور اور معروف فضلیت کو نظر انداز کر دیں تو باقی فضائل بھی آہستہ آہستہ اسی صورتحال کا شکار ہو جائیں گے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ علیؑ، خاتون جنت فاطمہ زہراؑ، امام حسین -اور امام حسین -کی فضلیت بھی سوال چلی جائے گی۔ ہم کیوں اس مشہور روایت کو نظر انداز کریں جسے بڑے بڑے محدثین اور مفسرین نے نقل کیا ہے جب کہ اس سے معارض اور متصادم ایسی

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۳، صفحہ ۲۴۴

[2] روح المعانی، جلد ۲۹، صفحہ ۱۵۸۔

روایت بھی کوئی نہ ہو جو قابل توجہ ہو، اور اس طرح سے ہم اپنے او پر اسلام کی ان بزرگ ترین ہستیوں کی معرفت اور پہچان کا دروازہ کیوں بند کردیں؟!

اہل سنت کے ایک بڑے عالم سیوطی نے بھی تفسیر الدر المنثور میں ابن مردویہ کے ذریعے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آیت ''وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ.....'' علیؑ اور فاطمہ زہراؑ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ شبلنجی [1] نے اپنی کتاب نور البصار میں شان نزول کے واقعے کو پورے طور پر بیان کیا ہے اور اسی طرح دیگر بہت سارے مفسرین اور محدثین نے بھی اس واقعے کو اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔

سورہ ھل اَتیٰ اور شعراء

سورہ ھل اَتیٰ (دھر) کا اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہونا اس قدر واضح اور آشکار ہے کہ بہت سارے نامور اور مشہور شعراء نے اپنے اشعار میں اس بات کو بیان کیا ہے، ان میں سر فہرست امام محمد بن ادریس شافعی ہیں جن کے اشعار متعدد کتابوں میں مذکورہ ہیں وہ کہتے ہیں:

اِلیٰ مَ، اِلیٰ مَ وَ حَتّیٰ مَتیٰ
اُعاتَبُ فی حُبِّ هَذا الفتیٰ
وَ هَلْ زُوِّجَتْ فاطِمُ غَيْرَهُ
و فِي غَيْرِه هَل اَتیٰ هَلْ اَتیٰ؟

کب تک، کب تک، اور کب تک مجھے اس جوان کی محبت پر ملامت کی جاتی رہی گی؟ کیا فاطمہ زہراؑ کی شادی حضرت علیؑ کے علاوہ کسی اور ہوئی اور کیا سورہ ھل اَتیٰ کسی اور کی شان میں اتری؟ [2]

ابن بطریق جس کا تعلق چھٹی صدی ہجری کے علماٗ میں سے ہے وہ ''عمدة عيون صحاح الاخبار'' میں ابو ثعلبی سے نقل کرتے ہیں:

اَنَا مَولی لِفتیٰ
اُنْزِلَ فِيه هَل اَتیٰ [3]

میں تو اس جوانمرد کا غلام ہوں جس کی شان میں سورہ ھل اَتیٰ نازل ہوئی ہے۔

---

[1] نور الابصار، صفحہ ۶۲

[2] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۱۵۸ و علی من الکتاب والسنہ، جلد ۱، صفحہ ۴۴۷

[3] عمدۃ عیون صحاح الاخبار، صفحہ ۳۴۹ (طبع جامعۃ المدرسین)

نیز محمد بن طلحہ شافعی (ساتویں صدی ہجری کے عالم) اپنی کتاب مطالب السؤال میں اہل بیت کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

هُمُ العُرْوَةُ الْوُثْقٰى لِمُعْتَصِمٍ بِهَا
مُنَاقِبُهُمُ جَائَتْ بِوَحْيٍ وَ اِنْزَالِ
مَنَاقِبُ فِى الشُورىٰ وَ سُورَةُ هَلْ اَتٰى
و فِي سُوَرَةِ الاحزابِ يَعْرِفُهَا التالى

(اہل بیت) مضبوط اور محکم سہارا ہیں ہر اس شخص کے لیے جو ان کے دامن کو تھام لے ان کے فضائل قرآنی وحی میں آئے ہیں ان کے مناقب اور فضائل سورہ شوریٰ، سورہ ھل اتی میں مذکورہ ہیں اور سورہ احزاب میں بھی ان کے فضائل موجود ہیں ہر قاری قرآن ان سے آگاہ ہے۔[۱]

اس خاندان عترت وطہارت کے سورہ شوریٰ میں فضائل سے مقصود وہی آیت ''قُلْ لا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْراً اِلَّا المودَّةَ فِي القُرْبٰى'' (آیت نمبر ۲۲) ہے۔ اور سورہ احزاب میں مقصود اس کی آیت نمبر ۳۳ ہے یعنی ''اِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ'' اور سورہ ھل اتی کی بات تو معلوم ہے۔ نیز اس بارے میں بہت سارے دیگر اشعار بھی ہیں جو طلائع ابن رزیک (ابوالغارات) سے نقل ہوئے ہیں۔[۲]

سورہ دھر (ھل اتی) کے حوالے سے اعتراضات

اہل سنت برادران کی تفسیر حدیث اور تاریخ کی کتب سے ہر آگاہ شخص اچھی طرح سے جانتا ہے کہ جہاں بھی علی ابن ابیطالب۔ اور اہل بیت رسول ﷺ کی فضلیت کی بات آتی ہے تو بعض متعصب افراد ہر طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ حتی المقدور ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس حدیث کی سند، متن اور دلالت پر اعتراض کر کے اُسے مشکوک بنا دیں اور اس کی اہمیت کو گھٹا دیں اگر چہ وہ اعتراض بے بنیاد اور غیر معقول ہی کیوں نہ ہو۔ گو یا انہوں نے ان فضائل کو قبول نہ کرنے کا پختہ عہد کر رکھا ہے اگر وہ انہیں تسلیم کریں تو پھر ان کے پہلے سے طے شدہ افکار کے منافی ہے۔

تفسیر روح المعانی، تفسیر کبیر اور المنار جیسی کتب کا مطالعہ اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ ان کے اعتقادات ہر مقام پر ان احادیث کے قبول اور تسلیم کرنے میں رکاوٹ اور مانع ہیں حتی کہ بعض اوقات انسان ان احادیث پر کیے گئے اعتراضات کی کمزوری اور نا معقولیت سے حیران ہو جاتا ہے۔

---

[۱] مطالب السؤال، صفحہ ۸ (الغدیر جلد ۳، صفحہ ۱۰۹ کے مطابق)

[۲] کتاب علی فی الکتاب والسنۃ، جلد ۱ صفحہ ۴۴۷، کا مطالعہ کریں۔

جب کہ دوسروں کے فضائل کے حوالے ان کا رویہ یہ رہتا ہے کہ جو بھی نقل ہوا اُسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتے ہیں اگر چہ ان کے نقائص اور خامیوں روز روشن کی طرح عیاں ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اس سب کچھ کے باوجود بہت سے فضائل تنقید اور اعتراضات کے خنجر سے بچ گئے ہیں اور وہی حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ یہاں ضروری ہے کہ ان اعتراضات میں سے بعض کو ضبط تحریر میں لایا جائے:

ا۔ یہ فضلیت اس صورت میں درست ہے جب یہ سورہ مدینے میں اور امام حسن -اور امام حسین -کی ولادت کے بعد نازل ہوئی ہو (مشہور یہ ہے کہ امام حسن -ہجرت کے تیسرے سال اور امام حسین -ہجرت کے چوتھے سال دنیا میں تشریف لائے) جب کہ بہت سے افراد کا نظریہ ہے کہ یہ سورہ مکی ہے پس یہ سورہ اپنے شان نزول سے مربوط نہیں ہے۔ لیکن اہل سنت کے مشہور مفسر اور عالم قرطبی کی رائے کے مطابق یہ سورت مدینے میں نازل ہوئی ہے: (وقال الجمهور مدنية)[1]

نیز اکابرین کے ایک بڑے گروہ کا یہی نظریہ ہے، جیسے: حاکم حسکانی نے اس سورت کو مدنی سورتوں میں شمار کیا ہے جو کہ سورہ رحمن کے بعد اور سورہ طلاق سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ موصوف نے اس بارے میں آٹھ روایات نقل کی ہیں جن میں تصریح کی گئی ہے کہ سورہ ''ھل اتی'' مدنی سورت ہے، ان روایات میں سے بعض ابن عباس سے، بعض عکرمہ اور حسن سے اور کچھ دوسرے افراد سے منقول ہیں۔ وہ اپنے بعض جملات میں لکھتے ہیں کہ بعض دشمنان اہل بیتؑ نے اس واقعہ (سورہ دھر کے شان نزول) پر اعتراض کیا ہے کہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے حالانکہ اس واقعہ کا تعلق مدینہ سے ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں یہ لوگ کس طرح تمام علمائے تفسیر کے اتفاق کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کی اکثریت اس کے برعکس نظریہ رکھتی ہے اور سورت کو مدنی سمجھتی ہے۔[2]

ابوعبداللہ زنجانی نے ''تاریخ القرآن'' میں دو کتابوں ''نظم الدور'' اور ''تناسخ الایات والسور'' میں سے اہل سنت کے اکابرین کے اقوال نقل کیے ہیں جن کے مطابق سورہ دھر (ھل آتی) مدنی سورتوں میں سے ہے۔[3] الدر المنثور کے مؤلف جلال الدین سیوطی نے بھی اسی بات کو ابن عباس سے مختلف طرق سے بیان کیا ہے۔ سیوطی نے ہی اپنی ایک اور کتاب ''الاتقان'' میں بیہقی کی دلائل النبوۃ سے نقل کیا ہے کہ سورہ ''ھل اَتی'' مدینے میں نازل ہوئی ہے اور بیہقی نے اسے عکرمہ سے بیان کیا ہے۔[4]

اس کے علاوہ وہ تمام علماء جن کے مطابق اس سورت کا شان نزول علیؑ، فاطمہؑ حسن-، حسین- ہیں (ان کی تعداد کافی زیادہ ہے پچھلے صفحات میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے) ان سب کا نظریہ یہی ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے۔ بالفرض اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ اس سورت کی کچھ آیات مکہ میں نازل ہوئی ہوں لیکن علیؑ اور ان کے گھر والوں کی نذر سے مربوط آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ سورہ کا ایک حصہ مکی اور کچھ آیات مدنی ہوں۔ اسی وجہ سے تفسیر روح البیان کے مصنف (بُرسوئی حنفی) بعض اکابر علماء کے اقوال کہ

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۹۰۹

[2] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۳۱۵-۳۱۰

[3] تاریخ القرآن، صفحہ ۵۵

[4] تفسیر المیزان، جلد ۲۰، صفحہ ۲۲۱۔

سورہ ''ھل اتی'' مدنی ہے، نقل کرنے کے بعد ان علماء کے اقوال کو بیان کرتے ہیں جن کے بقول اس سورہ کی بعض آیات مکی اور کچھ آیات مدنی ہیں۔اس کے بعد وہ کہتے ہیں: اس بنا پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدنی ہے لیکن بہرصورت اس میں مدنی آیات کی تعداد مکی آیات سے زیادہ ہے۔لہٰذا ظاہر یہی ہوتا ہے کہ ہمیں اس سورہ کو مدنی کا نام دینا چاہیے، اور کوئی بھی صورت ہو ہمیں اس سورہ کے شان نزول کے حوالے سے نقل ہونے والے واقعے کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔[1]

مذکورہ مفسر اور دیگر علماء نے اس سورہ کے مدنی ہونے پر جو دلائل اور نکات بیان کیے ہیں ان میں ایک لفظ ''اسیر'' ہے جو اس سورہ میں استعمال ہوا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ مکہ میں ''اسیر'' کا تصور ہی نہیں تھا کیونکہ اسیر اور اسارت کے مسائل تو مدینے میں حکم جہاد کے نزول کے بعد پیش آئے تھے۔روح البیان کے مصنف اس بارے میں یوں لکھتے ہیں:

دلَّ علىٰ ذٰلِكَ اِنَّ الاَسِيْرَ اِنَّما كانَ فِى المدِينَةِ بَعْدَ آيَةَ القِتَالِ و الاَمْرِ بِالجِهَادِ

ان آیات کے مدنی ہونے کی دلیل لفظ ''اسیر'' ہے کیونکہ مدینے میں اسیر، آیت جنگ اور حکم جہاد کے بعد پائے جاتے تھے۔[2]

تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے متعصب افراد جو کسی صورت میں ولایت وخلافت کے متعلق اپنے نظریے کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں، انہوں نے لفظ ''اسیر'' کی کیسی مضحکہ خیز تشریحات کی ہیں جو حقیقت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ کبھی انہوں نے کہا اسیر سے مراد وہ ہے جو اپنی بیوی کا اسیر ہو یا وہ ہے جو قرضے کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو یعنی قرضے کا اسیر وغیرہ وغیرہ۔[3] ان سے پوچھا جائے کہ جب اسیر کا حقیقی معنی یہاں پر لیا جاسکتا ہے تو پھر مجازی اور غیر حقیقی معنوں کے پیچھے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کیوں؟

۲۔آیت کے الفاظ عام ہیں انہیں خاص افراد میں منحصر کیسے کیا جاسکتا ہے؟

جیسا کہ کئی بار یہ بات کہی گئی ہے کہ آیات کے مفہوم اور معنی کی عمومیت ہرگز کسی خاص شان نزول کے منافی نہیں ہے اور یہ چیز قرآن مجید کی اور بہت سی آیات میں دکھائی دیتی ہے کہ آیت کا معنی اور مفہوم تو عام ہے لیکن اس کا شان نزول جو کہ اس کا اتم اور اکمل مصداق ہے وہ ایک خاص مورد ہے۔حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ دیگر آیات قرآنی اور ان کے شان نزول کے بارے میں آیت میں مفہوم کی عمومیت کو اس کے شان نزول کی نفی پر کوئی دلیل نہیں بناتا لیکن یہاں پر مسئلہ الٹ ہوجاتا ہے۔

۳۔ایک اور بہانہ اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان تین دن بھوکا رہے اور صرف پانی سے افطار کرے؟

یہ بھی عجیب وغریب بہانہ ہے (فضلیت سے انکار کا) وہ اس لیے کہ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے بہت سے افراد کو دیکھا ہے کہ

---

[1] روح البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۲۶۹۔

[2] روح البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۲۶۹۔

[3] بحر المحیط، جلد ۸، صفحہ ۳۹۵ پر یہ اقوال بعض مفسرین سے بیان ہوئے ہیں، لیکن اس کتاب کے مصنف ابوحیان اندلسی نے خود اسیر کا معنی کفار کو جو قیدی بنایا جاتا تھا، وہ اسیر مراد لیا ہے۔

اپنے طبی علاج کے لیے تین دن تو کیا، دس دن بیس دن بلکہ کبھی چالیس دن تک بھوکے رہتے ہیں یعنی چالیس دن صرف پانی پیتے ہیں اور کچھ نہیں کھاتے (جوس اور چائے وغیرہ بھی نہیں پیتے) بعض اطباء جو بیماریوں کا علاج پرہیز اور بھوک کے ذریعے کرتے ہیں۔ان کے نظریے کے مطابق بھوکا رہنا بہت ساری بیماریوں کا علاج ہے۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم ڈاکٹر، بنام ''آلکسی سوفورین'' نے چالیس دِن بھوک سے علاج پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس سے اس کے فوایداور اس کا مفصل طریقہ کار بتایا ہے۔[1]

اسی تفسیر پیام قرآن کے بعض مصنفین نے بعض بیماریوں کے علاج کے لیے مذکورہ طریقے سے بھوکے رہنے کو بیس دن سے زیادہ تک جاری رکھا ہے اور عملی طور پر انجام دیا ہے۔موجودہ دور میں بھوک ہڑتال جو کہ ایک طرح کا ''پانی کا روزہ'' ہے، رائج ہے اور کبھی چالیس دن سے بھی بڑھ جاتی ہے۔تو پھر کیا مشکل ہے کہ یہ بہانہ تراش لوگ تین دن کے روزے اور پانی سے افطار کرنے پر اظہار تعجب کرتے ہیں؟ اس سے تو یہ لگتا ہے کہ ان کا صرف ایک ہی ہدف ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو اس عظیم فضلیت کو خراب کر دیں۔

[1] اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کا نام ''التطبیب بالصوم'' ہے اس کا فارسی میں بھی ترجمہ ہوا ہے، جس کا نام ہے: ''بیماریوں کے علاج کا جدید طریقہ، روزہ''

۶۔آیات برأت

سورہ توبہ میں دو مقامات پر چند آیات نازل ہوئی ہیں ان کے شأن نزول اور ان روایات کے پیش نظر جو اکثر مفسرین، محدثین اور مورخین نے نقل کی ہیں، ان میں علیؑ کے لیے بہت بڑی فضیلتیں موجود ہیں۔ان دو مقامات میں سے پہلا مقام اس سورت کی ابتدائی آیات ہیں جن میں عہد شکن مشرکین کے ساتھ اعلان جنگ کیا گیا ہے۔

تقریباً تمام مفسرین اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہجرت کے نویں سال جب یہ آیات نازل ہوئیں اور مشرکین کے ایک گروہ نے مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کو توڑ دیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو اس فرمان کو پہچانے کے لیے منتخب کیا تا کہ وہ حج کے موقعہ پر مکہ میں عام لوگوں کے درمیان اس کا اعلان کر دیں۔لیکن ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ یہ آیات ان سے واپس لے کر علیؑ کے حوالے کی گئیں اور ان کے پہنچانے کی ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی اور انہوں نے حج کے دوران تمام لوگوں تک یہ پیغام پہنچا دیا۔اگر چہ اس کی جزئیات اور فرعی باتوں میں محدثین، مفسرین اور مورخین کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔(لیکن اصل واقعہ میں اتفاق نظر موجود ہے)

یہاں پر اس واقعے کے عنوان سے چند روایات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

ا۔اہل سنت کے بہت بڑے امام احمد بن حنبل اپنی کتاب ''مسند'' جو کہ حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، میں یوں کہتے ہیں: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو سورہ برائت دے کر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا تا کہ وہ یہ اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کسی مشرک کو حج کرنے کا حق نہیں ہے، کوئی بھی عریاں اور برہنہ حالت میں طواف خانہ خدا نہ کرئے۔پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو حکم دیا تم ابوبکر کے پاس (مکہ و مدینے کے درمیان راستے میں) جاؤ اور انہیں میرے پاس واپس بھیج دو اور سورہ برائت کو تم جا کر پہنچاؤ۔'' علیؑ نے حکم کی تعمیل کی۔ حدیث کے آخر میں آیا ہے کہ جب ابوبکر نے پوچھا کہ کیا میرے خلاف کوئی حکم تو نازل نہیں ہوا کہ میں سورۃ برائت کو ابلاغ نہ کروں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اُمِرْتُ اَنْ لَا یُبَلِّغَهُ اِلَّا اَنَا اَوْ رَجُلٌ مِّنِّی

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس سورت کو میں خود پہنچاؤں یا جو مجھ سے ہو وہ ابلاغ کرئے۔''[1]

ترمذی نے اپنی کتاب سنن جس کا تعلق صحاح الستہ سے ہے، میں اسی حدیث کو دوسرے الفاظ میں تفسیر القرآن کی بحث میں انس بن مالک سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوبکر کو سورہ برائت دے کر بھیجا پھر ان کو واپس بلا لیا اور فرمایا:

لَا یَنْبَغِی لِاَحَدٍ اَنْ یُبَلِّغَ هذا اِلاَّ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِی فَدَعَا عَلِیًّا فَاَعْطَاهُ اِیَّاه

[1] مسند احمد، جلد اول۔صفحہ ۳ (مطبوعہ دار الصادق)

کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس سورت کو پہنچائے؛مگر وہ شخص جو میرے خاندان سے ہو۔ پھر آپؐ نے علیؑ کو بلایا اور سورت ان کے سپرد کی۔''[1]

اس کے بعد ترمذی ایک اور حدیث ابن عباس سے اسی موضوع پر بیان کرتے ہیں اور پہلی حدیث سے زیادہ مفصل اور مشروح بیان کرتے ہیں۔[2] اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ دونوں حدیثوں کے اختتام پر اپنا یا دوسروں کا قول ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''هذا حديث حسن غريب۔'' یعنی: یہ حدیث حسن اور غریب ہے۔لیکن اس قسم کے الفاظ نہ وہ اس سے پہلے والی حدیث کے بارے میں کہتے ہیں اور نہ ہی ان کے بعد والی حدیث کے بارے میں اور بذات خود یہ عجیب بات ہے گویا ان کی نظروں میں ہر وہ حدیث غریب ہے جو علیؑ کی غیر معمولی فضلیت کو بیان کرے۔

۲۔ جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں عبداللہ بن احمد بن حنبل اور ابن مردویہ کے ذریعے علیؑ سے بیان کرتے ہیں کہ جب سورہ برائت کی ابتدائی دس آیات پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہوئیں تو آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر بلایا اور انہیں اہل مکہ تک پہنچانے کے لیے ان آیات کو ان کے سپرد کیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے مجھے بلایا اور حکم دیا کہ جلدی سے ابوبکر سے جا ملو، جہاں بھی اُن سے ملاقات کرو، پیغام کو ان سے لے لو۔ (اور آپ ان آیات کو لوگوں کے سامنے جا کر پڑھو) ابوبکر واپس آ گئے اور پوچھنے لگے: اے اللہ کے رسول! کیا میرے بارے میں کوئی حکم نازل ہوا ہے؟ (کہ جس کی وجہ سے میں اس ذمہ داری کو انجام دینے کے قابل نہیں رہا؟) پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: نہیں! لیکن جبرئیل امین میرے پاس آئے اور کہا کہ اس پیغام کو آپ میں سے کسی مرد کے سوا کوئی نہیں پہنچائے گا۔[3]

۳۔ مذکورہ کتاب میں احمد سے، ترمذی سے اور نیز ابن مردویہ کے ذریعے ''انس'' سے منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے برائت والی آیات حضرت ابوبکر کو دے کر بھیجا پھر انہیں واپس بلوا لیا اور فرمایا:

لاینبغی لِاَحدٍ ان یُبَلِّغَ هذا اِلَّا رَجُلٌ مِنْ اَهْلِی، فَدَعا عَلِیاً فَاَعطاهُ اَیّاه

اعلان برائت کی ذمہ داری میرے یا میرے خاندان میں سے کسی شخص کے علاوہ کسی اور کے لیے انجام دینا سزاوار نہیں ہے، اس کے بعد آنحضرتؐ نے علیؑ کو بلوایا اور آیات برایت ان کے سپرد کیں۔[4]

۴۔ درمنثور میں ہی سعد بن ابی وقاص نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے ابوبکر کو برائت والی آیات دے کر مکہ روانہ کیا۔ پھر علی-کو ان کے پیچھے بھیجا تاکہ ان سے یہ آیات واپس لیں۔ ابوبکر اس کی وجہ سے دل میں ناراض ہو گئے اور اس کا اظہار حضور اکرم ﷺ کے سامنے

---

[1] سنن ترمذی جلد ۵، صفحہ ۲۷۵ (حدیث نمبر ۳۰۹۰)

[2] سنن ترمذی جلد ۵، صفحہ ۲۷۵ (حدیث نمبر ۳۰۹۱)

[3] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۰۹

[4] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۰۹

کیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّهُ لا یُؤَدِّی عَنِّی اِلَّا اَنَا اَوْ رَجُلٌ مِنِّی

اعلان برائت کی ذمہ داری یا تو میں بذات خود انجام دوں یا ایسا شخص جو مجھ سے ہو۔[۱]

۵۔ نیز اسی کتاب میں مشہور صحابی ابو سعید خدری بیان کرتے ہیں کہ پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ابوبکر کو بھیجا کہ وہ ان کی طرف سے آیات برائت کا اعلان کریں جب انہیں روانہ کر چکے تو علیؑ کو ان کے پیچھے بھیجا اور ان سے فرمایا کہ ان آیات کی تبلیغ کی ذمہ داری یا میں بذات خود انجام دوں یا پھر تم، اس کے بعد انہیں اپنے مخصوص اونٹ پر سوار کیا، علیؑ روانہ ہوئے اور ابوبکر سے جا ملے اور ان سے آیات برائت لے لیں۔ حضرت ابوبکر رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں ڈرتے ہوئے آئے کہ مبادا کوئی چیز ان کی مذمت میں نازل ہوئی ہو اور جب انہوں نے پوچھا تو وہی سابقہ جواب سنا۔[۲]

۶۔ درمنثور میں ہی صحابی رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ابو رافع، آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ابوبکر کو سورہ برائت کی آیات دے کر حج کے لیے روانہ کیا، جبرئیل تشریف لائے اور کہا: ''اِنَّهُ لَنْ یُؤَدِّیَهَا عَنْكَ اِلَّا اَنْتَ او رَجُلٌ مِنْكَ۔'' یعنی: ''اعلان برائت کی اس ذمہ داری کو یا تو آپ خود بنفس نفیس انجام دیں یا ایسا شخص جو آپ سے ہو۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علیؑ کو ان کے پیچھے بھیجا۔ علیؑ مکہ اور مدینے کے درمیان ان سے جا ملے، ان سے آیات لے کر حج کے ایام میں لوگوں کے درمیان ان کا اعلان کر دیا۔[۳]

۷۔ ۱۸: حاکم حسکانی نے اسی موضوع پر شواہد التنزیل میں بارہ احادیث نقل کی ہیں جو اس نے انس بن مالک، ابن عباس، ابو سعید خدری اور ابو ھریرہ وغیرہ سے بیان کی ہیں، ان سب کا ذکر کرنا بحث کے طویل ہونے کا باعث بنے گا لہٰذا مزید تحقیق کا شوق رکھنے والے افراد مذکورہ کتاب جو کہ عام لوگوں کی دسترس میں ہے، کا مطالعہ کریں۔[۴]

ان کے علاوہ دیگر بہت سارے محدثین نے اس حدیث کو مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے۔ اس حدیث کے راویوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ علامہ امینی مرحوم کہتے ہیں کہ یہ حدیث متواتر ہے بلکہ بعض کے نزدیک تو حد تواتر سے بھی بڑھ کر ہے، اس کے بعد انہوں نے اہل سنت کے ۷۳ علماء کے نام ذکر کیے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو اپنی اپنی کتابوں میں اسناد کے ساتھ مفصل طور پر نقل کیا ہے۔[۵]

وہ مزید لکھتے ہیں ان احادیث کی اسناد جن روایوں پر جا کر ختم ہوتیں ہیں وہ سب کے سب صحابہ کرام ہیں جن میں یہ شخصیات قابل ذکر ہیں، علیؑ، ابوبکر، ابن عباس، جابر بن عبد اللہ انصاری، انس بن مالک، ابو سعید خدری، سعد بن ابی وقاص، ابو ھریرہ،

---

[۱] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۰۹

[۲] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۳۰ (کچھ اختصار کے ساتھ)

[۳] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۰۹

[۴] شواہد التنزیل، جلد ا صفحہ ۲۳۲ تا ۲۴۳ (حدیث نمبر ۳۰۹ تا ۳۱۲، ۳۱۴، تا ۳۱۸، ۳۲۳ تا ۳۲۵)

[۵] ان افراد کے نام جاننے کیلئے دیکھیے، الغدیر جلد ۶ صفحہ ۳۳۱ تا ۳۳۸۔

عبد اللہ بن عمر، حبش بن جنادہ، عمران بن حصین، اور ابوذر غفاری۔[1]

اس گفتگو کو آٹھویں صدی ہجری کے نامور شاعر شمس الدین مالکی کے اشعار پر ختم کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

وَ اَرْسَلَهُ عَنْهُ الرَّ سُولُ مُبَلِّغًا
و خَصَّ بِهٰذَا الْاَمْرِ تخصیصَ مُفْرَدِ
و قَالَ هَلِ التَّبلیغُ عَنِّیْ یَنْبَغی
لِمَنْ لَیْسَ بَیْتی مِنَ القَومِ فاقْتَدِی

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مبلغ بنا کے بھیجا اور فقط انہیں اس ذمہ داری کے لیے مختص کیا اور فرمایا: کیا میری طرف سے اس کی تبلیغ کے لیے میرے خاندان کے علاوہ کوئی اور لیاقت رکھتا ہے کہ میں اس کی پیروی کروں؟"[2]

نتیجہ

یہ حدیث اپنے ماخذ اور اسناد کے لحاظ سے اس قدر وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام لوگوں سے علیؑ کی برتری اور فضلیت پر واضح اور بین دلیل ہے اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو علیؑ پر مکمل اعتماد تھا اور انہیں بارگاہ الٰہی میں قرب کا اعلیٰ مقام حاصل تھا کیونکہ حدیث واشگاف الفاظ میں کہہ رہی ہے کہ جبرئیل امین خدا کی طرف سے یہ پیغام اور حکم لے کر آئے تھے کہ ان آیات کی تبلیغ کی ذمہ داری علیؑ کے ذریعے انجام پائے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یہ میرا کام ہے یا اس شخص کا کام ہے جو مجھ سے ہو، اور صرف علیؑ اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

یہ بات بڑی قابل توجہ ہے کہ مشرکین سے عہد و پیمان کے خاتمے کا اعلان اسلام کی تاریخ کا حساس ترین مرحلہ تھا اور مخالفین کی طرف سے حج کے مراسم میں سخت قسم کے ردعمل کا امکان بھی تھا، ایسی صورت حال غیر معمولی بصیرت، تدبیر اور اعلیٰ شجاعت کا تقاضا کر رہی تھی اس اہم امر کے لیے علیؑ کا انتخاب اس بات پر بہترین دلیل ہے کہ امت میں سے وہ سب سے زیادہ آگاہ، بصیر، مدبر اور شجاع فرد تھے، جس کا انتخاب اس اہم ذمہ داری کے لیے کیا گیا یقیناً وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کے لیے امت کے تمام افراد سے زیادہ قابل لائق اور مناسب شخص تھے۔

اس میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ خود حضرت ابوبکر نے بھی اس چیز کو محسوس کیا اور جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے تو پریشان ہو کر پوچھا کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: "یہ ذمہ داری میرے

---

[1] الغدیر، جلد ۶، صفحات ۳۴۱، ۳۴۸۔

[2] الغدیر جلد ۶ صفحہ ۳۳۸۔

قریبی ترین افراد میں سے کسی کو انجام دینی چاہیے تھی'' یہاں پر بھی بہانے تلاش کرنے والے افراد اپنے طے شدہ عقیدے اور فکر کی بنا پر اس فضلیت کو گھٹانے اور اِسے معمولی چیز ثابت کرنے کے لیے پوری کوشش کرتے ہوئے نظر آئے ہیں اور کمزور قسم کی تاویلیں کرتے ہوئے نہایت سادگی سے اس مسئلہ سے گزر گئے ہیں۔

مثال کے طور پر روح المعانی میں جب آلوسی اس حدیث کو ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ یہ روایت بطور خلاصہ علیؑ کی فضلیت اور ان کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرب پر دلالت کرتی ہے اور کوئی بھی مومن اس کا انکار نہیں کرتا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ خلافت کے مسئلہ میں ابوبکر سے زیادہ اہل اور لائق تھے، وہ مزید لکھتے ہیں:

اس حوالے سے بعض اہل سنت نے یہ نکتہ ذکر کیا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت ابوبکر کو امیر الحاج مقرر کیا گیا تھا اور علیؑ کو مشرکین کے ساتھ عہد و پیمان کے ختم ہونے کے بارے میں آیات برائت کے اعلان کی ذمہ داری دی گئی تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ابوبکر رحمت اور جمال کی صفات کے مظہر تھے۔ لہٰذا آنحضرتؐ نے مسلمانوں کے امور میں رحمت والے امر کو ان کے سپرد کیا تھا، لیکن چونکہ علی اسد اللہ اور خدا کے جلال کے مظہر تھے اس لیے کافروں سے عہد و پیمان کو توڑنے کا اعلان جو اللہ کے جلال اور صفات قہر کا نمونہ تھا، ان کے حوالے کیا گیا اور یہ دونوں شخصیت ابلتے ہوئے چشموں کی طرح تھیں ایک سے صفت جمال پھوٹ رہی تھی اور دوسرے سے صفت جلال۔ اس بات کو ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: یہ تحلیل بہت اچھی ہے اگر وہ وجہ نہ ہوتی جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمائی تھی (کہ میں یا میرا خاص الخاص فرد اس کام کو انجام دے) [1]

جس طرح آلوسی نے آخر میں بات کہی ہے کہ یہ تشریح اور تحلیل (شاعرانہ) جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان سے ہم آہنگ اور مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ آنحضرتؐ نے واضح طور پر کہا ہے کہ جبرئیل اللہ کی طرف سے میرے لیے حکم لے کر آئے ہیں کہ اس کام کو میں خود انجام دوں یا وہ انجام دے جو مجھ سے ہے، یعنی وہ فرد آپؐ کا قریبی ترین ہو اور آپؐ کی طرح خصوصیات اور صفات کا حامل ہو اور ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات جامع صفات جمال اور جلال تھی۔ یہ برادران اس عظیم فضلیت کو نظر انداز کرنے پر کیوں اس قدر زور دیتے ہیں؟ یا اس کا رخ شاعرانہ تاویلات کے ذریعے موڑنا چاہتے ہیں شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ کہیں شیعہ اِسے اپنی دلیل بنا کر اپنے مذہب کو ثابت نہ کریں؟ اپنی بات ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، یہ حدیث ''مطالب السؤال'' میں ابوذر غفاری سے بیان ہوئی ہے۔ ان کے بقول پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عَلِیٌّ مِنّی وَاَنَا مِنْ عَلِیٍّ وَلَا یُؤَدِّی اِلَّا اَنَا وَعَلِیٌّ

علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے، اور اس ذمہ داری کو میرے یا علیؑ کے سوا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ [2]

---

[1] روح المعانی: جلد ۱۰، صفحہ ۴۷

[2] مطالب السؤال صفحہ ۱۸ (الغدیر جلد ۶ صفحہ ۳۴۸ کے مطابق)

۷۔ آیت سقایہ الحاج

سورہ برائت کی آیت ۱۹ میں ارشاد الٰہی ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا ہے اور راہ خدا میں جہاد کیا ہے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔

''شواہد التنزیل'' میں حاکم حسکانی حنفی نے اسی آیت کے ضمن میں دس سے زیادہ روایات مختلف طرق سے نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت انس بن مالک سے مروی ہے کہ عباس بن عبدالمطلب اور (خانہ کعبہ کے کلید بردار) شیبہ ایک دوسرے پر فخر ومباہات کر رہے تھے کہ اتنے میں علیؑ وہاں پہنچ گئے حضرت عباس نے کہا میرے بھتیجے ذرا ٹھہر میں نے تم سے کچھ کہنا ہے۔ علی -کھڑے ہوگئے، حضرت عباس نے کہا: شیبہ میرے مقابلہ پر فخر کر رہا تھا اس کا خیال ہے کہ وہ میرے سے زیادہ معزز اور برتری رکھتا ہے۔ علیؑ نے فرمایا: چچا جان آپ نے اِسے کیا جواب دیا ہے؟

حضرت عباس نے بتایا کہ میں نے کہا ہے ''میں اللہ کے رسول کا چچا ہوں، ان کے باپ کا وصی اور حاجیوں کو پانی پلانے والا ہوں لہٰذا میری شان ومنزلت تیرے سے زیادہ ہے۔ علی - نے شیبہ سے پوچھا: تم نے اس کے مقابلے میں کیا کہا ہے؟ اس نے بتایا کہ میں نے کہا ہے میرا مقام تم سے بلند ہے کیونکہ میں اللہ کے گھر کا امین اور کلید بردار ہوں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے گھر کا امین کیوں نہیں بنایا جس طرح اُس نے مجھے بنایا ہے؟ علی - نے فرمایا: میرے لیے فخر کی بات یہ ہے کہ میں وہ ہوں جس نے اس امت کے مردوں میں سے سب سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا ہوں، میں نے ہجرت کی ہے اور راہ خدا جہاد کیا ہے۔

اس کے بعد یہ تینوں افراد رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی بات کہی، آنحضرتؐ ان کے جواب میں خاموش رہے، وہ سب واپس چلے گئے چند دن کے بعد ان کے بارے میں وحی نازل ہوئی، آنحضرتؐ نے ان تینوں کی طرف پیغام بھیجا وہ سب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ آپؐ نے ''اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ.... والی آیت ان کے سامنے تلاوت کی[1]

یہی مطلب دیگر روایات میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان میں سے بعض روایات میں آیا ہے کہ جب عباس نے آیت کے نزول کا سُنا تو تین مرتبہ کہا: انّا قد رضینا: ہم راضی ہو گئے۔ حاکم حسکانی کے علاوہ بہت سارے محدثین نے ان

[1] شواہد التنزیل، جلد ا صفحہ ۲۴۹۔

احادیث کواپنی کتابوں میں نقل کیا ہے،بعض نے تفصیل کے ساتھ اور بعض نے مختصر طور پر بیان کیا ہے،ان افراد میں سے نامور اور قابل ذکر شخصیات درج ذیل ہیں:

طبری نے اپنی تفسیر میں انس بن مالک سے [1]، واحدی نے اسباب النزول میں [2]،قرطبی نے اپنی تفسیر میں [3] فخر رازی نے تفسیر کبیر میں [4]،خازن نے اپنی تفسیر خازن میں [5]،ابوالبرکات نسفی نے اپنی تفسیر میں [6]،ابن صباغ مالکی نے الفصول المھمہ میں۔[7]

الدرالمنثور ایک ایسی تفسیر ہے جس میں احادیث اہل سنت کی بنیاد پر آیات قرآنی کی تفسیر کی گئی ہے۔اس میں بہت ساری روایات بیان کی گئی ہیں جن کے مطابق یہ آیت علیؑ اور مذکورہ واقعے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[8]

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصولی طور پر کیا ایک دوسرے پر فخر ومباہات کرنا اسلام میں قابل مذمت نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر امیر المومنین علیؑ نے ایسا کام کیوں کیا؟ ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجائے گا اور وہ یہ ہے کہ کئی دفعہ لوگ اقدار اور فضائل کی پہچان میں غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں،حقیقی قدروں اور فضیلتوں کو چھوڑ کر ثانوی حیثیت کے مسائل اور معاملات میں الجھ جاتے ہیں،ایسے مقامات پر بیان حقیقت کے لیے نہ صرف فخر ومباہات مذموم نہیں ہے بلکہ کبھی تو یہ فریضہ بن جاتا ہے،مثال کے طور پر اگر کسی محفل میں ایک شخص فخر کرتے ہوئے کہے میرا اتنا مال و دولت ہے،دوسرا کہے فلاں محل اور بنگلہ میرا ہے،تیسرا کہے میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں اس شہر کا حاکم ہوں،اس محفل میں موجود کوئی شخص حقیقی اقدار اور عظمتوں کی نشاندہی کے لیے یہ کہے کہ اگرچہ میرے پاس مقام ومنصب،شہرت اور مال ودولت نہیں مگر میرے فخر کے لیے یہی کافی ہے کہ میں حافظ قرآن ہوں،یہ بات نہ فقط مذموم نہیں ہے بلکہ ایک اہم اور قیمتی سبق ہے۔

---

[1] تفسیر طبری: جلد ۱۰،صفحہ ۵۹

[2] اسباب النزول،صفحہ ۱۸۲

[3] تفسیر قرطبی،جلد ۸،صفحہ ۹۱

[4] تفسیر فخر رازی،جلد ۴،صفحہ ۴۲۲

[5] خازن،جلد ۲،صفحہ ۲۲۱

[6] ابوالبرکات،جلد ۲،صفحہ ۲۲۱

[7] الفصول المھمہ ،صفحہ ۱۲۳

[8] الدرالمنثور ،جلد ۳،صفحہ ۲۱۸،۲۱۹

۸۔صالح مؤمنین کی آیت

حضرت رسول خدا ﷺ کی بعض ایسی بیویوں سے خطاب کرتے ہوئے جنہوں نے حکم عدولی کی تھی، اللہ تعالیٰ سورہ تحریم میں ارشادفرماتا ہے: **وَ اِنۡ تَظَاهَرَا عَلَيۡهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوۡلٰهُ وَ جِبۡرِيۡلُ وَ صَالِحُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ و الملائِكة بَعۡدَ ذالِكَ ظهير** ۔ یعنی: ''اور اگر تم نبی کے خلاف ایک دوسرے کی پشت پناہی کروگی (تو تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں) کیونکہ اللہ، جبرئیل (اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فرشتہ) اور صالح مومنین اس کے مولا اور مددگار ہیں اور فرشتے ان کے بعد اس کے پشت پناہ ہیں۔''

''صالح المومنین'' میں تمام صاحبان ایمان، نیک اور صالح افراد شامل ہیں یہ سب نبی اکرم ﷺ کے دوست اور مددگار ہیں، اس میں نہ فقط آپؐ کے دور کے صالح افراد اور اصحاب کرام شامل ہیں بلکہ ایک لحاظ سے دیگر زمانوں اور ادوار کے صالح مومنین بھی شامل ہیں، جن میں سے ہر ایک اسلام، پیغمبر اکرم ﷺ اور اپنے مکتب کی ایک قسم کی مدد ونصرت کے لیے اقدام کرتا ہے۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ متعدد روایات میں ''صالح المومنین'' کی تفسیر علیؑ سے کی گئی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کے اعلیٰ ترین اور کامل ترین مصداق ہیں، اور اس نکتے کے پیش نظر ان کا ذکر جبرئیل کے ساتھ آیا ہے اس سے ان کی اس فضلیت کی اور ان کے مقام کی عظمت اچھی طرح اجاگر ہوتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اللہ تعالی اور جبرائیل امین کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی میں بہترین یار و مددگار علیؑ تھے۔ لہٰذا ان کے علاوہ اور ان سے بڑھ کر کون رسول خدا ﷺ کی خلافت اور جانشینی کا حقدار ہوسکتا ہے؟ کیا یہ روایات اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ وہ رسول ﷺ کے بعد امت میں سے افضل اور سب سے برتر شخصیت تھے۔ اب ہم ان روایات کی اسناد اور طرق کو بیان کرتے ہیں جن میں سے ایک حصہ عمومی طور پر اہل سنت کے ماخذ اور کتب سے لیا گیا ہے۔

حاکم حسکانی حنفی اس آیت کے متعلق اٹھارہ احادیث مختلف طرق سے نقل کرتے ہیں، ان سب کے مطابق ''صالح المومنین'' سے مراد علی ابن ابی طالبؑ ہیں، ان میں ایک حدیث میں اسماء بنت عمیس روایت کرتی ہیں کہ میں نے حضرت رسول خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ: ''**صالح المومنين عَلِيّ بن ابي طالب**۔'' یعنی: صالح المومنین علی بن ابی طالب۔ ہیں[1]

مذکورہ کتاب میں ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول خدا ﷺ نے علی بن ابی طالب کے متعلق فرمایا: ''**هُوَ صالح الۡمُؤۡمِنين**۔'' یعنی: وہ صالح المومنین ہیں[2] نیز عمار بن یاسر سے روایت کی گئی ہے کہ میں نے علیؑ سے سُنا وہ فرماتے تھے پیغمبر اکرم ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا: ''**الا اُبَشِّرُكَ: قُلۡتُ بلى يا رَسُول الله! وَ مَا زِلتُ مُبَشِّراً بِالۡخَيۡرِ: قالَ قَدۡ اَنۡزَلَ اللهُ فِيۡكَ**

[1] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۵۶، روایت نمبر ۹۸۲

[2] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۵۶، روایت نمبر ۹۸۷

قُرآنًا. قُلْتُ و ما هُوَ یا رَسولَ اللهِ؟ قَالَ قُرِنْتَ بِجَبْرَئیل ثُمَّ قَرَءَ: وَ جبرئیل و صالح المومنین۔ ''یعنی: کیا میں تمہیں خوشخبری نہ سناؤں؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! اے اللہ کے رسول! آپ تو ہمیشہ خیر و بھلائی کی بشارت دینے والے ہیں، آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے آیت نازل کی ہے میں نے پوچھا کونسی آیت؟ فرمایا: تمہیں جبرئیل کے ساتھ قرار دیا گیا ہے (یعنی اللہ نے تمہیں اس کا ساتھی بنایا ہے) آپؐ نے اس آیت کا یہ جملہ و جبرئیل و صالح المومنین تلاوت کیا۔[1]

اسی مفہوم پر مشتمل ایک اور حدیث حذیفہ سے بیان ہوئی ہے: ابن سیرین سے مروی ایک حدیث میں اور خود علی بن ابی طالب سے منقول ایک حدیث میں وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ صالح المومنین علی بن ابی طالب ہیں۔[2]

بہت سارے مفسرین نے اس حدیث کو اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے، مثال کے طور پر سیوطی نے الدرالمنثور میں اسی آیت کی تفسیر میں ابن عباس اور اسماء بنت عمیس سے نقل کیا ہے۔ برسوئی نے تفسیر روح البیان میں آیت کے حوالے سے اقوال ذکر کرنے کے بعد مجاہد کے قول کہ صالح المومنین سے مقصود علیؑ ہیں، کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے: یُؤَیِّدُهُ قَولُهُ عَلَیْهِ السَّلام یا عَلِیّ اَنْتَ مِنّی بِمَنْزِلَةِ هارونَ مِنْ موسی۔ یعنی: ''اس بات کی تائید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور ارشاد ہوتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: اے علی! آپ کو میرے سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی۔'' اس کے بعد وہ ایسی متعدد آیات کو پیش کرتے ہیں، جن میں صالحین کا لفظ بزرگ اور بڑے انبیاء کے لیے استعمال ہوا ہے، آخر میں وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب علیؑ اللہ کے نبی ہارون کے مقام اور منزلت پر ہیں تو پھر ''صالح المومنین'' کے عنوان کے بھی قابل اور لائق ہیں۔[3]

ان کے علاوہ دیگر علماء جیسے عسقلانی نے فتح الباری، ابن حجر نے صواعق المحرقہ اور علاء الدین متقی نے کنز العمال میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ بہت بڑی فضیلت ہے اور اس کی مثال نہیں ملتی کہ اللہ تعالیٰ نے صالح المومنین کو جبرئیل کا ساتھی اور ہم ردیف قرار دیا ہے، اور مندرجہ بالا احادیث کے مطابق اس کے اکمل اور اتم مصداق علیؑ تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ علیؑ رسول خداؐ کی پوری زندگی میں تمام مواقع پر آپؐ کے شانہ بشانہ رہے، ہر مقام پر آپ کی مدد و نصرت کی اور ہر جگہ آپؐ کے یار و مددگار ثابت ہوئے اور آپؐ کی خلافت اور جانشینی کے حق دار بھی علیؑ ہی تھے۔

---

[1] ایضا، صفحہ ۲۵۸، حدیث ۹۸۷

[2] ایضا، صفحہ ۲۵۹، حدیث ۹۸۹

[3] روح البیان جلد ۱۰، صفحہ ۵۳

۹۔آیت وزارت

سورہ طہٰ کی ۲۹ سے کر ۳۲ آیات میں حضرت موسیٰ کی زبانی قرآن فرماتا ہے:

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾

یہ آیات بعثت کے آغاز میں حضرت موسیٰ کی خواہشات کو بیان کر رہی ہیں کہ انہوں نے دُعا کی: ''بارالٰہا! میرے خاندان سے میرا وزیر بنا، میرے بھائی ہارون کو، اور اس کے ذریعے میری پشت مضبوط فرما، اور اُسے میرے کام میں شریک قرار دے۔''

ان آیات کی تفسیر میں بھی متعدد روایات اہل سنت کی کتب میں موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رسالت کے اہداف کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ سے انہی خواہشات کا اظہار فرمایا اس فرق کے ساتھ کہ ہارون کی جگہ پر علیؑ کا نام لیا، ان میں سے چند روایات مطالعے کے لیے یہاں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔شواہد التنزیل میں حذیفہ بن اُسید سے یوں منقول ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

اَبْشِرْ، و اَبْشِرْ، اِنَّ موسی دَعَا رَبَّهُ اَنْ يَجْعَلَ لَهُ وزيرًا مِنْ اَهْلِهٖ هارُونَ، وَاِنِّي اَدْعُو رَبِّي اَنْ يَجْعَلَ لِي وزيرًا مِنْ اَهْلِي عَلِيَّ اَخي، اُشْدُدْ بِهٖ ظَهْرِي وَ اَشْرِكْهُ فِي امري

(اے علی!) تمہیں بشارت ہو، تمہیں بشارت ہو! موسیٰ نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ میرے خاندان سے ہارون کو میرا وزیر بنا دے، میں نے بھی اپنے پروردگار سے دعا کی ہے کہ میرے خاندان سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر بنا دے، اور اس کے ذریعے سے میری پشت کو مضبوط فرما (یعنی میری قوت میں اضافہ فرما) اور انہیں میرے کام میں شریک قرار دے۔[1]

۲۔دوسری حدیث وہ اسماء بنت عمیس سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا انہوں نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَقُولُ كما قَالَ اَخي مُوسى، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِي وزيرًا مِنْ اَهْلِي عَلِيّاً اَخِي اُشْدُدْ بِهٖ اَزْرِي، وَ اَشْرِكْهُ فِي اَمْرِي، كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا، و نَذْكُرَكَ كَثِيْراً اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا

اے اللہ! میں تم سے وہی مانگتا ہوں جو بھائی موسیٰ نے تم سے مانگا تھا، اے اللہ! میرے خاندان سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر بنا، اس کے ذریعے میری پشت مضبوط فرما اُسے میرے کام میں شریک قرار

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا صفحہ ۳۶۸، حدیث ۵۱۰

دے تا کہ ہم تیری بہت زیادہ تسبیح کریں اور تیرا ذکر کثرت سے کریں بے شک تیری ذات ہمارے حالات سے آگاہ ہے۔[1]

واضح سی بات ہے کہ نبی کے کاموں میں شریک ہونے سے مراد نبوت میں شریک ہونا قطعاً نہیں ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی ہدایت وراہنمائی کے کام میں شریک ہونا ہے۔

۳۔ تیسری حدیث وہ ''انس بن مالک'' سے بیان کرتے ہیں، جس میں حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی طرف بالکل اشارہ نہیں ہے لیکن اس میں خلافت اور وزارت کے موضوع کا ذکر ہے۔ وہ ذکر کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ان خلیلی و وزیری وخلیفتی فی اھلی وخیر من اترك بعدی ینجز موعودی ویقضی دینی علی بن ابی طالب یعنی ''بیشک میرا دوست میرا وزیر اور خاندان میں میرا جانشین علیؑ ہے، میرے بعد بہترین ہستی جسے میں چھوڑ جاؤں گا جو میرا وعدہ پورا کرے گا اور میرا قرض ادا کرے گا وہ علی ابن ابی طالبؑ ہے۔''[2]

۴۔ یہی حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ سلمان فارسی سے بھی منقول ہے۔[3]

۵۔ پانچویں صدی ہجری کے عالم حافظ ابونعیم اصفہانی نے اپنی کتاب ''ما نزل من القرآن فی علی''میں اسماء بنت عمیس کی حدیث کا مضمون اور مطلب ابن عباس سے بیان کیا ہے۔ حدیث کے آخر میں ابن عباس کہتے ہیں:

رسول خدا ﷺ کی دعا کے بعد میں نے منادی کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا:

یا اَحمَدُ قَدْ اُوتِیتَ مَا سَأَلْتَ

اے احمد! جو کچھ آپؐ نے اپنے رب سے مانگا ہے وہ آپؐ کو عطا کر دیا گیا ہے۔[4]

۶۔ تفسیر کبیر میں فخر رازی نے اس حدیث کو مفصل طور پر ابوذر غفاری کے ذریعے ذکر کیا ہے حدیث بیان کرتے کرتے وہ یہاں تک پہنچتے ہیں کہ جب علیؑ نے اپنی انگوٹھی (رکوع کی حالت میں) سائل کو دی، رسول خدا ﷺ اس منظر کو دیکھ رہے تھے، آپؐ نے اس وقت دعا کی: ''اے اللہ! بھائی موسیٰ نے تجھ سے دعا کی کہ میرا سینہ کشادہ فرما۔۔۔ اور میرے خاندان سے میرا وزیر مقرر فرما۔۔۔۔ اور اُسے میرے کام میں شریک قرار دے تو نے قرآن ناطق نازل فرمایا جو ان کی دعا کی قبولیت کو بیان کر رہا ہے۔ اے اللہ! میں محمدؐ تیرا برگزیدہ اور تیرا رسول ہوں، میرے سینے کو کشادہ فرما اور میرے امر کو آسان فرما اور میرے اہل سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر مقرر فرما ان کے ذریعے میری طاقت میں اضافہ فرما!''

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا صفحہ ۳۷۰، حدیث ۵۱۱

[2] شواہد التنزیل، جلد ا صفحہ ۳۷۳، حدیث ۵۱۶

[3] شواہد التنزیل، جلد ا صفحہ ۷۷، حدیث ۱۱۵

[4] ملحقات احقاق الحق، جلد ۲۰، صفحہ ۱۲۸

حضرت ابوذر کا بیان ہے کہ ابھی نبی اکرم ﷺ کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کی جبرئیل نازل ہوئے اور آیت ''انما ولیکم اللہ و رسولہ۔۔۔'' کو آنحضرتؐ پر وحی کی۔[۱]

اس حدیث کی اسناد اور حوالے اور جن کتب میں یہ موجود ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ان سب کو اس مختصر کتاب میں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے، یہاں پر ان میں سے صرف چند کو ذکر کیا گیا ہے۔

آیت اور احادیث وزارت کا مفہوم

مذکورہ احادیث واضح طور پر بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی دعا کی طرح آنحضرتؐ کی دعا کو قبول فرمایا، آپؐ کی دعا یہ تھی کہ میرے خاندان سے میرا وزیر بنا دے جو میرا شریک کار رہو اور اس کے ذریعے اللہ کے نبی کی پشت قوی اور محکم ہو بالکل اسی طرح جیسے ہارون موسیٰ کے لیے تھے۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلم بات ہے کہ اس سے نبوت کے امر میں شریک ہونا قطعاً مراد نہیں ہے کیونکہ آنحضرتؐ خاتم الانبیاء ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے ''امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دین کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت بھی مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ تو تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے، ہر مسلمان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہیے، سب کو اپنی اپنی بساط کے مطابق جاہلوں کو دین کی تبلیغ کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔

بنابرایں شریک کار سے مقام خاص مراد ہے جو نبوت اور عمومی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ ہے، کیا اس سے مراد اللہ کی طرف سے رہبر و راہنما اور وزیر ہونے کے علاوہ کوئی اور مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اس بات کا واضح طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ علیؑ رسول خدا ﷺ کے بعد ان کے بلافصل جانشین اور خلیفہ ہیں۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ بہت سارے امور اور ذمہ داریاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہر کوئی انجام نہیں دے سکتا، اور وہ دین الٰہی کی ہر قسم کی تحریف اور انحراف سے حفاظت ہے، اسی طرح شریعت میں مجملات کی تشریح اور مبہمات کی تفسیر، رسول خدا ﷺ کی عدم موجودگی اور ان کے بعد امت کی ہدایت اور راہنمائی اور ان کے اہداف کے حصول میں ان کی مدد و نصرت جیسے امور ہیں، ان تمام فرائض اور امور کا خلاصہ لفظ ''وزیر'' میں ہوتا ہے۔[۲]

اور یہ وہ چیز تھی جو رسول اللہ ﷺ نے علیؑ کے لیے اللہ تعالیٰ سے مانگی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا مستجاب فرمائی۔ اسی بات سے ان بعض مفسرین کے وسوسوں کا جواب بھی مل جاتا ہے جو علیؑ کی شان میں اس قسم کے فضائل برداشت نہیں کرتے۔ ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ کارِ پیغمبر ﷺ میں شریک ہونے کا مطلب امر بالمعروف اور دعوت و تبلیغ ہی بیان کیا جائے اور اسی پر زور دیا جائے۔[۳] حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ یہ تو تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے کسی وزیر کو متعین کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

---

[۱] تفسیر الکبیر فخر رازی، جلد ۱۲ صفحہ ۲۶ (سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ کی تفسیر میں)

[۲] وزیر کا مصدر ''وزر'' جس کا معنی بھاری بوجھ ہے اور چونکہ وزیر مختلف ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ اٹھاتا ہے اس لئے اس پر لفظ وزیر کا اطلاق ہوا ہے

[۳] روح المعانی، جلد ۱۶، صفحہ ۱۸۵

سورہ احزاب کی آیات نمبر ۱۰ اور ۱۱

سورہ احزاب کی بعض آیات کے بارے میں کچھ مفسرین کی رائے ہے کہ یہ علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں یا پھر ان کی بے مثال ایثار و قربانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس سورۃ کی آیت نمبر ۲۳ میں ہم پڑھتے ہیں:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

مومنین میں ایسے مرد موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ان میں سے بعض نے اپنے عہد کو پورا کیا (اور اس راہ میں جام شہادت نوش کیا) اور بعض انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے ذرا بھی (اپنے عہد میں) تغیر و تبدل نہیں کیا۔

دو آیتوں کے بعد یعنی آیت نمبر ۲۵ میں ارشاد رب العزت ہے:

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾

اللہ تعالیٰ نے کفار کو اس حال میں واپس پھیر دیا کہ وہ غصے میں (جل رہے) تھے وہ کوئی فائدہ بھی حاصل نہ کر سکے، لڑائی میں مومنین کے لیے اللہ ہی کافی ہے اور اللہ بڑا طاقت والا، غالب آنے والا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلامی غزووں میں سے جنگ احزاب ایک اہم ترین غزوہ تھا جیسا کہ اس کے نام سے ہی معلوم ہے کہ یہ تمام دشمنان اسلام کی طرف سے تمام اطراف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ اور مقابلہ تھا ان تمام گروہوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام تمام کرنے کے لیے (نعوذ باللہ) اور ہمیشہ کے لیے اس پریشانی سے جان چھڑانے کے لیے ایک کر لیا تھا جن کے مفادات اسلام کی ترقی اور پیش رفت سے خطرے میں پڑ گئے تھے۔

سورہ احزاب کی سترہ آیات اس جنگ کی صورت حال کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ ان میں بہت سے دقیق نکات اور گہرے مطالب بیان ہوئے ہیں، ادھر مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے کیا حالات تھے یہ آیات بڑی باریک بینی اور ظرافت سے اس تمام صورت حال کی تشریح کرتی ہیں۔

اس میدان جنگ میں مسلمانوں پر بڑے سخت اور خطرناک لمحات گزرے ہیں، دشمن کی تعداد کثیر اور بہت بڑا لشکر تھا اس کے مقابلے پر لشکر اسلام کی تعداد کم تھی (مورخین نے احزاب کے لشکر کی تعداد دس ہزار اور اسلام کے لشکر کی تعداد تین ہزار بتائی ہے) اس کے علاوہ دشمن ہر لحاظ سے لیس تھا اور جنگ کی مکمل تیاری کے ساتھ تھا جب کہ مسلمانوں کو وسائل کی کمی کا سامنا تھا جو ان کی مشکلات میں کئی گنا

اضافے کا باعث تھا۔ مذکورہ بالا دو آیتوں کا تعلق انہی سترہ آیات سے ہے۔

شواہدالتنزیل میں پہلی آیت کے حوالے سے وہ اپنی سند سے علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''فینا نَزَلَتْ رِجال صَدَقُوا ما عاهَدُوا الله عَلَيْهِ۔ یعنی: رجال صدقوا۔۔۔والی آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے پھر فرمایا: فانا والله المنتظر۔ یعنی: وہ جو شہادت کی انتظار کر رہا ہے قسم بخدا وہ میں ہوں۔ [1]

نیز وہ عبداللہ بن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ آیت ''مِنَ المومنین رِجال صدقوا ما عاهَدُوا اللهِ عَلَيْه'' علیؑ، حمزہؓ، جعفرؓ کی شان میں ہے اور مِنهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ کا اشارہ علیؑ کی طرف ہے جو راہ خدا میں شہادت کے منتظر تھے: ''فَوَاللهِ لَقَدْ رُزِقَ الشَّهادَةُ۔ یعنی: اللہ کی قسم شہادت انہیں نصیب ہوئی ہے۔ [2] یہی مطلب ابن حجر کی کتاب صواعق میں ابن صباغ مالکی کی کتاب فصول المهمہ اور نیشاپوری کی الکشف والبیان میں بھی بیان ہوا ہے۔ [3]

دوسری آیت کے حوالے سے بحث اس سے بھی وسیع ہے، کیونکہ بہت سے مفسرین کا کہنا ہے کہ ''کفی اللہ المومنین القتال'' یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے مومنین کو جنگ سے بے نیاز کر دیا'' علیؑ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے عمر بن عبدود کے جسم پر کاری ضرب لگائی اور مسلمانوں کو کافروں سے جنگ سے بے نیاز کر دیا۔ جنہوں نے یہ بات کہی ہے ان میں ایک عبداللہ بن مسعود ہیں جب وہ اس آیت کو پڑھتے تھے تو اس کی تشریح میں کہتے تھے: و كَفَى اللهُ المُؤمِنِينَ القِتالَ بِعَلِيّ بنِ اَبِي طالِبٍ [4] حاکم حسکانی نے بھی اسی معنی اور مفہوم پر مشتمل متعدد احادیث عبداللہ بن مسعود سے نقل کی ہیں۔ [5]

نیز وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ جب انہوں نے آیت: ''و كَفَى اللهُ المُؤمِنِينَ القِتالَ'' کو پڑھا تو کہا: كَفاهُمُ اللهُ القِتالَ يَوْمَ الخَنْدَقِ بِعَلِيّ بْنِ اَبي طالِبٍ حين قَتَلَ عَمْرَو بن عَبْدَوَدْ۔ یعنی: اللہ تعالیٰ نے خندق والے دن مومنین کو علی ابن ابی طالب کے ذریعے بے نیاز کر دیا جب انہوں نے عمرو بن عبدود کو قتل کیا (6) نیز اُس نے مشہور صحابی حذیفہ سے حضرت علیؑ کی عمرو بن عبدود سے لڑائی اور اُسے قتل کرنے کے واقعے کو ایک مفصل حدیث میں بیان کرنے کے بعد کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بَشِّرْ يا عَلِيُّ: فَلَو وُزِنَ اَلْيَومُ عَمَلُكَ بِعَمَلِ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ لَرَجَحَ عَمَلُكَ بِعَمَلِهِمْ وَ ذٰلِكَ اَنَّهُ لَمْ يَبْقَ بَيْتٌ مِنْ بُيُوتِ الْمُسْلِمِيْنَ اَلاَّ و قَدْ دَخَلَهُ عِزٌّ بِقَتْلِ عَمْرو

---

[1] شواہدالتنزیل جلد ۲، صفحہ ۲ حدیث ۶۲۷

[2] شواہدالتنزیل جلد ۲، صفحہ ۲ حدیث ۶۲۷

[3] علی فی الکتاب والسنۃ۔ ۲۱۸

[4] شواہدالتنزیل جلد ۲، صفحہ ۳ حدیث ۶۲۹

[5] شواہدالتنزیل جلد ۲، صفحہ ۲ حدیث ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲۔

[6] شواہدالتنزیل جلد ۲، صفحہ ۵ حدیث ۶۳۳

ترجمہ: اے علی! تمھیں بشارت ہو! اگر تمہارے آج کے کارنامے کا امت محمدؐ کے عمل کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو تمہارا یہ عمل ان کے اعمال سے برتر اور بھاری ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے گھروں میں سے کوئی گھر بھی ایسا نہ تھا جس میں عمرو بن عبدود کے قتل ہونے سے عزت اور سربلندی نے قدم نہ رکھا ہو۔[1]

اسی مطلب کو ابن حکیم نے اپنے دادا کے ذریعے سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا ہے۔ الدر المنثور میں سیوطی نے ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابن عساکر کے ذریعے ابن مسعود سے روایت کی ہے جب وہ مذکورہ آیت کو پڑھتے تھے تو (اس کی تشریح میں) یوں کہتے تھے: 'و کفی اللہُ المؤمنینَ القِتالَ بِعَلیِّ بنِ ابی طالِب'[2] اسی مفہوم کو علامہ شیخ سلیمان قندوزی سے ینابیع المودۃ میں بھی بیان کیا ہے۔[3]

اور بھی بہت سارے افراد نے جن کے نام اور کتب کی ایک طویل فہرست ہے، اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اہم اور قابل توجہ بات یہ ہے مندرجہ بالا تشریح کے ساتھ ان آیات کا مفہوم اور مطلب یہ ہے کہ جنگ احزاب کے خطرناک ترین میدان، جو اسلام دشمنوں کے ترکش کا آخری تیر تھا اور اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش تھی، اس میں علی -حکم الٰہی سے مسلمانوں کی فتح کا موجب بنے ہاں وہ ارادہ الٰہی کے جاری ہونے کا مقام اور اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح کا اہم سبب تھے۔ یہ ایک ایسی فضلیت ہے جو امت محمدیہ کے کسی فرد کو سوائے علیؑ کے نصیب نہیں ہوئی ہے۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کا حقدار وہ فرد ہے جس کا ایک عمل امت کے تمام افراد کے عمل سے بھاری ہے یا کوئی اور افراد؟

سوال

ممکن ہے یہاں پر یہ کہا جائے کہ اس سورۃ کی آیت ۹ جنگ خندق کے واقعے کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کرتی ہے، اس میں آیا ہے کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَآءَتۡكُمۡ جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا وَّجُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرًا ۞

اے ایمان لانے والو اپنے پر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو جب عظیم لشکر تمہارے مقابلے کے لیے آیا تھا ہم نے ان پر دو بڑے سخت طوفان بھیجے اور نامرئی لشکر بھیجے (اور انہیں درہم برہم کر دیا) اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۷ حدیث ۶۳۴

[2] الدر المنثور، جلد ۵ صفحہ ۱۹۲

[3] ینابیع المودۃ، صفحہ ۹۴

آگاہ ہے۔(احزاب/۹)

اس آیت کے مطابق کفار کے مختلف گروہوں کے اس لشکر کی شکست کے عوامل میں سے ایک عامل شدید آندھی کا چلنا تھا جو ان پر حاوی ہو گئی تھی۔ دوسرا عامل اللہ کا نامرئی لشکر تھا (اللہ کے فرشتے) اس بنا پر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ فتح کا سبب علی بن ابی طالب تھے؟

جواب

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک جنگ میں فتح و کامیابی کے کئی اسباب اور عوامل ہو سکتے ہیں فوجی عوامل، طبیعی اور معنوی عوامل وغیرہ، اس میدان میں تین اسباب اور عوامل یکجا ہو گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک موثر واقع ہوا اس سے کسی کو انکار نہیں ہے، احزاب کے عظیم لشکر کے سب سے بڑے سردار عمرو بن عبدود کا علی بن ابی طالبؑ کے طاقتور ہاتھوں سے قتل، آندھی کا چلنا اور فرشتوں کا لشکر، یہ سب موثر تھے، تمام مقامات پر جب کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے میں چند اسباب اکٹھے اور یکجا ہوں تو اس واقعے کی نسبت اُن میں سے ہر ایک کی طرف یا سب کی طرف دی جا سکتی ہے۔

۱۲۔ آیت بینہ اور شاہد

سورہ ہود کی آیت نمبر ۱۷ میں ارشاد ربانی ہے:

اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ وَ یَتۡلُوۡہُ شَاہِدٌ مِّنۡہُ وَ مِنۡ قَبۡلِہٖ کِتٰبُ مُوۡسٰۤی اِمَامًا وَّ رَحۡمَۃً ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ

کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہو اور اس کے پیچھے اس کے رب کی طرف سے ایک شاہد بھی آیا ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (دلیل ہو جو) راہنما اور رحمت بن کر آئی ہو (بھلا اس کی طرح ہوسکتا ہے جو یوں نہ ہو) یہی (حق کے طالب) اس پر ایمان لائیں گے۔

اس آیت کے متعلق حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں متعدد روایات ذکر کی ہیں جن کی تعداد سولہ تک ہے، وہ گواہی دیتا ہے کہ آیت میں ''شاہد'' سے مراد علیؑ ہیں۔ وہ انس بن مالک سے بیان کرتا ہے کہ: ''اَفَمَنۡ کَانَ علی بَیِّنَۃٍ مِنۡ رَبِّہٖ'' کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہو کے جملے سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور ''وَ یَتۡلُوۡہُ شاھِدٌ مِنۡہُ'' سے مراد علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ یہ علیؑ تھے جو عہد و پیمان کے ختم کرنے پر اہل مکہ کے سامنے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان بنے تھے۔ [1]

ایک اور حدیث میں وہ ''ابن عباس'' سے روایت کرتے ہیں اُس نے ''وَیَتۡلُوۡہُ شاھِدٌ مِنۡہُ'' تفسیر بیان کرتے کہا ہے ''ھُوَ عَلِیٌّ خاصّۃ '' وہ صرف اور صرف علیؑ ہیں۔ [2] نیز اس نے اذان (علیؑ کے خاص اصحاب میں سے ایک) کے ذریعے سے علیؑ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر میرے لیے قضا کی مسند بچھا دی جائے میں اس پر بیٹھ کر اہل تورات کے درمیان تورات سے، انجیل والوں کے لیے انجیل سے، اہل زبور کے لیے زبور سے اور قرآن پر عقیدہ رکھنے والوں کے لیے قرآن سے فیصلے کروں گا ایسے فیصلے اور انصاف کہ وہ اللہ کی طرف اوپر جائے۔ اللہ کی قسم! دن یا رات میں، بیابان میں یا پہاڑ پر صحرا میں یا دریا کے اندر کوئی آیت نازل نہیں ہوئی مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کس وقت نازل ہوئی ہے؟ اور کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟

کسی نے سوال کیا کہ آپ کے بارے میں کونسی آیت نازل ہوئی ہے، اے مومنو کے امیر! تو انہوں نے فرمایا: ''اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِنۡ رَبِّہٖ و یَتۡلُوۡہُ شاھِدٌ مِنۡہُ۔ یعنی: محمدؐ اپنے رب کی طرف سے بینہ پر تھے اور میں ان کا شاہد اور گواہ تھا جو ان کے نقش قدم پر چلتا ہوں۔ [3]

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۲۸۰ حدیث ۳۸۳

[2] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۲۸۲ حدیث ۲۸۷

[3] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۲۸۰ حدیث ۳۸۴

الدر المنثور میں سیوطی نے بھی اس موضوع کے متعلق متعدد روایات پیش کی ہیں، ان میں ایک روایت یہ ہے جو اس نے ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابونعیم کے ذریعے علی بن ابی طالب- سے نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مامِنْ رَجُلٍ مِنْ قُرَیْشٍ اِلاَّ نَزَلَ فِیْہِ طائِفۃمِنَ القرآن یعنی: قریش کا کوئی مرد ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ قرآن کا کچھ حصہ اس کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ کسی نے خود ان سے پوچھ لیا کہ آپؑ کے بارے میں کیا نازل ہوا ہے؟ انہوں نے فرمایا: کیا تم سورہ ہود نہیں پڑھتے ہو جو فرماتی ہے: اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ یعنی: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر تھے اور میں ان کا شاہد اور گواہ ہوں۔[1] اسکے بعد وہ چند اور احادیث بیان کرتے ہیں جو مذکورہ مطلب کو ذکر کرتی ہیں۔[2]

تفسیر ''روح المعانی'' میں آلوسی نے پہلے تو اس آیت کے متعلق علیؑ کی حدیث کو ابن ابی حاتم اور ابن مرور یہ سے نقل کیا ہے اس کے بعد اس نے اسی معنی پر مشتمل ایک اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''افمن کان علی بینة '' میں ہوں اور ''یتلو شاھد ''علیؑ ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ بعض شیعیوں نے اس احادیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ کی خلافت پر استدلال کیا ہے، کیونکہ اس آیت میں علیؑ کو شاہد کہا گیا ہے اور آیت اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا'' میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف شاہد کے طور پر کرایا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ کا مقام امت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرح ہے۔

کیونکہ خداوند فرماتا ہے ''وَيَتْلُوْهُ'' یعنی علیؑ ان کے پیچھے آئیں گے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلیفہ ہیں۔ آخر میں وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس کے بعد وہ ایک روایت نقل کرتے ہیں جس کے مطابق شاہد سے مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ ہے۔[3]

تفسیر المنار کے مفسر جو شیعیوں کے حوالے سے اور امامت سے مربوط مسائل میں تعصب میں آلوسی سے کمتر نہیں ہیں، وہ آیت کی تفسیر میں مشکل کا شکار ہوئے ہیں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے عجیب قسم کے تکلفات میں مبتلا ہوئے ہیں۔ من جملہ وہ یہ کہتے ہیں: آیت کا ظاہر ترین معنی یہ ہے کہ بینہ سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی نبوت کے متعلق علم یقینی ہے، اور شاہد وہی قرآن ہے، وہ سعید بن جبیر سے نقل کرتے ہیں کہ بینہ قرآن اور شاہد جبرئیل ہیں اور ''یتلوہ' مطلب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کی تلاوت کرنا ہے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں: ایک ضعیف روایت میں آیا ہے کہ شاہد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان ہے جو قرآن کی لوگوں کے سامنے تلاوت کرتی تھی، ایک اور ضعیف روایت میں ہے جسے شیعہ نقل کرتے ہیں کہ شاہد علیؑ ہیں۔[4]

نہایت افسوس سے کہنا پڑھتا ہے کہ اپنے سے قائم کیے ہوئے مفروضے اور آراء قرآن کی آیات اور اسلامی روایات کو سمجھنے میں

---

[1] الدر المنثور ج ۳، صفحہ ۳۲۴

[2] الدر المنثور ج ۳، صفحہ ۳۲۴

[3] روح المعانی جلد ۱۲، صفحہ ۲۸

[4] المنار، جلد ۱۲، صفحہ ۵۳

بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہاں پر چند نکات اہمیت کے حامل ہیں:

۱۔ تعجب کی بات ہے کہ ایسی حدیث جو اتنے زیادہ طرق سے مختلف مشہور اسلامی کتب میں منقول ہو، اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ایک روایت ہے جسے شیعہ نقل کرتے ہیں، کیا المنار کے مفسر نے ان سب روایات کو نہیں دیکھا جو الدر المنثور، شواہد التنزیل اور حتی روح المعانی میں درج ہیں اور بتاتی ہیں کہ شاہد سے مراد علیؑ ہیں، پھر وہ کیوں یہ کہہ رہے ہیں کہ اس روایت مکتب شیعہ کے فائدہ میں ہو وہ شیعہ روایت ہے اگرچہ اُسے دسیوں اہل سنت کے راویوں نے ہی کیوں نہ بیان کیا ہو؟!

۲۔ بہت سارے سُنی مفسرین اس تفسیر کو مانتے ہیں کہ شاہد سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کی ''زبان'' ہے (یہ معنی قرآن میں کہیں بھی نہیں ملتا) جب کہ المنار کے مصنف اُسے ایک ضعیف روایت شمار کرتے ہیں، شاید وہ بھی اس حقیقت کو سمجھ گئے کہ شاہد کی زبان پیغمبرؐ سے اور اس طرح ''یتلوہ'' کی قرآن کی تلاوت سے تفسیر کرنا بہت بڑا تکلف ہے۔

۳۔ اور یہ جو کہا گیا ہے ''شاہد'' سے مراد جبرئیل ہیں جب کہ لوگوں میں کوئی بھی اس شاہد کو نہیں دیکھ پاتا اور اس کے موجود ہونے کا اُسے کوئی پتہ نہیں ہے پس ایسی صورت میں گواہی کا مفہوم اس بات سے میل نہیں کھاتا۔ کیا ہم ایسا شعر کہنے پر مجبور ہیں جس کے قافیہ کی مشکل میں پڑ جائیں

۴۔ اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات وہ ہے جو آلوسی نے ''روح المعانی'' میں کی ہے وہ کہتے ہیں کہ بینہ سے مراد قرآن مجید ہے اور ''شاہد'' سے مراد قرآن کا اعجاز ہے۔ حالانکہ قرآن کا بینہ ہونا صرف اس کے اعجاز کی وجہ سے ہے قرآن اپنے اعجاز کے پہلوؤں کے بغیر بینہ شمار نہیں ہوسکتا، اس بنا پر بینہ اور شاہد ایک ہوں گے اور یہ مطلب آیت کے مفہوم سے متصادم ہے۔

۵۔ بینہ کی تفسیر رسول خدا ﷺ کے اپنی نبوت کے بارے میں علم یقینی سے کرنا اور پھر شاہد سے قرآن مجید مراد لینا اور بھی عجیب وغریب بات ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بینہ کا معنی اور مطلب کیا ہے، سب سے پہلے ہمیں قرآن سے معلوم کرنا چاہیے قرآن مجید میں لفظ بینہ ۱۹ مرتبہ اور اس کی جمع ''بینات'' ۵۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے، عام طور پر یہ معجزہ یا آسمانی کتب اور قرآن مجید کے معنوں میں آیا ہے نہ کہ فطری، باطنی اور ضروری علم کے معنی میں۔

بنابرایں اگر ہم تکلفات کو برطرف کر کے دیکھیں تو مذکورہ بالا آیت میں بینہ قرآن کے معنی میں ہے جو کہ آنحضرتؐ کا معجزہ جاوید ہے، اور شاہد سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی اور شخص ہے جو ان کی حقانیت پر گواہی دے۔ لیکن وہ افراد جو ایسی تفسیروں سے خوفزدہ ہیں جو مذہب شیعہ کے حق میں تمام ہوں وہ ہر قسم کے تکلفات کو بروئے کار لاتے ہیں تا کہ کسی طرح اس حقیقی تفسیر سے جان چھڑائی جائے۔ اور یوں پہلے طے شدہ افکار اور نظریات پر کوئی زد نہ پڑنے پائے۔

۱۳۔آیت صدیقون

سورہ حدید کی آیت ۱۹ میں ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ صدیق (بہت زیادہ سچے اور تصدیق کرنے والے) اور اپنے رب کے ہاں گواہ ہیں ان کے لیے ان کا اجر اور نور ہے۔

شواہد التنزیل میں ابن ابی لیلی سے ایک روایت ہے جو اس نے اپنے باپ سے نقل کی ہے وہ یوں بیان کرتے ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللهِ (ص) الصّدّيقونَ ثَلَاثَةٌ حَبيبُ النَّجارِ مُؤمِنُ آلِ ياسِيْنَ وَ حِزبيل (حزقيل) مُؤمِنُ آلِ فِرعُونَ و عَلِيُّ بْنُ ابی طالِبٍ الثالِثُ وَ هُوَ اَفْضَلُهُمْ۔

رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: صدیق تین افراد ہیں: مومن آل یاسین حبیب نجار، مومن آل فرعون، حزقیل اور علی بن ابی طالب ان میں سے تیسرے ہیں اور ان سب سے افضل اور برتر ہیں۔[1]

یہ حدیث احمد بن حنبل کی کتاب ''فضائل'' میں ابونعیم کی ''معرفۃ الصحابہ'' میں اور ابن مغازلی کی ''مناقب'' میں بھی بیان ہوئی ہے۔[2] کتاب شواہد التنزیل میں اس مضمون کی حامل چار اور احادیث بھی دیگر اسناد سے مذکورہ ہیں۔[3]

ینابیع المودۃ میں شیخ سلیمان قندوزی سے مندرجہ بالا حدیث کو مسند احمد، ابونعیم، ابن مغازلی اور موفق خوارزمی کے ذریعے ابولیلی اور ابوایوب انصاری سے نقل کیا ہے، کہ ان دونوں راویوں کا بیان ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: الصِّدِّيقُونَ ثلاثةٌ: حَبيبُ النَّجار... وَ حِزقِيْلُ مُؤمِنُ آلِ فِرْعُونَ و عَلِيُّ بنُ ابی طالِبٍ وَ هُوَ اَفْضَلُهُمْ [4] کنز العمال میں بھی یہی بات ابن عباس سے منقول ہے۔[5] نیز احقاق الحق نے اس حدیث کو مختلف کتب اور مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے۔[6]

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۲۲۳ حدیث ۹۳۸

[2] تعلیقات وحواشی محمودی بر شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۲۲۴۔

[3] ایضا، حدیث ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۲

[4] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۲۴، باب ۴۲

[5] کنزل العمال، جلد ۱۱، صفحہ ۶۰۱، حدیث ۳۲۸۹۔

[6] احقاق الحق جلد ۳، صفحہ ۲۴۳۔

اگر چہ مذکورہ بالا احادیث مسئلہ خلافت کی بات بلا واسطہ تو نہیں کرتیں لیکن علیؑ کے لیے صدیق امت کا ثابت ہونا ایک بہت بڑی فضلیت ہے کہ جب بھی اس کو دوسروں کے مقابلے میں ان کے پلڑے میں ڈالا جائے تو علیؑ کی برتری واضح طور پر نظر آتی ہے جو اچھی طرح سے ثابت کرتی ہے کہ خلافت رسول کے لیے وہ قابل ترین اور اہل ترین فرد ہیں۔ ان کثیر روایات کی روشنی میں اس امت کے صدیق علیؑ ہیں لیکن تعجب سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض افراد نے یہ لقب اوروں کو دیا ہے۔ درست ہے انہوں نے اس آیت کے ضمن میں روایت نقل کی ہے جس کے مطابق صدیقون آٹھ اشخاص ہیں: ان میں ایک حضرت ابوبکر اور دوسرے علیؑ ہیں، لیکن توجہ رہے کہ یہ روایت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول نہیں ہے جو روایت آنحضرت سے نقل ہوئی ہے اُس کے مطابق اس امت کے صدیق علیؑ ہیں۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ آیت کا عمومی مفہوم مذکورہ روایات سے کوئی تضاد نہیں رکھتا کیونکہ کئی مرتبہ ہم نے یہ کہا ہے کہ اس قسم کی روایات اکمل فرد کی نشاندہی کر رہی ہوتی ہیں یعنی وہ کہہ رہی ہیں کہ صدیق کا امت اسلامی میں مکمل اور اکمل مصداق علیؑ ہیں جو بہت زیادہ سچے اور صادق تھے، جس نے امت کے تمام مردوں سے پہلے ایمان لایا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی اور آنحضرتؐ نے انہیں امت مسلمہ میں صدیق کا خطاب دیا ہے۔ اس آیت کے بعد والی آیت کی تفسیر میں بھی اس بارے میں بہت سارے نکات کا آپ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

۱۴۔ آیت نور

سورہ حدید کی آیت ۲۸ میں ارشاد رب العزت ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۸

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تا کہ اللہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا کرے اور تمہارے لیے نور قرار دے جس کی روشنی میں تم راستہ چل سکو اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اللہ غفور اور رحیم ہے۔

شواہد التنزیل میں اس آیت کی تفسیر میں وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ ''يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهٖ'' سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں (جو اللہ نے علیؑ کو مرحمت فرمائے) اور ''يَجْعَلْ لكم نُوْرًا تمشون بِهٖ'' سے مراد علی بن ابی طالبؑ ہیں (جو امت مسلمہ کا نور اور ان کی ہدایت کا سرمایہ ہیں) [۱]

ابن عباس نے یہ بات خود نہیں کہی ہے کیونکہ صاحب کتاب نے ایک اور حدیث میں اپنی سند سے جابر بن عبداللہ انصاری سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ ''يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهٖ'' کا مطلب حسنؑ اور حسین ہیں اور آنحضرتؐ نے ''وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا، اس سے مراد حضرت علی بن ابی طالب۔ ہیں۔ [۲]

مذکورہ کتاب میں اسی آیت کی تفسیر میں ابوجعفر الباقر -کا قول نقل ہوا ہے، کہ انہوں نے فرمایا: مَنْ تَمَسَّكَ بِوَلايَةِ عَلِيٍّ فَلَهُ نورٌ یعنی: جو شخص ولایت علی کے دامن کو تھام لے اس کے لیے نور اور روشنی ہے۔ [۳] (غور کیجیے گا)

اسی مطلب کی تائید میں ابوسعید حذری سے وہ نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَمَا وَاللهِ لا يُحِبُّ اَهْلَ بَيْتِي عَبْدٌ اِلاَّ اعطاهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ نورًا حتّٰى يَرِدَ عَلَيَّ الحَوْضَ یعنی: خدا کی قسم جو بھی میرے اہل بیت سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اُسے نور عطا فرمائے گا یہاں تک کہ وہ مجھ تک حوض کوثر پر پہنچ جائے گا۔ [۴]

کنز العمال میں علیؑ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اَنَا عَبْدُ اللهِ وَ اَخُو رَسُولِهٖ وَ اَنَا الصِّدِّيق الاَكْبَرُ لا يَقُولُهَا

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۲۷، حدیث ۹۴۳

[۲] ایضا صفحہ ۲۲۸، حدیث ۹۴۴

[۳] ایضا صفحہ ۲۲۸، حدیث ۹۴۶

[۴] ایضا صفحہ ۲۲۸، حدیث ۹۴۷

بَعۡدِی اِلَّا کَذّابُ مُفۡتَرٍ وَ لَقَدۡ صَلَّیۡتُ قَبۡلَ النّاسِ سَبۡعَ سِنِیۡنَ۔ یعنی: میں ہوں اللہ کا بندہ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھائی، میں ہوں صدیق اکبر اور میرے بعد جو بھی یہ دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا افترا باندھنے والا ہوگا میں نے لوگوں سے سات سال پہلے (رسول خدا کے ساتھ) نماز پڑھی ہے۔[1] یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس نے سب سے پہلے (مردوں میں سے) اللہ کے رسول کی تصدیق کی ہے وہ میں تھا، لہٰذا صدیق اکبر کے خطاب کا حقدار میں ہوں۔

اسی کتاب میں معاذ عدویہ سے منقول ہے کہ میں نے بصرہ کے منبر پر علی سے یہ سنا ہے، انہوں نے فرمایا: اَنَا الصِّدِّیۡقُ الۡاَکۡبَرُ آمَنۡتُ قَبۡلَ اَنۡ یُؤۡمِنَ اَبُو بَکۡرٍ وَ اَسۡلَمۡتُ قَبۡلَ اَنۡ یُسۡلِمَ۔ یعنی: میں صدیق اکبر ہوں (کیونکہ میں وہ ہوں جس نے) ابوبکر سے پہلے ایمان لانے والا میں تھا اس کے اسلام لانے سے پہلے میں اسلام لایا تھا[2] یہ فضلیت تمام فضائل سے بڑی ہے اس فضلیت کا حامل سب سے زیادہ خلافت رسول کے اہل اور شائستہ ہے۔

حضرت علیؑ کے آنحضرتؐ پر مردوں میں سے سب سے پہلے ایمان لانے کے موضوع پر علامہ امینی نے الغدیر کی تیسری جلد میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، اس کی اسناد کو اہل سنت علماء کی مشہور اور معتبر ترین کتب سے بڑی کثرت سے بیان کی ہیں، اس کے ساتھ اسلامی شعراء کے بہت زیادہ اشعار بھی گواہ کے طور پر ذکر کیے ہیں۔[3] اس کتاب میں ایک فصل بعنوان ''سب سے پہلا مسلمان'' ہم نے ذکر کی ہے جس میں بہت ساری کہنے کی باتیں بیان کی گئی ہیں وہاں پر آپ ان کا مطالعہ کریں گے۔ انشااللہ

[1] کنز العمال، جلد ۱۳، صفحہ ۱۲۲، حدیث ۳۶۳۸۹ (موسسۃ الرسالہ۔ بیروت)

[2] ایضا، صفحہ ۱۶۴، حدیث ۳۶۴۹۷

[3] الغدیر، جلد ۳، صفحہ ۲۲۱۔۲۴۱

۱۵۔آیت انداز

سورہ شعراء کی آیت نمبر ۲۱۴ اور ۲۱۵ میں ارشاد رب العزت ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾

اور اپنے قریبی ترین رشتہ داروں کو ڈرائیں اور مومنین میں سے جو آپ کی پیروی کریں ان سے تواضع سے پیش آئیں۔

یہ آیات تاریخ اسلام کے مشہور واقعہ کو بیان کر رہی ہیں جسے تقریباً تمام اسلامی مورخین نے لکھا ہے، اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت موجود ہے جو مجمع البیان میں طبرسی کے بقول عام وخاص کے نزدیک مشہور ہے، نیز شواہد التنزیل میں حاکم حسکانی کے مطابق براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ جب آیت۔''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ''نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے بنی عبدالمطلب جن کی تعداد چالیس تھی، انہیں جمع کیا اور ان کے لیے کھانے کا اہتمام کیا اور فرمایا: اللہ کا نام لے کر قریب ہوں اور کھانا شروع کریں، اس کے بعد دودھ کا برتن لایا گیا آپؐ نے فرمایا: اللہ کا نام لے کر پئیں دوسرے دن پھر ان کی دعوت کی کھانا اور دودھ فراہم کیا پھر انہیں خوش خبری سُنائی اور ڈرایا بھی، آپؐ نے فرمایا: میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت لے کر آیا ہوں، اسلام لے آئیں اور اطاعت کریں تا کہ ہدایت پائیں، پھر فرمایا:

وَ مَنْ يُوَاخِينِي (مِنْكُمْ) و يُوَازِرُنِي يَكُونُ وَلِيِّي وَ وَصِيِّي بعدي و خَلِيفَتِي فِي اَهْلِي و يَقْضِي دَيْنِي

تم میں سے کون میرا برادر بننے کے لیے تیار ہے؟ کون میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہے؟ (جو ایسا کرے گا) وہ میرا دوست، میرے بعد میرا وصی اور میرے خاندان میں میرا جانشین ہوگا، وہ میرا قرض ادا کرے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس استفسار پر سب خاموش ہوگئے۔ آپؐ نے تین بار اپنی بات کو دہرایا سب اسی طرح خاموش رہے لیکن علیؑ نے کہا: میں یہ کام کروں گا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ہی یہ ہو گے۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابو طالب سے کہنے لگے کہ اب اپنے بیٹے علیؑ کی اطاعت کرو کیونکہ محمدؐ نے اسے تمہارا امیر بنا دیا ہے۔[1]

شواہد التنزیل کے حاشیے پر یہ حدیث عبد اللہ بن عباس اور اسی طرح ابو رافع سے بھی نقل ہوئی ہے۔ شواہد التنزیل میں ''خصائص نسائی'' سے نقل ہوا ہے کہ ربیعہ بن ناجذ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے علیؑ سے پوچھا کس دلیل کی بنا پر آپ (اپنے چچازاد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے) وارث بنے ہیں؟ نہ کہ تمہارے چچا (اصولی طور پر تو وہ حقدار تھے؟) علیؑ نے اس کے جواب میں یوم الانذار کا واقعہ بیان کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۴۲۰ (خلاصہ کے ساتھ) مجمع البیان، جلد ۷ اور ۸، صفحہ ۲۰۶۔

اَیُّکُمْ یُبایعُنِی عَلٰی اَنْ یَکُونَ اَخی و صاحِبِی وَ وَارِثی

تم میں سے کون اس بات پر میری بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی، میرا دوست اور میرا وارث ہوگا۔

کسی نے بھی حامی نہیں بھری، میں کھڑا ہوا حالانکہ ان سب سے میں چھوٹا تھا آنحضرتؐ نے فرمایا: جاؤ، تیسری مرتبہ ہوا جب (میرے علاوہ کسی نے آپؐ کا جواب نہ دیا) تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا اور پھر فرمایا: اس بنا پر میں نے چچازاد بھائی کو اپنا وراث بنایا ہے نہ اپنے چچا کو"[1]

نامور مورخ طبری نے بھی اسی حدیث کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کے نیچے وہ بیان کرتا ہے کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: **اِنَّ هذا اَخی و وصیّی وَخَلِیفَتِی فِیکم فَاسْمَعُو لَہُ وَاَطِیْعُوہُ**۔ یعنی: یہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔'' یہ سن کر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہنسنے لگے اور ساتھ حضرت ابو طالب سے کہنے لگے: محمدؐ نے حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کے فرمان سنو اور اس کی اطاعت کرو۔[2]

اس کے بعد اس واقعہ کو طبری نے اور ذرائع سے بھی نقل کیا ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اسی طبری جو اہل سنت کے بڑے مفسر اور مورخ ہیں، نے اپنی ''تاریخ'' میں یوم الانذار کے واقعے کو اس طرح سے بیان کیا ہے لیکن جب تفسیر لکھتے ہیں (توجہ رہے کہ تاریخ کے علاوہ طبری کی ایک ۳۰ جلدوں پر مشتمل مفصل تفسیر کی کتاب ہے) اور اس آیت پر پہنچتے ہیں اور مذکورہ داستان کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: **اَیُّکُمْ یُوازِرُنی عَلیَ هذا الاَمْرِ عَلی اَنْ یَکُونَ اَخی و کذا و کذا** ... یعنی: علیؑ نے عرض کیا: **اَنَا یا نبِیَّ اللہِ اَکُونُ وَزِیْرَکَ** ... پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **اِنَّ هذا اَخِی و کذا و کذا**۔[3]

جیسا کہ آپ نے دیکھا اس نامور مفسر نے ''**وَصیّی و خلیفتی فِیکم**'' (علی میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے) کے الفاظ کی بجائے کذا و کذا (ایسا ایسا ہے) کو استعمال کیا ہے اور اس عمل کو دو مرتبہ دہرایا ہے مبادا ''وصی وخلیفہ'' کے الفاظ مکتب اہل بیت کے پیروان کے ہاتھوں لگ جائیں اور اسے وہ علیؑ کی خلافت پر بطور دلیل پیش کریں اور طبری اور اس طرح کے افراد کے متعصب افکار اور نظریات مشکوک ہوجائیں۔ کیا تحریر میں امانت داری کا یہی مطلب ہے؟ احادیث نبویؐ کو بیان کرنے کا یہی طریقہ ہے؟

کیا انہیں یہ خیال نہیں آیا کہ ایک دِن ان کی تاریخ کی کتاب کی عبارت کو ان کی تفسیر کے سامنے رکھا جائے گا اور ان کا موازنہ کیا جائے گا اور فیصلہ کیا جائے گا؟ یہ بات ضرور مدنظر رہے کہ اس کام میں طبری اکیلا نہیں ہے اس طرح کے کام بہت سے افراد نے کیے ہیں، اور کر رہے ہیں۔ روح المعانی میں آلوسی نے بھی اس روایت کو ناقص اور نامکمل نقل کیا ہے، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: ان میں سے بعض روایات سے شیعوں نے اپنے مطالب یعنی خلافت کے مسئلہ پر استدلال کیا ہے۔ لیکن ان روایات کی تاویل اور توجیہہ کرنی چاہیے یا پھر یہ کہا جائے

---

[1] تعلیقات شواہد التنزیل جلد ا، صفحہ ۴۲۳

[2] تاریخ طبری، جلد ۲، صفحہ ۶۳ (مطبوعہ بیروت)

[3] تفسیر جامع البیان، طبری، جلد ۱۹، صفحہ ۷۵ (سورہ شعراء آیت ۲۱۴ کی تفسیر میں)

کہ یہ جعلی اور ضعیف روایات ہیں۔[1]

اس مفسر کی سوچ کتنی عجیب ہے؟ کہتے ہیں کہ چونکہ ان روایات کا فائدہ شیعہ کو ہوتا ہے اس لیے ان کی تاویل کی جائے یا پھر انہیں ضعیف قرار دیا جائے یا جعلی سمجھا جائے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ فیصلے کی بنیاد تاریخی واقعات، قرآن اور حدیث نہیں ہے بلکہ بنیاد پہلے سے طے شدہ افکار ہیں اور جو بھی مطلب اس کے خلاف ہو آنکھیں بند کر کے اُسے ضعیف قرار دے دیا جائے یا اس کی توجیہہ کر دی جائے۔ بدیہی ہے کہ ایسی صورت حال میں اگر تمام انبیاء اور آسمانی کتب اکٹھی ہو جائیں وہ اس قسم کی سوچ اور طرز فکر رکھنے والے افراد کی سوچ میں تبدیلی نہیں لا سکتے اور اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

اہل سنت کے آئمہ اربعہ میں سے ایک احمد بن حنبل ہیں ان کی مشہور کتاب ''مسند احمد'' ہے اس میں انہوں نے یوم الانذار کے واقعہ کو درج کیا ہے وہ بیان کرتے ہوئے یہاںتک پہنچتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کون ضمانت دیتا ہے کہ میرا قرض ادا کرے گا اور میرا وعدہ پورا کرے گا اور وہ میرے ساتھ بہشت میں ہوگا اور میرے خاندان میں میرا جانشین ہوگا، آخر کار علیؑ نے اسے قبول کیا اور عرض کیا میں اس ذمہ داری کو انجام دوں گا۔[2]

ابن ابی الحدید معتزلی (اسی حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو علیؑ کے وزیر ہونے کو ثابت کرتی ہے) کہتے ہیں کہ وزارت والی روایت کو طبری نے اپنی تاریخ میں عبد اللہ بن عباس کے ذریعے علی بن ابی طالبؑ سے بیان کی ہے کہ جب آیت: ''وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ... نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو بلایا۔۔۔ اس کے بعد وہ تفصیل سے واقعے کو بیان کرتے ہوئے تک یہاں پہنچتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قَدۡ اَمَرَنِیَ اللہُ اَنۡ اَدۡعُوكُمۡ اِلَیۡهِ، فَاَیُّكُمۡ یُوَازِرُنِی عَلٰی هٰذَا الۡاَمۡرِ عَلٰی اَنۡ یَكُونَ اَخِی وَ وَصِیِّی وَ خَلِیۡفَتِی فِیۡكُمۡ۔ یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس (کے دین) کی طرف دعوت دوں تم میں سے کون اس کام میری مدد کرے گا تا کہ وہ میرا بھائی، وصی اور تمہارے درمیان میرا جانشین قرار پائے۔'' علیؑ نے عرض کیا: اَنَا یَا رَسُولَ اللہِ اَكُونُ وَزِیۡرَكَ عَلَیۡهِ۔ یعنی: ''اے رسول خدا! میں اس کام میں آپؐ کا ہاتھ بٹاؤں گا اور مدد کروں گا۔'' اس پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''هٰذَا اَخِی وَ وَصِیِّی وَ خَلِیۡفَتِی فِیۡكُمۡ۔ یعنی: ''یہ میرے بھائی، وصی اور تمہارے درمیان میرے خلیفہ ہیں۔''[3]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس روایت اور بعض گزشتہ روایات میں ''خلیفتی فیکم'' (تمہارے درمیان میرا خلیفہ) کے الفاظ آئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری روایات میں جو 'اَهۡل' (میرے خاندان) کے لفظ آیا ہے اُس کا بھی یہی معنی (تمہارے درمیان) ہے (غور کیجیے گا) ابن اثیر[4] نے اپنی کتاب کامل میں اس واقعے کو بطور مفصل ذکر کیا ہے (بہت سارے محدثین اور مورخین سے زیادہ

---

[1] روح المعانی، جلد ۱۹، صفحہ ۳۶ (مذکورہ آیت کی تفسیر)

[2] مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۱۱۱ (کچھ اختصار کے ساتھ)

[3] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: جلد ۱۳، صفحہ ۲۱۰۔

[4] ابن اثیر ساتویں صدی ہجری کے مشہور مورخ ہیں ان کی تاریخ کی کتاب ۱۳ جلدوں پر مشتمل ہے۔

تفصیل کے ساتھ) لکھتے ہوئے وہ یہاں پہنچتے ہوئے کہتے ہیں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَیُّکُمْ یُوازِرُنی عَلٰی هذاالْاَمرِ عَلٰی اَنْ یَّکُونَ اَخِی وَوَصِیّی وَخَلِیْفتی فِیْکُمْ۔ یعنی: تم میں سے کون اس کام میں میری مدد کرے گا تا کہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا جانشین قرار پائے۔ جب تمام افراد نے نفی میں جواب دیا یا خاموش رہے تو علیؑ نے عرض کیا: اَنَا یانبیّ الله اکونُ وزیرك عَلَیْهِ۔ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ هذا اَخی ووصِیتی وخَلِیْفتی فِیْکُمْ فاسْمعُوا لَهُ واَطیعوُا[1]

دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ اس حدیث میں بھی ''خلیفتی فِیکم'' (تمہارے درمیان میرا خلیفہ) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ درحقیقت یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کہ اس دِن جب علیؑ صرف تیرہ سال کے تھے آنحضرتؐ نے قاطعیت کے ساتھ ان سے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ اس امر کی کون پیشگوئی کرسکتا تھا کہ آج کا تیرہ سالہ بچہ کل کو عالم انسانیت کی بہت بڑی شخصیت بنے گا اور رسول خداؐ کی خلافت اور جانشینی کا حقدار اور لائق ہوگا، اور سب لوگوں کو ان کے احکامات سننا پڑیں گے۔ اور ان کی اطاعت کرنا پڑے گی۔ اس سے بھی اہم نکتہ یہ ہے کہ اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کے اوائل میں بھی یوم الانذار، میں ارشاد فرمایا اور اپنی حیات مبارکہ کے آخری مہینوں میں غدیر خم کے میدان میں بھی بیان فرمایا۔ کیا یہ بات علیؑ کی امامت پر بہترین دلیل نہیں ہے۔

[1] کامل: جلد ۲، صفحہ ۶۳ (مطبوعہ دارالصادر، بیروت)

۱۶۔آیت مرج البحرین

سورہ رحمن کی آیت نمبر ۱۹ تا ۲۲ میں ارشاد الٰہی ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾

''اللہ نے دو سمندروں کو جاری کیا کہ آپس میں مل جائیں تاہم ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں آتے پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ ان سمندروں سے موتی اور مونگا نکلتے ہیں۔''

ان آیات کی تفسیر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تفسیر نمونہ میں اس بارے میں ہم نے بہت ساری ابحاث کی ہیں۔ کبھی اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ دو سمندروں سے مراد میٹھے اور نمکین پانی کے دو سمندر ہیں جو کہ بہت سے علاقوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن آپس میں مخلوط نہیں ہوتے اور یہ منظر ہر اس جگہ پر دیکھا جا سکتا ہے جہاں میٹھے پانی کے دریا سمندر میں گرتے ہیں۔

ان دو سمندروں کے لیے ایک اور دلچسپ تفسیر بیان کی گئی ہے۔ یعنی گلف اسٹریم اور سمندری دریا۔ جو کہ عالمی سمندروں میں جاری و ساری ہیں۔ یہ استوائی علاقوں کے گرم پانی کو قطبی علاقوں کے طرف لے جاتے ہیں ان کا رنگ اردگرد کے پانی سے مختلف ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان کا عرض ایک سو پچاس کلومیٹر اور گہرائی چند سو کلومیٹر تک ہوتی ہے کبھی کبھار ان کی رفتار ایک دن میں ۱۶۰ کلومیٹر تک پہنچ جاتی ہے ان کا اردگرد کے پانیوں سے ۱۰/ ۱۵ درجے تک درجہ حرارت کا فرق ہوتا ہے۔

گرم پانیوں کا یہ بہاؤ گرم ہواؤں کو جنم دیتا ہے اور اپنی حرارت اردگرد میں تقسیم کرتا ہے اور اس کے راستے میں آنے والے زمین کے شمالی ممالک کی آب و ہوا کو قابل برداشت بنا دیتا ہے اگر سمندری دریاؤں کا یہ بہاؤ اور سلسلہ نہ ہوتا تو قطب شمالی کے نزدیک ان ممالک میں زندگی گزارنا ناقابل برداشت یا انتہائی سخت ہوتا۔ البتہ ''گلف اسٹریم'' ان میں ایک سمندری دریا اور بہاؤ کا نام ہے، اور دیگر پانچ براعظموں کے سمندروں میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اس بہاؤ کا اصلی سبب خط استوائی پر موجود علاقوں کا قطبی علاقوں کے درمیان درجہ حرارت کا فرق ہے۔

مذکورہ آیات کی تفسیر اور مذکورہ موضوع کے بارے میں مزید تفصیل جاننے کے لیے تفسیر نمونہ رجلد ۲۳ اور صفحہ ۱۳۱ کا مطالعہ کریں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے اس لیے کبھی اس کی تفسیر مادی چیزوں سے کی جاتی ہے اور کبھی معنوی تفسیر کی جاتی ہے۔ اسلامی روایات میں ان دو بحروں کی معنوی تفسیر علیؑ اور فاطمہ زہراؑ اور لوءلوء و مرجان کی معنوی تفسیر حسنؑ اور حسینؑ سے کی گئی ہے۔

شواہدالتنزیل میں جناب سلمان فارسی سے "مَرَجَ البحرین یلتقیان" کی تفسیر کے متعلق یوں نقل ہوا ہے: اس سے مراد علیؑ اور فاطمہ زہراؑ ہیں۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللّؤلُؤُ وَالمَرْجان" سے مقصود حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔[۱] یہی بات ابن عباس اور ضحاک سے ایک اور سند سے بھی بیان ہوئی ہے۔[۲]

ایک اور حدیث میں سعید بن جبیرہ کے ذریعے ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ "مَرَجَ البَحْرَیْنِ یلتقیان" سے مراد علیؑ اور فاطمہ زہراؑ ہیں اور "بینهما برزخ لایبغیان، حُبٌّ دائِمٌ لایَنْقَطِعُ وَ لایَنْفَدُ" سے مراد ایسی دائمی محبت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی ٹوٹتی ہے۔ اور "یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤلُؤُ وَ الْمَرْجَان" سے مقصود حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔[۳]

ابن عباس سے منقول ایک دوسری حدیث میں "بَیْنَهُمَا برزخ لایبغیان" کے بارے میں بڑے واضح الفاظ آئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ وُدًّلا یتبا غضانِ۔ یعنی ان دو ہستیوں کے درمیان ایسی محبت ہے جو ہر قسم کے بغض و کینہ کو دور کر دیتی ہے۔[۴]

"الدر المنثور" جو کہ روائی تفسیر ہے اس میں جلال الدین سیوطی نے اس آیت کی ظاہری تفسیر کے بارے میں روایات نقل کرنے کے بعد مذکورہ بالا احادیث کے مفہوم کو ابن عباس کے ذریعے آنحضرتؐ سے بیان کیا ہے۔ وہ نقل کرتے ہیں کہ ابن مردویہ نے ابن عباس سے آیت مَرَجَ البَحْرَیْنِ یلتقیان کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے مراد علیؑ اور فاطمہ زہراؑ ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُؤلُؤُ وَ المَرْجان" سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔[۵] انہوں نے اسی مطلب کو انس بن مالک سے بھی بیان کیا ہے۔[۶]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ نامور مفسر آلوسی نے تفسیر "روح المعانی" میں مذکورہ بالا روایت کو ابن عباس اور انس بن مالک سے اور اسی طرح طبرسی کی سند سلمان فارسی، سعید بن جبیر اور سفیان ثوری سے نقل کرنے کے بعد یوں لکھا ہے: جو میں سوچتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر یہ روایات صحیح بھی ہوں تو ان کا تفسیر سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ بہت ساری آیات کے بارے میں صوفیوں کی تاویلات کی طرح ایک تاویل ہے البتہ میرے نزدیک علی اور فاطمہ (رضی اللہ عنہما) علم و فضل کے اعتبار سے دنیا کے ہر بڑے سمندر سے بڑے ہیں اسی طرح حسین (رضی اللہ عنہما) میں سے ہر ایک لوءلوء مرجان سے کئی گنا زیادہ خوبصورت، زیبا اور دلکش ہیں۔[۷]

---

[۱] شواہدالتنزیل جلد ۲، صفحہ ۲۰۹ (حدیث ۹۱۹)

[۲] ایضا صفحہ ۲۰۸

[۳] ایضا صفحہ ۲۱۰

[۴] ایضا صفحہ ۲۳۰

[۵] الدر المنثور جلد ۶، صفحہ ۱۴۳

[۶] ایضا صفحہ ۱۴۳

[۷] روح المعانی، جلد ۲۷، صفحہ ۹۳ (مذکورہ)

ان عظیم ہستیوں کے مقام و مرتبے کے بارے میں ان کا سچا اعتراف قابل تحسین ہے۔اس شرط کے ساتھ کہ مقصد مذکورہ بالا روایات کی اہمیت اور قدر و قیمت کم کرنا نہ ہو۔شاید آلوسی بھول گئے ہیں کہ یہ حدیث متعدد طرق سے رسالتمآبؐ سے نقل ہوئی ہے اور آنحضرتؐ کو آیات کی تاویل بیان کرنے کا پورا اختیار اور حق حاصل ہے۔اس کا صوفیوں کے منحرف افکار اور بے بنیاد تاویلوں کے ساتھ موازنہ کرنا سراسر ظلم اور ناانصافی ہے اور ایک عالم سے ایسی بات بعید ہے۔

بہر حال یہ آیت بھی دیگر آیات کی طرح علیؑ ان کی زوجہ اور ان کے بیٹوں حسنؑ اور حسینؑ کی غیر معمولی فضیلت اور عظیم مقام و منزلت پر دلالت کرتی ہے۔کیونکہ اس آیت میں علیؑ اور فاطمہؑ کو دو عظیم سمندروں سے تشبیہ دی گئی یہ ایسے بحر عظیم جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کی نشانی، برکات کا سر چشمہ، علوم و حکمت کا منبع، کریمانہ اخلاق کا واضح نمونہ، پیکر جود و سخا اور عصمت و طہارت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔آیت ان کے فرزندوں کو ایسے قیمتی اور بے مثل جواہر سے تشبیہ دے رہی ہے جو سمندر کی تہہ میں پروان چڑھے ہیں اور پھر باہر آئے ہیں، حسن و زیبائی، ظاہری اور باطنی جمال، علم و تقویٰ، فضیلت، عصمت و طہارت غرضیکہ ہر خوبی ان میں موجود ہے۔

اسلام میں یہ تمام فضائل اور کمالات کس شخص میں پائے جاتے ہیں، اور رسول خداؐ کی جانشینی کے لیے علیؑ اور ان کے بیٹوں سے زیادہ کون حقدار اور لائق ہے۔اور کتنی سادگی اور آسانی کے ساتھ ان تمام فضائل کو لوگ نظر انداز کر گئے۔

۱۷۔آیت نجویٰ

سورہ مجادلہ کی آیت ۱۲ اور ۱۳ میں ارشاد رب العزت ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَاجَيۡتُمُ الرَّسُوۡلَ فَقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىۡ نَجۡوٰىكُمۡ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ وَاَطۡهَرُ ؕ فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشۡفَقۡتُمۡ اَنۡ تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىۡ نَجۡوٰىكُمۡ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذۡ لَمۡ تَفۡعَلُوۡا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمۡ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳﴾

کیا تم سرگوشیوں سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے (کہ غریب ہو جاؤ گے) اب جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے تو تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیا کرو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔

ان دو آیات میں موجودہ قرائن اور اسی طرح جو شان نزول ان کے بڑے بڑے مفسرین نے نقل کیے ہیں جیسے طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں، قرطبی نے تفسیر الجامع الاحکام القرآن میں، آلوسی نے روح المعانی میں، اور دیگر علماء، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض مسلمان (بعض مفسرین کے بقول بعض مالدار اور دولتمند افراد) لوگوں کے درمیان اپنی اہمیت جتانے اور بڑھانے کے لیے ہر چھوٹی بڑی بات کو آنحضرتؐ کے ساتھ سرگوشی اور رازداری کے انداز میں کرتے تھے۔ اس حقیقت سے بالکل بے خبر کہ رسول اللہ کا وقت اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس طرح کی معمولی اور فضول مسائل میں ضائع ہو اور صرف ایک شخص اس سے استفادہ کرے۔ علاوہ ازیں یہ بات غریب افراد کے لیے تکلیف کا باعث بھی تھی اور مالداروں کے لیے باعث فخر بھی تھی اور بعض اوقات سوء ظن کا موجب بن جاتی تھی۔

مندرجہ بالا دو آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اگر تم پیغمبر اکرمؐ سے سرگوشی کرنا چاہتے ہو تو پہلے اللہ کی راہ میں صدقہ دو پھر آپؐ سے رازداری سے گفتگو کرو۔ یہ حکم ان کے لیے دلچسپ آزمائش ثابت ہوا اور پیغمبر اکرمؐ سے قربت اور نزدیکی کے دعویداروں کے لیے کسوٹی اور پیمانہ آزمائش بن گیا۔ ایک شخص کے علاوہ باقی تمام افراد نے صدقہ دینے اور سرگوشی کرنے سے احتراز کیا۔ اور وہ ایک علی ابن ابی طالبؑ کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔

یہاں پر جس چیز کا واضح ہونا ضروری تھا وہ روشن ہو گئی، جو چیز مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے تھی اور اس سے نصیحت پکڑنا تھی وہ بھی واضح ہو گئی یوں مسلمانوں نے ایک ضروری سبق سیکھ لیا۔ کچھ عرصے بعد دوسری آیت نازل ہوئی اور اس نے اس حکم کو ختم کر دیا اور اس سے معلوم ہوا کہ بعض دلوں میں حضور اکرمؐ سے سرگوشی کرنے سے زیادہ مال کی محبت موجود ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زیادہ تر یہ سرگوشیاں غیر ضروری مسائل کے متعلق تھیں اور معاشرتی طور پر مقام و حیثیت کو حاصل کرنے کے لیے تھیں۔

یہاں پر متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت پر صرف اور صرف علی ابن ابی طالبؑ نے عمل کیا ہے۔شواہد التنزیل میں مجاہد کے ذریعے علی علیہ السلام سے یوں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

اِنَّ فِی الْقُرآنِ لآیَةً ما عَمِلَ بِهاَ اَحَدٌ قَبْلِی و لا بَعْدِی و هیَ آیَةُ النّجویٰ قَالَ کَانَ لِی دِیْنارٌ فَبِعْتُهُ بِعَشَرَةِ دَراهِمَ فَکُلَّماَ اَرَدْتُ اَنْ اُناجِیَ النَّبِی(ص) تَصَدَّقْتُ بِدَرْهَمٍ مِّنْهُ ثُمَّ نُسِخَتْ۔

ترجمہ: قرآن مجید میں ایک آیت ایسی ہے کہ نہ کسی نے مجھ سے پہلے اس پر عمل کیا اور نہ میرے بعد کسی نے عمل کیا اور نہ کرے گا اور وہ آیت نجویٰ ہے۔میرے پاس ایک دینار تھا میں نے اس کے بدلے میں دس درہم حاصل کیے جب بھی میں پیغمبر اکرمؐ سے سرگوشی کرنا چاہتا تھا ایک درہم صدقہ دیتا تھا۔پھر یہ آیت منسوخ ہوگئی۔[1]

ایک اور روایت میں ابو یوب انصاری سے نقل ہوا ہے کہ یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور علیؑ نے دس مرتبہ رسول خداؐ سے سرگوشی کی اور ہر دفعہ ایک دینار صدقہ دیا۔[2] مذکورہ کتاب میں ہی ایک اور حدیث مجاہد سے بیان ہوئی ہے کہ قرآن میں ایک آیت ہے اس پر علیؑ کے علاوہ کسی نے عمل نہیں کیا ہے یہاں تک کہ وہ آیت منسوخ ہوگئی۔اور وہ آیت ''یاایها الذین امنو اذا ناجیتم الرسول... ہے۔انہوں نے رسول خداؐ کے ساتھ سرگوشی کی اور ایک دینار بطور صدقہ دیا۔[3] مذکورہ کتاب میں اس کے متعلق متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جن کی تعداد دس سے زیادہ ہے۔

نیز جلال الدین سیوطی اپنی روائی تفسیر الدر المنثور میں اس روایت کو متعدد (سات سے زیادہ) اسناد سے بیان کرتے ہیں، خصوصاً اس نے حاکم نیشاپوری سے ان کے اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ حدیث صحیح ہے،علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت ایسی ہے جس پر کسی نے مجھ سے پہلے نہ میرے بعد عمل کیا ہے اور نہ کرے گا۔اس کے بعد حدیث کے مضمون کو اسی طرح بیان کیا ہے۔جس طرح شواہد التنزیل سے ہم نے ذکر کیا ہے۔[4]

اسی کتاب میں مذکور ہے کہ بہت سے راویان حدیث نے علیؑ سے روایت کی ہے کہ (رسول خداؐ نے اس صدقہ کی مقدار کو مقرر کرنے میں علیؑ سے مشورہ کیا) آنحضرتؐ نے فرمایا: دینار کیسا رہے گا؟ انہوں نے عرض کیا: لوگوں میں اس کی طاقت نہیں۔آپؐ نے فرمایا:

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲،صفحہ ۲۳۱،حدیث ۹۵۱

[2] ایضا،صفحہ ۲۴۰ حدیث ۹۴۶

[3] ایضا،صفحہ ۲۴۰ حدیث ۹۴۶

[4] الدر المنثور جلد ۶ صفحہ ۱۸۵

آدھا دینار کیسا ہے؟ عرض کیا: لوگ اس کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ پھر فرمایا: پس کتنی مقدار مناسب ہوگی۔ انہوں نے عرض کیا: "شَعِيرَة" (ایک جو وزن کے برابر سونا) پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "اَنَّكَ لَزَهِيدٌ" یعنی: یعنی آپ نے کم مقدار بتائی ہے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آیت: ءَاَشْفَقْتُمْ ... نازل ہوئی اور اس نے سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا۔ علیؑ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے سے اس امت کو رعایت دی اور ان کے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔[1]

یہاں پر قابل توجہ حدیث ہے جسے برسوئی نے تفسیر روح البیان میں عبداللہ بن عمر بن خطاب سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا ہے: كَانَ لِعَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ ثَلَاثٌ لَو كَانَتْ لِي وَاحِدَةٌ مِنْهُنَّ كَانَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ تَزْوِيجُهُ فَاطِمَةَ (سلام الله عليها) وَ اِعْطَاؤُهُ الرَّايَةَ يَوْمَ خَيْبَرٍ وَ آيَةُ النَّجْوىٰ. یعنی: علی علیہ السلام کے پاس تین فضیلتیں ایسی ہیں اگر ان میں ایک بھی میرے پاس ہوتی تو سرخ بالوں والے کئی اونٹوں سے بہتر ہوتی (عربوں کے درمیان یہ الفاظ اور محاورہ بہت زیادہ قیمتی اور گرانبہا چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور قیمتی اشیاء کے بیان کرتے وقت بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے) پہلی فضیلت فاطمہ زہراؑ سے ان کی شادی، دوسری خیبر کے دن پرچم ان کے سپرد اور تیسری آیت نجویٰ۔[2]

نیز زمخشری نے اس حدیث کو تفسیر کشاف میں ذکر کیا ہے۔[3] اسی طرح قرطبی نے تفسیر الجامع لاحکام القرآن، میں اس کو نقل کیا ہے۔[4] طبرسی نے اسے مجمع البیان میں بیان کیا ہے۔[5] درحقیقت عبداللہ بن عمر نے تین حساس مسئلوں پر انگلی رکھی ہے۔ چنانچہ فاطمہ زہراؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بقول: سيّدة نِساءِ العالَمينَ مِنَ الاوَّلِينَ وَ الآخِرِينَ (اوّل سے لے کر آخر تک تمام عالمین کی عورتوں کی سردار) کا علیؑ کے سوا کوئی کفو اور ہمسر نہ تھا علیؑ آنحضرتؐ کے بعد تاریخ انسانیت کے سرِ مین تھے۔ جنگ خیبر کے دن علیؑ کو پرچم دینا اور انہیں کرار غیر فرار کے لقب سے سرفراز کرنا ایک بے مثل فضیلت ہے خصوصاً ان حالات میں جب دوسرے افراد جنگ کے لیے گئے لیکن ناکام واپس آئے اور اس عظیم فتح کا سہرا علیؑ کے سر پر سجا۔

اور اسی طرح قرآن مجید میں ایسی آیت کا ہونا جس پر صرف علی علیہ السلام نے عمل کیا ہو، ایسا کمال ہے جس کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ عجیب ہے کہ بعض لوگ اس فضیلت کو کم کرنے پر تلے ہوئے ہیں بلکہ اس کے با فضیلت ہونے سے بھی انکار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس مقصد کے لیے معمول کے مطابق مختلف حیلوں بہانوں اور بے بنیاد اور کمزور دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔

انکا کہنا یہ ہے کہ اگر بڑے بڑے اصحاب کرام نے اس عمل کو انجام نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کام کو ضروری اور اہم نہیں

---

[1] الدر المنثور جلد ٦ صفحہ ١٨٥
[2] تفسیر روح البیان، جلد ٩، صفحہ ٤٠٦
[3] تفسیر کشاف، جلد ٤، صفحہ ٤٩٤
[4] قرطبی، جلد ٩، صفحہ ٧٢، ٦٤
[5] مجمع البیان، جلد ٩، اور ١٠، صفحہ ٢٥٢

سمجھتے تھے۔کبھی وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ان کے عمل کے لیے وقت کافی نہ تھا کیونکہ بہت جلد ہی آیت منسوخ ہوگئی اورکبھی ان کا بہانہ یہ ہوتا کہ دوسرے افراد کی سوچ یہ تھی کہ اگر وہ صدقہ اور سرگوشی کے لیے اقدام کریں تو یہ بات غریبوں کے لیے تکلیف اور امیروں کے لیے پریشانی کا باعث بنے گی،غریب لوگ اس کے انجام پر قادر نہیں ہیں اور مالدار جو صدقہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں اگر اس عمل کو انجام نہ دیں تو مورد ملامت قرار پاتے ہیں۔لہٰذا دوسروں کا عمل نہ کرنا،ان سے کسی فضیلت کے سلب ہونے کا سبب نہیں بنتا۔[۱]

لیکن لگتا یوں ہے کہ ان عذرتراشیوں اور حیلوں کو بناتے وقت ان بڑے مفسرین نے دوسری آیت کو فراموش کر دیا ہے۔چنانچہ قرآن مجید ان سابقہ سرگوشیاں کرنے والوں کی ملامت اور سرزنش کر رہا ہے جنہوں نے صدقے والے حکم کے نزول کے بعد سرگوشی کو ترک کر دیا تھا۔قرآن فرماتا ہے:ءَ اَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقٰتٍ یعنی:کیا تمہیں غریب ہونے کا خوف لاحق ہوگیا تھا کہ نجویٰ سے پہلے صدقہ دینے سے تم نے اجتناب کیا۔اس کے بعد قرآن اسے گناہ کی طرح شمار کرتے ہوئے ''وَ تَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ'' کے جملے کے ساتھ انہیں توبہ الٰہی کا مشمول قرار دیا ہے اور اس برے عمل کے ازالے کے لیے نماز قائم کرنے،زکوٰۃ ادا کرنے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا فرمان جاری کرتا ہے۔

اگر وقت تنگ اور ناکافی تھا تو پھر یہ ملامت اور سرزنش کرنے کا مقام نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لیے توبہ الٰہی کی ضرورت ہے۔اگر ان کا مقصد غریبوں کی دلجوئی اور امراء کی پریشانی کو دور کرنا تھا تو یہ اقدام تو قابل قدر اور قابل تشویق تھا پھر کیوں اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش اور ملامت کی ہے اور توبہ کی بات کی ہے۔پس اس آیت پر غور فکر کرنے سے اچھی طرح روشن ہوتا ہے کہ انکا عمل ناپسندیدہ تھا۔حقیقت یہ ہے کہ جب ایسے معاملات پیش آتے ہیں جو ان برادران کے پہلے سے طے شدہ افکار کے منافی ہوتے ہیں تو تمام باتوں کی یہاں تک کہ آیات قرآنی کو بھی بھلا دیتے ہیں جبکہ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔

یہاں پر پھر اس فضیلت کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے بعض افراد کہتے ہیں کہ آیت اور اس کے منسوخی کے درمیان صرف ایک گھنٹے کا وقفہ تھا اسی وجہ سے بڑے بڑے صحابہ اس پر عمل نہ کر سکے۔یہ بھی انہیں بھلانے والوں میں شامل میں جنہوں نے ناسخ آیت کے لحن اور لب ولہجہ پر غور نہیں کیا ہے کیونکہ ایسی آیت جو ایسے افراد کی ملامت کر رہی ہے جنہوں نے غربت اور فقر کے ڈر سے صدقہ نہیں دیا اور سرگوشی سے چشم پوشی کر لی ہے۔اور اب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمایا ہے۔اگر ان دو آیتوں کے درمیان وقفہ صرف ایک گھنٹے کا ہوتا تو اس قسم کی باتوں کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی بنابرایں مناسب یہی لگتا ہے کہ وہ روایت صحیح ہے جو کہہ رہی ہے کہ ان دو آیتوں کے درمیان دس دن کا فاصلہ تھا۔[۲]

---

[۱] کبیر فخر رازی،جلد ۲۹،صفحہ ۲۷۲ اور تفسیر روح المعانی،جلد ۲۸،ص ۲۸

[۲] تفسیر روح المعانی میں یہ قول مقاتل سے نقل ہوا ہے جو منصور دوانیقی کا ہم عصر اور تابعین کا شاگرد ہے۔

سوال

یہاں پر صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے یہ کام کس طرح فضیلت شمار ہوتا ہے؟ کیا ایسا ہے جیسا کہ بعض متعصب مفسرین نے کہا ہے کہا اس عمل کو انجام دینا نہ کوئی فضیلت تھی اور نہ ہی انجام نہ دینا کوئی نقص یا کمی تھی یا یہ پھر بات درست ہے جیسا کہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ علی علیہ السلام اسے اپنے لیے بہت بڑا افتخار سمجھتے تھے اور عبداللہ بن عمر نے اس کو فاطمہ زہراؑ سے شادی اور فتح خیبر کے برابر تصور کیا ہے؟

جواب

اس سوال کا جواب گذشتہ باتوں سے واضح ہو چکا ہے۔ یہاں پر ہم صرف ایک بات کا اضافہ کریں گے اور وہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا بہترین طریقہ خود قرآن کی طرف رجوع کرنا اور آیت ناسخ (دوسری آیت) میں غور وفکر کرنا ہے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس حکم کے ذریعے مسلمانوں کا امتحان لینا چاہتا تھا کہ وہ پیغمبر اسلام سے نجوی (سرگوشی) کے لیے کوئی چیز خرچ کرنے کے لیے اور راہ خدا میں صدقہ دینے کے لیے تیار ہیں؟ نجوی جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہوتا تھا۔ یہاں پر صرف ایک شخص امتحان الٰہی میں کامیاب ہوا اور وہ علی بن ابی طالبؑ تھے کیا یہ بڑے فخر کی بات نہیں ہے؟ دوسرے الفاظ میں آیت میں موجود ملامت وسرزنش اور توبہ دیگر افراد کے شامل حال ہوئی اس ملامت، سرزنش اور توبہ سے صرف ایک شخص علیؑ مستثنیٰ ہوئے۔ نہیں معلوم کیوں بعض علماء روز روشن کی طرح ظاہر حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ شاید آپ بتا سکیں اس کی وجہ کیا ہے؟

۱۸۔آیت سابقون

سورہ واقعہ کی آیات نمبر ۱۰ تا ۱۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۱۱ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۱۲ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۳ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝۱۴

اور سبقت لے جانے والے تو آگے بڑھنے والے ہی ہیں۔ یہی وہ مقرب لوگ ہیں نعمتوں سے مالا مال جنتوں میں ہوں گے ایک جماعت سابقہ امتوں میں سے ہے اور تھوڑے لوگ آخری امت میں سے ہوں گے۔

شواہد التنزیل میں حاکم حسکانی نے ابن عباس سے یوں نقل کیا ہے:

السُّبَاقُ ثلاثه، سَبَقَ يُوشَعُ بْنُ نَونٍ اِلٰى مُوسٰى، و سَبَقَ صاحِبُ يٰاسِين اِلٰى عِيْسٰى وَ سَبَقَ عَلِيٌّ اِلٰى النَّبِيِّ۔

(ایمان میں) سبقت لے جانے والے تین ہیں: یوشع نے موسیٰؑ پر ایمان لانے میں سبقت کی صاحب یاسین (حبیب نجار) نے عیسیٰؑ کے متعلق اور علیؑ نے رسول خداؐ کے متعلق (ایمان لانے میں) سبقت دکھائی۔[1]

مذکورہ کتاب میں ابن عباس ہی سے بیان ہوا ہے کہ میں نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آنحضرتؐ سے پوچھا: آپؐ نے فرمایا: حَدَّثنی جَبْرَئِیلُ بِتَفْسِیرِها، قال ذاكَ عَلِیٌّ وَ شِیعتُهُ اِلَی الجَنَّةِ۔ یعنی: اس آیت کی تفسیر جبرئیل نے مجھے بیان کی ہے اور کہا ہے کہ یہ علیؑ اور ان کے شیعوں کی طرف اشارہ ہے جو جنت میں جانے میں سبقت لینے والے ہیں۔[2] ان دو تعبیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ علیؑ پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے میں بھی سبقت لینے والے اور بہشت جانے میں بھی آگے آگے ہوں گے۔ درحقیقت ان دو چیزوں میں گہرا اور نہ ٹوٹنے والا تعلق ہے۔ اسی کتاب میں اس بارے میں چند اور حدیثیں بھی ذکر ہوئی ہیں۔

تفسیر الدرالمنثور میں بھی دو روایتیں ابن عباس سے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ، ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ یوشع بن نون جو (سب سے پہلے) حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور مومن آل یٰسین

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۱۳، حدیث ۹۲۳

[2] ایضا، جلد ۲، ۵۱۲، ۶۱۲، حدیث ۷۲۹

(سب سے پہلے) حضرت عیسیٰؑ پر اور علیؑ بن ابی طالبؑ سب سے پہلے رسول خداؐ پر ایمان لائے۔[1] اسی کتاب میں اس مضمون پر مشتمل اور حدیث بھی بیان ہوئی ہے۔[2]

ان کے علاوہ جن افراد نے اس روایت کو نقل کیا ہے ان میں سے ابن مغازلی (ابن بطریق کے نقل کے مطابق) نے کتاب "العمدہ" میں، سبط بن جوزی نے تذکرہ میں، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں، ابن حجر نے صواعق میں، علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں اور شیخ سلیمان قندوزی نے ینابیع المودۃ میں، قابل ذکر نام ہیں۔[3]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قاضی روزبھان جو کہ امامت وخلافت کے مسائل میں خاص تعصب رکھتے ہیں اور ان کی کتاب ''ابطال نہج الحق'' اس مطلب پر گواہ ہے۔ (علامہ حلّی اپنی کتاب میں اہل سنت کے ذرائع سے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں: سابِقُ هٰذِهِ الاُمَّةِ عَلِیّ بن ابی طالِبٍ۔ یعنی: (اس امت میں سابق الایمان علی بن ابی طالبؑ ہیں) جب وہ اس آیت کے بارے میں علامہ حلّیؒ کا جواب دینے لگتے ہیں تو وہ اپنی کتاب ''ابطال نہج الحق'' میں یوں لکھتے ہیں: یہ حدیث اہل سنت کی روایات میں آئی ہے لیکن ان الفاظ کے ساتھ: سُبَّاقُ الاُمَّةِ ثلاثةٌ: مُومِنُ آلِ فِرْعُونَ وَ حَبِیبُ النَّجّارِ وَ عَلِیُّ بن ابی طالبٍ۔ یعنی: امت کے سبقت لینے والے تین ہیں: ''ایک مؤمن آل فرعون، دوسرے حبیب نجار اور تیسرے علی ابن ابی طالب۔'' وہ مزید لکھتے ہیں: اسمیں کوئی شک نہیں کہ علیؑ اسلام میں پہل کرنے والے ہیں اور ان کے کارنامے اور فضائل بے شمار ہیں لیکن یہ چیزیں انکی (بلافصل) امامت کی نص پر دلیل نہیں بن سکتیں۔[4]

یہ بات پیش نظر رہے کہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ صرف اور صرف یہ احادیث علی بن ابی طالبؑ کی بلافصل امامت پر نص ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب ان آیات اور روایات کو ایک ساتھ ملا کر دیکھیں گے تو یہ مطلب سامنے آتا ہے کہ علی بن ابی طالبؑ، امت اسلامی کے اعلیٰ ترین اور اہم ترین فرد ہوتے ہوئے اس مقام ومنصب کے قابل ٹھہرئے ہیں اور اس میدان میں کوئی بھی ان کا ثانی اور برابری کرنے والا نہیں ہے۔ کیا ان تمام ناقابل انکار فضائل کے ہوتے ہوئے دوسروں کو ان پر مقدم کرنا جائز ہے اور کیا انکی موجودگی میں کسی دوسرے کو ترجیح دینا مناسب ہے؟ اس گفتگو کو دس نکات ذکر کر کے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

۱۔ ''قلیل من الاخرین'' سے مراد کون؟

گزشتہ آیات کے تسلسل میں قرآن سابقون کے بلند واعلیٰ مقام ومنزلت کرنے کہ وہ دربار الٰہی کے مقربان ہیں اور ان کا ٹھکانہ نعمتوں سے مالا مال جنت ہے کو بیان کرنے کے بعد مزید فرماتا ہے: ثُلَّةٌ مِنَ الاوَّلِینَ وَقلیل مِنَ الاخِرِینَ (واقعہ ۱۳ اور ۱۴)

---

[1] الدر المنثور جلد ۶، صفحہ ۱۵۴

[2] ایضا

[3] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۱۱۴ تا ۱۲۰۔

[4] اس کی عبارت کو احقاق الحق نے بعینہ تیسری جلد کے صفحہ ۱۲ پر نقل کیا ہے۔

یعنی: ایک جماعت گزشتہ امتوں میں سے ہے اور بہت کم آخری زمانے (اسلامی امت) میں سے ہیں۔ حاکم حسکانی شواہد التنزیل میں کئی احادیث محمد بن فرات، محمد بن سھل اور علی بن عباس کے ذریعے جعفر بن محمد سے نقل کرتے ہیں کہ ''قلیلٌ مِنَ الا خرین'' سے مراد علی بن ابی طالبؑ ہیں۔[1]

اس آیت کا بدیہی مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس امت کے جنتی صرف وہی ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان میں سبقت لینا ایک اعلیٰ وارفع مقام ہے جو بہشت میں اور جوار الٰہی میں بھی بلند ترین مقام کا تقاضا کرتا ہے ان میں خصوصی فرد (پیغمبر اسلام کے بعد) علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ اسی دلیل کی بنا پر اس سورت کی بعد والی آیات میں جنتیوں کی ایک اور جماعت (اصحاب الیمین) کے مقامات اور نعمات کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: ثُلَّةٌ مِنَ الاوّلِیْنَ و ثُلَّةٌ مِنَ الاخِرِیْن یعنی: ایک جماعت سابقہ امتوں میں سے اور ایک جماعت آخری (امت محمدیؐ) میں سے ہے۔ واضح سی بات ہے کہ اصحاب یمین اگر چہ بہشتی ہیں لیکن سابقین جو کہ مقربین ہیں کے درجے تک نہیں پہنچتے۔

۲۔ پہلا مسلمان کون تھا؟

اہم بحث یہ ہے کہ ''اَوَّلُ مَنْ آمَنَ'' (سب سے پہلے رسول اللہؐ پر ایمان لانے والا اور آپؐ کے دست مبارک پر بیت کرنے والا) کون تھا؟ ساری اسلامی امت اس بات پر متفق ہے کہ عورتوں میں سے حضرت خدیجہ (س) پہلی شخصیت ہیں جو آنحضرتؐ پر ایمان لائیں مردوں میں سے کس نے پہل کی، اگر چہ بہت سے افراد اس مسئلے کو پیچیدہ اور قابل بحث بنانے پر زور دیتے ہیں، لیکن احادیث اور تاریخ کے مطالعے سے مجموعی طور پر ایک غیر جانبدار شخص کے لیے کوئی شک وشبہہ باقی نہیں رہ جاتا کہ مردوں میں سب سے اولین شخص علی بن ابی طالبؑ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی، سب سے پہلے آنحضرتؐ کی بیعت کی سب سے پہلے آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی اور رکوع وسجود بجالائے۔

اس موضوع پر تمام اسلامی ماخذ اور منابع میں شواہد ودلائل موجود ہیں، یہاں پر ہم ان میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کم از کم اٹھارہ صحابہ نے مختلف طرق سے اس حدیث کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ علیؑ سب سے پہلے مرد تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی:

۱۔ ابوسعید خدری جن کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ علیؑ کی پیٹھ پر مارا اور فرمایا: یا عَلِیُّ لكَ سَبْعُ خِصالٍ لایُحاجُّكَ فِیْهِنَّ اَحَدٌ یَوْمَ القیامةِ اَنْتَ اَوَّلُ المُؤمِنِینَ اِیماناً بِاللهِ... یعنی: اے علیؑ! تیرے لیے سات ایسی خصوصیات ہیں قیامت کے دن تیرے ساتھ کوئی بھی ان میں سے کسی کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا، ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ تم

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۲۱۸ (احادیث ۹۳۲ تا ۹۳۵)

نے سب سے پہلے اللہ پر ایمان لایا ہے (اور اسلام کو قبول کیا ہے)[1]

۲۔حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ کی بیٹی فاطمہؑ نے اس حدیث کو مجھ سے بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: زَوَّجْتُكَ اَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ عِلْمًا وَ اَقْدَمَهُمْ سِلْمًا وَ اَفْضَلَهُمْ حِلْماً یعنی: میں نے تمہاری شادی ایسے مرد سے کی ہے جوعلم میں تمام مومنین سے زیادہ عالم ہے، اسلام لانے میں ان سب سے پہلا ہے اور حلم میں ان سب سے زیادہ حلیم ہے۔[2]

۳۔ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ میں نے عمر بن خطاب کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ علیؑ کو بُرے الفاظ سے یاد مت کرو کیونکہ میں نے رسولخدا ﷺ سے ایسی باتیں سنی ہے اگر ان میں ایک بھی خطاب کے خاندان میں ہوتی تو میرے لیے ان تمام چیزوں سے زیادہ پسندیدہ ہوتی جن پر سورج طلوع ہوتا ہے، میں ابوبکر، ابوعبیدہ اور چند دیگر اصحاب رسول ﷺ کے ساتھ حضرت ام سلمہ کے دروازے پر پہنچے، علیؑ دروازے پر کھڑے تھے، ہم نے کہا رسول خدا ﷺ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا آپ تھوڑی دیر میں باہر تشریف لائیں گے۔اتنے میں آنحضرتؐ باہر تشریف لائے ہم ان کی جانب آگے بڑھے۔

آنحضرتؐ نے علی بن ابی طالبؑ کا سہارا لیا اور اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر مارا اور فرمایا:

اِنَّكَ مُخاصَمٌ اَنْتَ اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ايماناً وَ اَعْلَمُهُمْ بِاَيّامِ اللهِ وَ اَوْفاهُمْ بِعَهْدِهِ وَ اَقْسَمُهُمْ بِالسَّوِيَّةِ وَ اَرافُهُمْ بِالرَّعِيَّةِ وَ اَعْظَمُهُمُ الرَّزِيَّةِ۔[3]

''تجھ سے جھگڑا کیا جائے گا (جبکہ تیری شان یہ ہے کہ) تم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہو، ایام اللہ کے بارے میں سب سے زیادہ عالم ہو، اللہ کے عہد کی سب سے زیادہ پاسداری کرنے والے ہو، سب سے بڑھ کر عادلانہ تقسیم کرنے والے ہو، رعایا کے ساتھ سب سے زیادہ مہربان ہو اور تیری مصیبت بھی سب سے بڑی مصیبت ہے۔''

یہ حدیث بہت ساری باتوں کو کھول رہی ہے جن کی تفصیل بیان کرنا اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہے۔

۴۔معاذ بن جبل نبی اکرمؐ سے بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے علیؑ سے فرمایا:

تَخْصِمُ النَّاسَ بِسَبْعٍ وَ لاَ يُحاجُّكَ فِيْهِ اَحَدٌ مِنْ قُرَيْشٍ اَنْتَ اَوَّلُهُمْ اِيْمَاناً بِاللهِ..

ترجمہ: آپ سے لوگوں سات چیزوں میں جھگڑیں گے اور ان میں قریش میں سے کوئی بھی تیرے خلاف دلیل پیش نہیں کر سکے گا (تیرا مقابلہ نہیں کر سکے گا) آپ ہی وہ پہلے فرد ہیں جو اللہ پر ایمان لائے

[1] اس حدیث کو ابونعیم اصفہانی نے ''حلیۃ الاولیاء'' جلد۱، صفحہ ۶۶ پر درج کیا ہے۔
[2] اس حدیث کو ابن عساکر نے ''تاریخ دمشق'' میں حضرت علیؑ کے حالات زندگی میں ذکر کیا ہے (جلد۱، صفحہ ۲۴۴، مطبوعہ بیروت)
[3] کنز العمال جلد ۱۳، صفحہ ۱۱۷ (مطبوعہ بیروت موسسہ الرسالۃ)

ہیں۔۔۔۔[1]

۵۔جعفر بن ابی طالب کی زوجہ اسماء بنت عمیس بیان کرتی ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے اپنی بیٹی فاطمہؑ سے فرمایا:

زَوَّجْتُكِ اَقْدَمَهُمْ سِلْماً وَ اَعْظَمُهُمْ حِلْماً وَ اَكْثَرُهُمْ عِلْماً۔

میں نے تیری شادی ایسے شخص سے کی ہے جو اسلام لانے میں سب سے پہلے، حلم کے لحاظ سے سب سے بڑا اور علم کے اعتبار سے ان سب سے زیادہ عالم ہے۔[2]

٦۔سلمان فارسی کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

اَوَّلُكُمْ وُرُوْدًا عَلَىَّ الحَوْضَ اَوَّلُكُمْ اِسْلاماً عَلِيُّ بْنُ ابی طالب علیہ السلام۔

تم میں سے سب سے پہلے حوض کوثر پر وہی مجھ سے ملاقات کرے گا جو سب سے پہلے اسلام لایا ہے یعنی علی بن ابی طالبؑ۔[3]

۷۔ابوسخیلہ کہتے ہیں کہ میں اور سلمان حج بجالانے کے بعد ابوذر کے پاس آئے جب تک اللہ نے چاہا ہم ان کے پاس رہے جب ہمارے کوچ کا وقت قریب آیا تو میں نے کہا اے ابوذر! میں چند امور کو لوگوں کے درمیان واقع ہوتا دیکھ رہا ہوں مجھے ڈر ہے کہ کہیں لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا نہ ہو جائے اگر ایسا ہو جائے تو آپ مجھے کیا حکم دیں گے؟ اس نے کہا:

اَلْزِمْ كِتابَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَ عَلِيَّ بْنَ اَبی طالِبٍ۔ فَاَشْهَدُ اِنّی سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ يَقُوْلُ: عَلِيٌّ اَوَّلُ مَنْ آمَنَ بی وَ اَوَّلُ مَنْ يُصافِحُنِی يَوْمَ القِيامَةِ وَ هُوَ الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ، وَ هُوَ الفارُوقُ يُفَرِّقُ بَيْنَ الحَقِّ و الباطِلِ۔

اللہ کی کتاب اور علی بن ابی طالبؑ سے جدا نہ ہونا، میں گواہی دیتا ہوں کہ میں رسول خداؐ سے سنا کہ وہ فرمایا کرتے تھے علیؑ پہلے شخص ہیں جو مجھ پر ایمان لایا، قیامت کے دن علیؑ سب سے پہلے مجھ سے مصافحہ کریں گے۔علیؑ صدیق اکبر اور فاروق یعنی حق کو باطل سے جدا کرنے والا ہے۔[4]

---

[1] اس حدیث کو شہاب الدین شافعی نے کتاب توضیح الدلائل، صفحہ ۱۷۱ پر درج کیا ہے۔ (بمطابق، احقاق الحق، جلد ۲۰ صفحہ ۴۵۵)

[2] تاریخ ابن عساکر، جلد ۱، صفحہ ۲۴۵۔ مطبوعہ بیروت۔

[3] اس روایت کو محمد بن ابی بکر نے اپنی کتاب ''الجوہرہ''، صفحہ ۸ (مطبوعہ دمشق پر درج کیا ہے۔ کنزالعمال کے مصنف نے بھ سند کے بغیر اسے ذکر کیا ہے (جلد ۱۱، صفحہ ٦١٦، مطبوعہ موسئسہ الرسالۃ۔ بیروت)

[4] مختصر تاریخ دمشق، جلد ۱۷، صفحہ ۳۰٦ (مطبوعہ دمشق دارالفکر) (بمطابق احقاق الحق، جلد ۲۰ صفحہ ۴۷۲) اس حدیث کو کنزالعمال نے اِنّ ھذا اوّل من آمن بی تا آخر ذکر کیا ہے۔ جلد ۱۱، صفحہ ٦١٦، حدیث ۳۲۹۹۰۔

۸۔عبدالرحمن عوف آیت السّابقون الاوّلون کے بارے میں حدیث بیان کرتے ہیں کہ یہ قریش کے دس افراد تھے:

کَانَ اَوَّلَهُمْ اِسْلاماً عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبِ

جن افراد نے اوائل میں اسلام قبول کیا ان میں علی بن ابی طالب پہلے نمبر پر ہیں۔[۱]

۹۔جمال الدین ابوالحجاج اپنی کتاب ''تہذیب الکمال'' میں ابورافع (صحابی رسولؐ) سے نقل کرتے ہیں کہ:

اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ الرِّجَالِ عَلِيٌّ۔

مردوں میں سب سے پہلے علیؑ اسلام لائے۔[۲]

۱۰۔رسول خداؐ کے خادم انس بن مالک، آنحضرتؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

اَوَّلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وُرُوداً عَلَيَّ الْحَوْضَ اَوَّلُهَا اِسْلاماً عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبٍ۔

اس امت میں سب سے پہلے جو شخص حوض کوثر پر مجھ تک پہنچیں گے وہ وہی ہوں گے جو سب سے پہلے اسلام لائے ہیں یعنی علی ابن ابی طالبؑ۔[۳]

۱۱۔ابن عباس کہتے ہیں: علی علیہ السلام کی چار خصوصیات ایسی ہیں جو کسی میں نہیں پائی جاتیں:

هُوَ اَوَّلُ عَرَبِيٍّ وَعَجَمِيٍّ صَلّٰى مَعَ رَسُولِ اللهِ ....

عرب وعجم میں سے وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔[۴]

ایک اور مقام پر وہ کہتے ہیں کہ:

اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ بَعْدَ خَدِيْجَةَ عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبٍ۔

حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والے علی ابن ابی طالبؑ تھے۔[۵]

۱۲۔مشہور محدث نسائی اپنی کتاب ''السنن'' میں زید بن ارقم سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ مَعَ رَسُولِ اللهِ عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبِ

---

[۱] مختصر تاریخ دمشق، جلد ۱۷ صفحہ ۳۰۷ (مصنف امام محمد بن مکرم المعروف ابن منظور)

[۲] تہذیب الکمال، جلد ۳، صفحہ ۸۵ (احقاق الحق، جلد ۲۰، صفحہ ۳۶۷ کے نقل کے مطابق)

[۳] اس حدیث کو ساتویں صدی ہجری کے عالم ابن عدیم نے اپنی کتاب تاریخ حلب، صفحہ ۲۹۵ پر نقل کیا ہے۔

[۴] المختار فی مناقب الابرار، صفحہ ۱۶ (احقاق الحق، جلد ۲۰، صفحہ ۵۴۷ کے مطابق)

[۵] یہ حدیث حسام الدین حنفی سے کتاب آل محمد، صفحہ ۱۷۴ میں بھی آئی ہے۔

رسول اللہؐ پر سب سے پہلے علی ابن ابی طالبؑ اسلام لائے۔ [۱]

۱۳۔ابواحمد جرجانی شافعی، کتاب الکامل فی الرجال میں مالک بن الحوریث سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے:

كَانَ عَلِيٌّ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ الرِّجالِ و خَديجَة اَوّلَ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ النِّساءِ:

مردوں میں سے علی علیہ السلام سب سے پہلے اسلام لائے اور عورتوں میں سے حضرت خدیجہؑ سب سے پہلے اسلام لے آئیں۔ [۲]

۱۴۔لیلی الغفاریہ ایسی خاتون تھیں جو آنحضرتؐ کے دور میں جنگ میں زخمی ہو جانے والوں کا علاج اور دیکھ بھال کرتی تھیں، وہ کہتی ہیں: میں علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ جمل کے میدان میں آئی جب میں نے بی بی عائشہ کو ان کے مقابلے پر دیکھا تو میں شک وشبہ میں مبتلا ہوگئی میں انکے پاس گئی اور پوچھا کیا تم نے علیؑ کے بارے میں رسول خداؐ سے کوئی فضیلت سُنی ہے؟ اس نے ہاں میں جواب دیا۔ پھر بی بی عائشہ نے ایک واقعہ بیان کیا اور اس واقعے کے ضمن میں رسول اکرمؐ سے نقل کیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

اِنّه اَوّلُ النّاسِ بِي اِسْلاماً

علیؑ وہ پہلے شخص ہیں جو مجھ پر ایمان لائے۔ [۳]

۱۵۔اہلسنت کے چار ائمہ میں ایک امام احمد بن حنبل اپنی کتاب مسند میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ مَعقل بن یسار (مشہور صحابی) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں تھا آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا۔ چلو فاطمہ (جو کہ بیمار تھیں) کی عیادت کرنے چلیں۔ جب ہم فاطمہؑ کے گھر پہنچے پیغمبر اکرمؐ نے ان کی مزاج پرسی کی فاطمہ سلام اللہ علیہا نے عرض کیا: میرا غم زیادہ ہے، فقر وغربت شدید ہے اور میری بیماری طول پکڑ گئی۔۔۔ان مشکلات اور سختیوں پر ان کی دلجوئی کے لیے آنحضرتؐ نے فرمایا:

اَوَ ما تَرْضِيْنَ اَنّي زَوَّجْتُكِ اَقْدَمَ اُمَّتي سِلْماً وَ اَكْثَرَهُمْ عِلْماً وَ اَعْظَمَهُمْ حِلْماً

کیا آپ اس پر راضی نہیں ہیں کہ میں نے آپ کی شادی ایسے مرد سے کی ہے جو تمام امت میں سب سے پہلے اسلام لایا، جس کا علم سب سے زیادہ اور حلم میں سب سے بڑا ہے۔ [۴]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسی حدیث کو ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ (جلد ۳، صفحہ ۲۵۷) میں ابن عساکر نے تاریخ دمشق (جلد ۱، صفحہ ۲۳۲) میں **الھیثمی** نے مجمع الزوائد (جلد ۹، صفحہ ۱۰۱) میں، متقی ہندی نے کنز العمال (جلد ۱۲، صفحہ ۲۰۵) میں اور دیگر

---

[۱] احقاق الحق، جلد ۲۰، صفحہ ۴۵۷۔

[۲] الکامل فی الرجال، جلد ۶، صفحہ ۲۳۷۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت۔

[۳] کتاب مختصر تاریخ دمشق میں اس حدیث کو محمد بن مکرم انصاری نے نقل کیا ہے (جلد ۱۷، صفحہ ۱۱۹)

[۴] مسند احمد جلد ۵، صفحہ ۲۶ (مطبوعہ دار الصادر)

اہلسنت کے علماء نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔

۱۶۔ رسول خداؐ کے صحابی عبداللہ بن صامت (ثابت) کہتے ہیں کہ ایک دن ہم آنحضرتؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے اور پوچھا: مَنْ اَحَبُّ اَصْحَابِكَ اِلَيْكَ؟ فَاِنْ كَانَ اَمْرٌ كُنَّا مَعَهُ وَاِنْ كَانَتْ نَاسِئَةٌ كُنَّا دُوْنَهُ قَالَ هَذَا عَلِيٌّ اَقْدَمُكُمْ سِلْماً وَاِسْلاماً۔ یعنی: اصحاب میں سب سے زیادہ آپ کا محبوب اور پیارا کون ہے؟ کہ اگر کوئی حادثہ (آپ کے لیے) پیش آئے تو ہم اس کے ساتھ ہوں اور جب کوئی خطرہ لاحق ہوتو اس پر جان نثار کریں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: میرا محبوب یہی علیؑ ہیں جس کا اسلام اور تسلیم تم سب سے پہلے ہے۔[1]

اس حدیث سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ثابت اور ان کے ساتھی ایسے شخص کی تلاش اور جستجو میں تھے جو رسول خداؐ کے بعد امامت، ولایت کے لائق اور قابل ہو اور آنحضرتؐ نے اسی خاطر علیؑ کا تعارف کرایا۔

۱۷۔ ایک اور صحابی رسول بریدہ نے بھی معقل بن یسار کی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے اس کے آخر میں ذکر ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جناب سیدہ زہراؑ کی دلجوئی کے لیے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا شوہر دیا ہے جو اسلام قبول کرنے میں سب سے اوّل، علم میں سب سے زیادہ اور حلم میں سب سے بڑا ہے۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

وَاللهِ اِنَّ اِبْنَيْكِ سَيِّدا شَبابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔

خدا کی قسم! تیرے دو بیٹے جوانان جنت کے سردار ہیں۔[2]

۱۸۔ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اسی مطلب کو اپنی گفتگو میں بھی بیان کیا ہے جسے تمام لوگ قبول کرتے ہیں۔ محمد بن ابی بکر انصاری کی کتاب الجوھر میں مذکور ہے کہ علیؑ نے بصرہ کے منبر پر فرمایا: اَنَا الصِّدِّيقُ الاَكْبَرُ آمَنْتُ قَبْلَ اَنْ يُومِنَ اَبُوبَكْرٍ وَاَسْلَمْتُ قَبْلَ اَنْ يُسْلِمَ۔ یعنی: صدیق اکبر میں ہوں، میں ابوبکر سے پہلے ایمان لایا ہوں اور اس کے اسلام لانے سے پہلے میں اسلام لایا ہوں۔[3] نیز شیخ محمد بن مکرم انصاری نے اپنی کتاب ''مختصر تاریخ دمشق'' میں حضرت امیر المومنینؑ سے یوں نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اَنَا اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ۔ یعنی: میں وہ ہوں جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔[4]

نہج البلاغہ میں بھی متعدد مقامات پر اسی مطلب کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک مقام پر جملہ ۱۳۱ میں وہ فرماتے

---

[1] اس حدیث کو احمد بن مردویہ نے مناقب کی کتاب میں نقل کیا ہے۔ (احقاق الحق۔ جلد ۱۵، صفحہ ۳۳۶)

[2] اس حدیث کو ابن عساکری تاریخ دمشق (جلد ا صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ بیروت) میں بیان کیا ہے۔ لیکن (صفحہ ۱۰۷، ۳۹۶) اس کے آخری جملے جو امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں ہے اسے فقط ارج المطالب کے منصف امرتسری نے درج کیا ہے۔

[3] الجوہرۃ، صفحہ ۸ (مطبوعہ دمشق) اسی مطلب کو ایک اور جماعت نے بھی نقل کیا ہے۔ جسے ابواحمد جرجانی نے کتاب الکامل فی الرجال (جلد ۳، صفحہ ۱۱۲۳) میں توضیح الدلائل (صفحہ ۱۷۱، اور مختصر تاریخ دمشق وغیرہ میں۔

[4] مختصر تاریخ دمشق جلد ۱۷، صفحہ ۱۱۸۔

ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَوَّلُ مَنْ اَنَابَ وَ سَمِعَ وَ اَجَابَ لَمْ يَسْبِقْنِي اِلاَّ رَسُوْلُ اللهِ بِالصَّلاةِ یعنی: اے اللہ! میں سب سے پہلے تیری طرف لوٹا ہوں میں نے تیرا پیغام سنا اور اسے قبول کیا۔ رسول خداؐ کے علاوہ کسی نے بھی نماز پڑھنے میں مجھ سے سبقت نہیں لی۔[1]

لگتا یوں ہے کہ ہم اپنی تفسیری روش سے دور ہو گئے ہیں اور بات لمبی ہو گئی لیکن مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ ہم اس سے بھی زیادہ تفصیل سے گفتگو کرتے۔ بہرحال روایات کے اس سلسلے کو ابن ہشام کی روایت پر ختم کرتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب سیرہ نبویہ میں بیان کی ہے البتہ اس اعتراف کے ساتھ کہ ابھی بہت سی باتیں رہ گئی ہیں جن کا بیان کرنا ضروری تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں جب نماز کا وقت ہوتا تھا تو آنحضرتؐ نماز کی ادائیگی کے لیے مکہ کے دروں میں سے کسی ایک کی طرف چلے جاتے تھے صرف علی ابن ابی طالبؑ خفیہ طور پر ان کے ساتھ ہوتے تھے۔۔۔ ایک دن ان کے والد ابوطالب نے پوچھا: بیٹا یہ کونسا دین ہے جسے تم نے اختیار کر رکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: بابا جان میں اللہ اس کے رسولؐ اور جو کچھ وہ خدا کی طرف سے لائے ہیں اس پر ایمان لا یا ہوں، اور ان کیساتھ نماز پڑھی ہے۔۔۔ ابوطالب نے کہا: آگاہ رہو! انہوں نے تمہیں خیر و نیکی کے علاوہ کوئی دعوت نہیں دی ہے۔ ان سے ہرگز جدا نہ ہونا۔[2]

حضرت علیؑ کا سب سے پہلے اسلام قبول کرنا اس قدر واضح ہے کہ بعض نامور شعراء نے اپنے اشعار میں اسے علیؑ کے امتیازات اور افتخارات کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں ایک شاعر کہتا ہے:

اَلَيْسَ اَوَّلَ مَنْ صَلّٰي لِقِبْلَتِكُمْ
وَاَعْلَمَ النَّاسِ بِالقرآنَ والسُّنَنِ؟

کیا وہ پہلا شخص نہیں ہے جس نے تمہارے قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے اور وہ قرآن و سنت کا تمام لوگوں سے زیادہ عالم نہیں ہے؟

ایک اور شاعر کہتا ہے:

فهذا و فی الاِسْلاَمِ اَوَّلُ مُسْلِم
وَ اَوَّلُ مَنْ صلّٰی وَ صامَ و هَلَّلاَ

وہ اسلام میں سب سے پہلا مسلمان ہے۔ اور وہی پہلا شخص ہے جس نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا اور تہلیل (لا الہ الا اللہ) کہی۔

علامہ امینی مرحوم نے ''الغدیر'' میں دس سے زیادہ شعراء کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اپنے کلام میں اس مطلب کو ذکر کیا ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ علامہ امینی نے مذکورہ کتاب میں ایک سو زائد احادیث پیغمبر اکرم ﷺ، امیر المومنین -، اصحاب

[1] یہ مطلب خطبہ ۱۷۱، صفحہ ۱۹۲ میں بھی آیا ہے۔
[2] سیرۃ ابن ہشام، جلد ا، صفحہ ۲۶۳ (مطبوعی دار احیاء التراث العربی)

کرام، تابعین، مؤرخین اور محدثین سے نقل کی ہیں جو سب گواہی دیتی ہیں کہ علیؑ مردوں میں سے سب سے پہلے فرد ہیں جو رسول اللہؐ پر ایمان لائے۔

ایک سوال

یہاں پر ایک سوال مشہور ہے جو اسلام کے ابتدائی دور سے بعض بہانہ باز افراد کے درمیان موجود تھا کہ یہ بات درست ہے کہ علیؑ نے مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا، لیکن کیا اسلام میں نابالغ اور دس سالہ بچے کا اسلام قابل قبول ہے؟ اور اگر ان کے بلوغت کے وقت کو مدنظر رکھیں تو ان سے پہلے بہت سے افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔

جواب

اس سوال کے جواب میں بہتر یہ ہے کہ ہم عباسی خلیفہ مامون اور اس کے دور کے ایک اسحاق نامی اہلسنت عالم کے درمیان ہونے والی گفتگو کو نقل کریں۔ (اس واقعہ کو ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں ذکر کیا ہے)۔ مامون نے اس سے پوچھا جس وقت رسول خداؐ مبعوث ہوئے اس وقت تمام اعمال میں سے کونسا عمل افضل ہے؟ اسحاق نے جواب دیا: توحید اور رسالت محمدؐ کی خلوص کے ساتھ شہادت دینا۔ مامون نے کہا: کیا تم کسی کو جانتے ہو جس نے علیؑ سے اسلام لانے میں سبقت کی ہو؟ اسحاق نے کہا: علیؑ کم سنی اور چھوٹی عمر میں اسلام لائے اور احکام الٰہی ان پر لاگو نہیں تھے۔ مامون نے پوچھا: کیا علیؑ کا ایمان لانا پیغمبر اکرمؐ کی دعوت پر نہ تھا؟ کیا پیغمبرؐ نے ان کے اسلام کو مسترد کر دیا؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول خداؐ کسی ایسے فرد کو اسلام کی دعوت دیں جس کا اسلام قابل قبول ہی نہیں ہے؟ اسحاق کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔[1]

علامہ امینی مرحوم عقد الفرید سے اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں۔ ابوجعفر اسکافی معتزلی (متوفی ۲۴۰ ہجری) اپنے رسالے میں لکھتے ہیں کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ علی علیہ السلام کو یہ افتخار حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ پیغمبر اکرمؐ سوموار کو مبعوث ہوئے اور علی علیہ السلام منگل کو ایمان لائے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ ہوں جو سب سے پہلے ایمان لایا۔ اور یہ بات سب باتوں سے زیادہ مشہور ہے اور ہم نے ماضی میں کسی کو نہیں پایا جو علی علیہ السلام کے اسلام کو سبک سمجھے یا یہ کہے کہ وہ بچپن میں اسلام لائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جضرت عباس اور حضرت حمزہ جیسے افراد اسلام لانے کے لیے حضرت ابوطالب کے ردعمل کے منتظر تھے لیکن ان کے بیٹے نے اسلام لانے میں اپنے باپ کا انتظار نہیں کیا اور ایمان قبول کرلیا۔[2]

مختصر یہ کہ اوّلاً رسول اکرمؐ نے علیؑ کے اسلام کو قبول کیا اور جو شخص انکی اس عمر میں اسلام کو معتبر نہ جانے تو اس نے حقیقت میں

[1] عقد الفرید، جلد۳، صفحہ ۴۳ (خلاصہ)

[2] الغدیر، جلد۳، صفحہ ۲۳۷

آنحضرتؐ پر اعتراض کیا ہے۔ ثانیاً مشہور روایات جن کا تذکرہ ہو چکا ہے میں دعوت ذوالعشیرہ کے واقعے میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے کھانا تیار کیا اور رشتہ داروں کو دعوت پر بلایا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی اور ارشاد فرمایا: جو شخص سب سے پہلے اسلام کی حمایت کے لیے میری دعوت کو قبول کرے گا وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین ہوگا۔ علی ابن ابی طالبؑ کے سوا کسی نے آنحضرتؐ کی دعوت کا مثبت جواب نہ دیا۔ علیؑ نے کہا میں آپ کی مدد کروں گا اور آپ کی بیعت کرتا ہوں اور آنحضرتؐ نے فرمایا: تو میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔[1]

کون اس بات کو مانتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اس شخص کو اس دن بھائی، وصی اور جانشین کے طور پر متعارف کرائیں اور دوسروں کو ان کی پیروی کی طرف بلائیں۔ یہاں تک کہ مشرک سردار اس دن ابوطالب سے تمسخر کے طور پر کہیں کہ تم اپنے بیٹے کی اطاعت کرو۔ جبکہ وہ حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوں اور ہٹ دھرم افراد کے بقول انکا اسلام بھی قابل قبول نہ ہو۔ بلا شک وشبہہ اسلام قبول کرنے میں بلوغ کی شرط نہیں ہے ہر بچہ جو سمجھدار کافی حد تک ممیز ہو اور اسلام قبول کرے بالفرض اس کا باپ مسلمان نہ ہو تو وہ اس سے جدا ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوغ نبوت کے لیے شرط نہیں ہے لہٰذا قرآن کی رو سے بعض انبیاء عہد طفولیت میں مقام نبوت تک پہنچے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَ آتَيناهُ الحُكْمَ صَبِيّاً۔

ہم نے انہیں بچپن میں فرمان نبوت دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آیا ہے کہ انہوں نے ماں کی گود میں واضح طور پر کہا:

اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾

میں اللہ کا بندہ ہوں، آسمانی کتاب مجھے دی گئی ہے اور مجھے نبی بنایا گیا ہے۔ (مریم/۳۰)

ان سے سب سے بالاتر بات یہ ہے کہ علیؑ کے اسلام کو آنحضرتؐ نے تسلیم کیا ہے اور انہیں دعوت ذوالعشیرہ کے موقعہ پر اپنا بھائی، وصی، وزیر اور جانشین بیان کیا ہے۔ بہرحال وہ روایت جو بتاتی ہے کہ علیؑ نے سب سے پہلے رسول اللہؐ کی دعوت کو قبول کیا ہے وہ انکی بے مثال فضیلت کی حامل ہے ایسی فضیلت جس میں کوئی بھی ان کا ثانی اور برابری کرنے والا نہیں۔ اسی دلیل کی بنیاد پر وہ رسول خداؐ کی جانشینی اور خلافت کے لیے تمام امت سے زیادہ لائق اور حقدار ہیں۔

[1] ان احادیث کی اسناد کو ہم تفصیلاً دعوت ذوالعشیرہ والی حدیث کے نیچے ذکر کیا ہے۔

آیت اُذن واعیة

سورہ حاقہ کی آیت ۱۲ میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

لِنَجۡعَلَهَا لَكُمۡ تَذۡكِرَةً وَّتَعِيَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾

''تا کہ ہم اسے تمہارے لیے یادگار بنادیں اور سمجھدار کان ہی اسے محفوظ کر لیتا ہے۔''

مقصد یہ تھا کہ کشتی نوح کے ذریعے مومنین کی نجات اور طوفان کے ذریعے کفار کے غرق ہونے کو (تمہارے لیے) یاددہانی کا ذریعہ قرار دیں اور سمجھدار کان اس یاددہانی (اور اس طرح کے واقعات) کو محفوظ رکھتے ہیں (تا کہ دوسروں تک پہنچائیں اور سب نصیحت حاصل کریں)

جلال الدین سیوطی نے تفسیر الدر المنثور میں چھ حوالوں سے مشہور صحابی بریدہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنی اَنۡ اُدۡنیَكَ وَ لا اُقصیَكَ، وَ اَنۡ اُعَلِّمَكَ وَ اَنۡ تَعِیَ، وَ حَقٌّ لَكَ اَنۡ تَعِیَ فَنزلَتۡ هٰذِهِ الآيَةُ: "و تَعيَها اُذُنٌ وَاعِيَةٌ"[1]

اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے نزدیک کروں اور تمہیں تعلیم دوں اور تو اسے محفوظ رکھے اور ایسا ہونا تمہیں زیب دیتا ہے، اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی (وتَعيَها اُذُنٌ وَاعِيَةٌ) محفوظ رکھنے والے کان اسے محفوظ رکھیں گے۔

مذکورہ کتاب میں ابونعیم اصفہانی کی کتاب ''حلیۃ الاولیاء'' سے حضرت علیؑ سے بیان ہوا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: ۔۔۔۔ (پھر وہ بریدہ والی حدیث کے مضمون کو ذکر کرتے ہوئے آخر میں مزید فرماتے ہیں:) ''فَاَنۡتَ اُذُنٌ وَاعِيَة بِعِلۡمِی۔ یعنی: تم میرے علم و دانش کو محفوظ رکھنے والے ہو۔[2]

اسی کتاب میں پانچوالوں سے ''مَکۡحُول'' (حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادموں میں سے ایک خادم) سے منقول ہے کہ جب آیت: ''و تَعيَها اُذُنُ وَاعِيَةُ'' نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے دعا کی ہے کہ اس سمجھدار اور سننے والے کان کو علیؑ کا کان قرار دے۔ مکحول کہتے ہیں: اس کے بعد علیؑ کہتے تھے ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو بھی بات سنی اُسے کبھی بھی نہیں

---

[1] الدر المنثور جلد ۶ صفحہ ۲۶۰

[2] ایضا

جھٹلایا۔[1] زمخشری نے بھی تفسیر کشاف میں اس آخری حدیث کو بغیر کوئی اعتراض کیے نقل کیا ہے۔[2]

چند دیگر مفسرین جیسے فخر رازی نے تفسیر کبیر[3] میں، آلوسی نے ''روح المعانی''[4] میں برسوئی نے روح البیان[5] میں، قرطبی نے تفسیر جامع[6] میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں آخری حدیث کو بیان کیا ہے۔ طبری نے بھی اس موضوع پر اپنی تفسیر میں اس حدیث کو اور بعض دیگر حدیثوں کو ذکر کیا ہے۔[7]

حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں اس حوالے سے تیرہ احادیث کو مختلف راویوں سے نقل کیا ہے جن کا سلسلہ سند رسول خدا ﷺ پر ختم ہوتا ہے۔ ان میں کچھ رسول خدا ﷺ کے خادم مکحول سے، کچھ جناب بریدہ سے اور چند ایک خود حضرت علی بن ابی طالب – سے اور بعض جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

''ابو الدنیا'' علیؑ سے بیان کرتے ہیں کہ جب آیت ''وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ'' نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے مجھے فرمایا: اے علی! میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ اس کان کا مصداق تجھے قرار دے (جو کچھ آپ سنیں اُسے ذہن نشین کرلیں اور اُسے بروے کار لائیں اور پھیلائیں)[8]

ایک اور حدیث میں مکحول بیان کرتے ہیں جب پیغمبر اسلام ﷺ نے آیت ''وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ'' کی تلاوت فرمائی تو علیؑ کی طرف رخ کر کے فرمایا: ''سَأَلْتُ اللهَ اَنْ يَجْعَلَهَا اُذُنَكَ'' یعنی: ''میں نے خدا سے چاہا ہے کہ اس سمجھدار کان کو تمہارا کان قرار دے۔'' علیؑ کہتے ہیں: اس کے بعد جو کچھ پیغمبر اکرم ﷺ سے میں نے سُنا اُسے کبھی نہیں بُھلایا۔[9] پھر بریدہ اسلمی کی حدیث جسے ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے، نقل کی ہے۔[10][1]

آخر میں وہ جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کرتے ہیں کہ جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے

---

[1] ایضا

[2] کشاف، جلد ۴، صفحہ ۶۰۰

[3] تفسیر کبیر جلد ۳۰، صفحہ ۱۰۷

[4] روح المعانی، جلد ۲۹، صفحہ ۴۳

[5] روح البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۱۳۶۔

[6] قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۴۳ تا ۶۷۔

[7] طبری جلد ۲۹، صفحہ ۳۵

[8] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۷۱۔

[9] ایضا صفحہ ۲۷۷ (حدیث ۱۰۱۵)

[10][1] ایضا صفحہ ۲۸۲ (حدیث ۱۰۲۲)

دُعا کی کہ (اس کا کامل مصداق) علیؑ کے کان کو قرار دے اور آنحضرتؐ کی یہ دعا پوری ہوئی۔[1] فضائل الخمسہ کے مصنف نے اس حدیث کو مذکورہ بالا کتب کے علاوہ، کنز العمال، نور الابصار، الھیثمی کی مجمع الزوائد اور واحدی کی اسباب النزول سے بھی نقل کیا ہے۔[2]

نتیجہ

گزشتہ بحث میں امامت و ولایت اور خلافت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق جن شرائط کو ہم نے بیان کیا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ الٰہی رہبروں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس علم و دانش کا عظیم خزانہ ہونا چاہیے تا کہ وہ امت کی رہبری اور راہنمائی کی ذمہ داری کو انجام دے سکیں اور مخلوق خدا کی دین و دنیا کے امور میں ہدایت کر سکیں۔ اسلام کی تعلیمات اور قوانین الٰہی کی حفاظت کر سکیں اور قرآن و سنت کی پاسداری کر سکیں۔ ادھر مذکورہ آیت کی تفسیر میں منقولہ روایات کے مطابق امت میں سے صرف حضرت علیؑ ایسے فرد ہیں جو یہ مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ پس ان دو باتوں کے پیش نظر اچھی طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت و خلافت کے منصب کے لیے ان سے زیادہ حقدار اور ان سے بڑھ کر لائق اور کوئی نہ تھا۔

[1] ایضاً، صفحہ ۰۸۲ (حدیث ۱۰۲۲)

[2] فضائل الخمسہ، جلد ۱، صفحہ ۲۳۰، ۳۲۱

۲۰۔ آیت محبت

سورہ مریم کی آیت ۹۶ میں ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیے تو رحمن ان کے لیے (مومنین کے دلوں میں) محبت پیدا کردے گا۔

یہ آیت اچھی طرح دلالت کررہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح لوگوں کے درمیان محبوبیت کا سرچشمہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح میں عجیب کشش پائی جاتی ہے دلوں کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں یہاں تک کہ ناپاک اور گندے افراد کو بھی پاکیزہ اور صالح افراد بھلے لگتے ہیں۔

اس آیت مجیدہ کی تفسیر میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعدد راویوں سے بہت ساری روایات اہلسنت کی کتب میں منقول ہیں کہ یہ آیت علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں ہے ہم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ کسی کی شان میں آیت کے نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کامل واکمل مصداق وہ ہے، اور یہ بات آیت کے وسیع مفہوم کے قطعاً منافی نہیں ہے۔ اس مقام پر ہم اسلامی کتب کا رخ کرتے ہیں اور اس بارے میں کچھ روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

شواہد التنزیل میں براء بن عازب، ابو رافع، جابر بن عبد اللہ انصاری، ابن عباس، ابو سعید خدری، اور محمد بن حنیفہ سے مختلف اسناد سے کئی روایات نقل کی گئی ہیں کہ جو یہ بیان کرتی ہیں کہ یہ آیت علی ابن ابی طالب- کے بارے میں ہے، جس نے ان کی محبت کو ہر صاحب ایمان کے دل میں اجاگر کیا ہے۔ ایک حدیث میں ابو سعید خدری نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ سے فرمایا:

يَا اَبَا الْحَسَن! قُلْ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِي عِنْدَكَ عَهْدًا وَ اجْعَلْ لِي فِي صُدُورِ الْمُؤْمِنِينَ مَوَدَّةً

اے ابوالحسن! کہو اے اللہ! اپنی جانب سے میرے لیے عہد و پیمان [1] مقرر فرما اور میری محبت کو مومنین کے دلوں میں ڈال دے۔

اس موقعہ پر آیت: ''اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا'' نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں: لَا تَلْقٰى رَجُلاً مُؤْمِناً اِلاَّ فِي قَلْبِهٖ حُبٌّ لِعَلِيّ بن ابی طالبٍ (یعنی آپ کوئی بھی مؤمن انسان ایسا نہیں پائیں گے کہ جس کے دل میں علی ابن ابی طالب- کی محبت نہ پائی جاتی ہو۔) یہی وجہ سے ہم جس مومن سے بھی ملتے ہیں اس کے دل میں علی بن

---

[1] یہ الفاظ اسی سورہ کی آیت نمبر ۸۷ کی طرف اشارہ کررہے ہیں جو مسئلہ شفاعت کے بارے میں فرماتی ہے کہ یہ لوگ شفاعت کے مالک نہیں ہیں مگر وہ جو اس کے ہاں عہد و پیمان رکھتے ہیں۔

ابی طالبؑ کی محبت موجود ہوتی ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی بات جابر بن عبداللہ نے بیان کی ہے۔[2] یہی مطلب براء بن عازب نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔[3] نیز یہی مفہوم (چند ذرائع سے) محمد بن حنیفہ سے بھی بیان ہوا ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ان احادیث میں علیؑ کی محبت کے ساتھ ان کی ذریت اور اہل بیت کی محبت کا بھی ذکر ہے۔[4] مذکورہ کتاب میں کلی طور پر بیس روایات مختلف طرق سے منقول ہیں اور وہ سب اسی مطلب پر تاکید کر رہی ہیں۔

جلال الدین سیوطی اپنی کتاب الدر المنثور میں اپنی اسناد سے اس حدیث کو براء بن عازب اور ابن عباس سے نقل کرتے ہیں۔[5] زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں اس روایت کو اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے علیؑ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہارے لیے (شفاعت کے لیے) بارگاہ میں عہد و پیمان مقرر فرمائے اور تمہاری محبت اور مودت کو مومنین کے سینوں میں ڈال دئے۔ اس موقعہ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔[6] اسی مطلب کو بعینہ نامور مفسر قرطبی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور اسی طرح کشاف نے؛ اور اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا ہے۔[7]

دیگر مشہور شخصیات جنہوں نے اس حدیث کو مذکورہ آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ ان میں درج ذیل افراد قابل ذکر ہیں، سبط ابن جوزی نے تذکرہ[8] میں، محب الدین طبری[9] اور ابن صباغ مالکی نے الفصول المھمہ[10] میں، ھیثمی نے الصواعق[11] میں، ابن صباغ نے اصعاف الراغبین[12] میں۔ ان کتب کا ذکر امامت وولایت کے موضوع پر مفصل کتب میں موجود ہے۔

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۳۶۵، حدیث ۵۰۴

[2] ایضا صفحہ ۳۵۹، حدیث ۴۰۹، ۴۹۰

[3] ایضا صفحہ ۳۵۹، حدیث ۴۰۹، ۴۹۰

[4] ایضا صفحہ ۶۷-۳۶۶، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۷، ۵۰۹

[5] الدر المنثور، جلد ۴، صفحہ ۲۸۷

[6] کشاف جلد ۳، صفحہ ۴۷

[7] تفسیر قرطبی، جلد صفحہ ۴۲۰۰ (زیر بحث آیت کی تفسیر میں)

[8] تذکرہ، صفحہ ۲۰

[9] ذخائر العقبیٰ، صفحہ ۸۹

[10] فصول المھمہ، صفحہ ۱۰۶

[11] صواعق المحرقہ، صفحہ ۱۷۰

[12] اصعاف الراغبین، جو کہ نور الابصار کے حاشیہ پر چھپی ہے، صفحہ ۱۱۸۔

مفسرین میں سے صرف آلوسی نے روح المعانی میں اس حدیث کے بارے میں منفی رویہ اور موقف اختیار کیا ہے۔ معمول کے مطابق پہلے اس نے حدیث کو بیان کیا ہے پھر اس کو مخدوش ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس نے مذکورہ حدیث کو براء بن عازب سے نقل کرنے کے بعد اور محمد بن حنیفہ کی حدیث سے اس کی تائید کرنے کے بعد کہا ہے کہ آیت کی تفسیر میں معیار لفظ کا عموم ہے نہ کہ مخصوص سبب نزول۔[1]

ہم نے بارہا کہا ہے اور ایک بار پھر کہتے ہیں کہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ شان نزول آیات کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیتا ہے بلکہ شان نزول آیت کا اتم اور اکمل مصداق ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ جو کچھ ان روایات میں علیؑ کے متعلق بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی محبت کو تمام مومنین کے دلوں میں قرار دیا ہے۔ یہ بات امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کسی فرد کے متعلق نہیں ہے اور امیر المومنین علیؑ کے لیے یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس میں کوئی بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔ کیا یہ ہستی جس کی محبت اور مودت کو اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین کے دلوں میں آمیختہ کیا ہے، منصب امامت اور خلافت رسول خداؐ کے لیے تمام افراد سے زیادہ لائق اور حقدار نہیں ہے۔؟

[1] روح المعانی، جلد ۱۶، صفحہ ۱۳۰۔

۲۱۔آیت منافقین

سورہ محمدؐ کی آیت ۳۰ میں ارشاد الٰہی ہے:

وَلَوۡ نَشَآءُ لَاَرَيۡنٰكَهُمۡ فَلَعَرَفۡتَهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ‌ؕ وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِىۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ‌ؕ ...

اگر ہم چاہتے تو ہم آپ کو ان (منافقین) کی نشاندہی کر دیتے پھر آپ انہیں ان کی شکلوں سے پہچان لیتے اور آپ انداز کلام سے ہی انہیں ضرور پہچان لیں گے۔

درحقیقت اس آیت میں پچھلی آیت کے مقابل کا نکتہ بیان ہوا ہے۔ یہ آیت منافقین اوران کی نشانیوں کی بابت بتا رہی ہے۔ آیت کہتی ہے اگر ہم چاہتے تو آپ کو ان کی شناخت کرا دیتے، یہاں تک کہ ان کے چہروں پر نشانی لگا دیتے تا کہ اُسے دیکھ کر آپ انہیں پہچان لیں۔اس کے بعد آیت مزید کہتی ہے کہ اگر چہ موجودہ حالت میں آپ انہیں طرز گفتگو سے ہی پہچان سکتے ہیں کیونکہ جب بھی جہاد کی بات ہوتی ہے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے جان چھڑائیں اور لوگوں کے حوصلوں کو پست کریں اور جب نیک اور صالح افراد نیز اسلام میں سبقت لے جانے والوں کی بات ہوتی ہے تو ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان پر کوئی الزام یا تہمت لگائی جائے اور انہیں داغدار بنایا جائے۔

یہاں پر ابوسعید خدری کی مشہور حدیث یاد آتی ہے جو انہوں نے ''وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فی لحن القول'' کے جملے کی تفسیر میں ذکر کی ہے وہ اس جملے کی تفسیر میں کہتے ہیں: بِبُغضِهِمۡ عَلِیَّ ابنَ ابی طالب۔ یعنی: انہیں علی ابن ابی طالبؑ کی عداوت ودشمنی کے طریقے (ان کے بارے میں ان کی بغض وکینہ سے بھری باتوں) سے پہچانا جا سکتا ہے۔اس حدیث کو حاکم حسکانی نے تین سندوں سے شواہد التنزیل میں نقل کیا ہے۔[1] نیز سیوطی نے الدر المنثور میں اسے ''ابن مردویہ'' اور ابن عسا کر نے ابوسعید خدری سے نقل کیا ہے۔[2]

ایک اور روایت میں وہ ابن مسعود سے بیان کرتے ہیں کہ اس نے کہا: ''ما کُنّا نَعرِفُ المنافقینَ عَلیٰ عَهدِ رَسُولِ اللهِ (ص) اِلَّا بِبُغضِهِمۡ عَلِیَّ ابن ابیطالِبِ[3] یعنی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں منافقوں کو علی ابن ابی طالب سے بغض اور عداوت کے ذریعے پہچانتے تھے۔[4]

اس حدیث کے راوی اور کتب صرف مذکورہ بالا افراد اور کتابوں میں منحصر نہیں ہیں، جابر بن عبداللہ انصاری اور ابوذر غفاری نے

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۷۸ (حدیث ۸۸۳۔۸۸۵)

[2] الدر المنثور، جلد ۶، صفحہ ۶۶

[3] الدر المنثور، جلد ۶، صفحہ ۶۶

[4] استیعاب، جلد ۲، صفحہ ۴۶۴۔

بھی اس حدیث کونقل کیا ہے۔جیسا کہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب استیعاب میں اس حدیث کو جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے۔محب الدین طبری، الرّیاض النّضرۃ میں ابوذر غفاری سے یوں بیان کرتے ہیں:

مَا کُنَّا نَعْرِفُ الْمُنَافِقِینَ عَلٰی عَھْدِ رَسُولِ اللهِ (ص) اِلَّا بِثلاثٍ : بتکذِیبِھِمُ اللهَ وَرَسُولَهُ وَالَّتخلُّفِ عَنِ الصَّلاۃِ وَبُغْضِھِمْ عَلِیّ بن ابیطالِبٍ

رسول اللہؐ کے دور میں ہم منافقین کوصرف تین نشانیوں سے پہنچانتے تھے۔اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب،نماز (جماعت) کی خلاف ورزی اور علی بن ابی طالب سے بغض وعداوت۔[1]

صحیح ترمذی جوکہ اہلسنت کی درجہ اول کی کتاب ہے،اس میں بھی یہ حدیث دوطریقوں سے ابوسعید خدری اور جناب اُمّ سلمہ سے نقل ہوئی ہے (ام سلمہ کی حدیث اور مذکورہ حدیث) میں تھوڑا سا فرق ہے۔[2] ابن عسا کر نے بھی تاریخ دمشق اسی مطلب کو یا اس کے مشابہہ مفہوم کوابوسعید خدری، جابر بن اللہ انصاری،عبادۃ بن صامت اور محبوب بن ابی الزناد سے نقل کیا ہے۔[3]

عبادہ ابن صامت کی حدیث میں آیا ہے:

کُنَّا نُوِّرُ اَوْلادَنَا بِحُبِّ عَلِیِّ بْنِ اَبِیطالب﷤ فَاِذا رَاَیْنَا اَحدا لایُحِبُّ عَلِیَّ ابْنَ ابی طالِب﷤ عَلِمْنَا اَنَّهُ لَیْسَ مِنَّا وَ اَنَّهُ لَغَیْرِ رُشْدِہٖ۔

ہم اپنی اولاد کی صورتحال کوعلی بن ابی طالب-کی محبت سے واضح کرتے تھے جب ہم کسی میں ہم علی ابن ابی طالب-کی محبت کو نہ پاتے تو ہم جان لیتے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے،اور محبوب بن ابی الزناد کی حدیث میں انصار کی جماعت کی زبانی آیا ہے:

اِنْ کُنَّا لَنَضْرِفُ الرَّجُلَ اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ بِبغُضِهِ علیَّ ابن ابی طالبٍ﷤

جب کسی میں ہم بغض علی بن ابی طالبؑ کا مشاہدہ کرتے تو ہم سمجھ جاتے تھے کہ یہ اپنے باپ کا نہیں ہے۔[4]

ان روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم اس سلسلے کو ایک ایسی حدیث پر ختم کرتے ہیں جو خود رسول اکرم ﷺ سے نقل ہوئی ہے۔خیبر کے دن پیغمبر اکرم ﷺ نے علیؑ کے بارے میں مفصل بیان ارشاد فرمایا اس کے ضمن میں یہ بھی فرمایا: یا اَیُّھا النَّاسُ اِمْتَحِنُو اَوْلادَ کم بِحُبِّهٖ ،فَاِنَّ عَلِیًّا لَایَدْعُو اِلٰی ضلالَۃٍ و لایُبْعِدُ عَنْ ھُدیً، فَمَنْ اَحَبَّهُ فَھُوَ مِنْکُمْ وَ مَنْ اَبْغَضَهُ

---

[1] الریاض النضرۃ صفحہ ۲۱۴۔

[2] صحیح ترمذی،جلد ۵،صفحہ ۶۳۵ (حدیث نمبر ۳۷۱۷)

[3] مختصر تاریخ دمشق،جلد ۱۷،صفحہ ۳۷۰،۳۷۱، مطبوعہ دارالفکر (دمشق)

[4] مختصر تاریخ دمشق،جلد ۱۷،صفحہ ۳۷۰،۳۷۱، مطبوعہ دارالفکر (دمشق)

فَلَيْسَ مِنْكُمْ ۔ یعنی: اے لوگو! اپنی اولاد کو علیؑ کی محبت سے آزماؤ، بے شک علیؑ گمراہی کی طرف دعوت نہیں دیتا اور ہدایت سے دُور نہیں کرتا، جو اس سے محبت کرے وہ تمہارا ہے اور جو ان سے بغض وعداوت رکھے وہ تمہارا نہیں ہے (کسی اور کا ہے)[1]

جب انسان ان تمام مذکورہ روایات کا جائزہ لیتا ہے اور ان میں غور وفکر کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک ایسی شخصیت آتی ہے جس سے عقیدت اور محبت ایمان کی نشانی ہے اور اس سے عداوت اور دشمنی کفر اور نفاق کی علامت ہے، اور یہ سب کچھ ہم تک ان سخت ترین ادوار سے گذر کر پہنچا ہے جب بنی امیہ جیسی حکومتوں نے علیؑ کے دوستوں پر گھیرا تنگ کر رکھا تھا اور ان کے دشمن تمام امور پر مسلط تھے یہاں تک کہ ان پر سب وشتم اور وہ بھی عمومی محافل میں، حکومت اور صاحبان اقتدار کی قربت کا باعث تھا۔ انسان جب دیکھتا ہے کہ یہ تمام بے نظیر فضائل اور کمالات جو مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن سے تاریخ، تفسیر اور احادیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں، کس طرح سے سخت ترین دشمنوں کے چنگل سے نکل کر ہم تک پہنچے ہیں۔ تو وہ حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔

یہ سب کچھ نور حق کو تمام ادوار اور قرون میں تابندہ رکھنے اور علیؑ کی ولایت اور خلافت کے بارے میں تمام نسلوں پر حجت تمام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی مشیت سے ہوا ہے۔

[1] مختصر تاریخ عساکر: جلد ۱۷، صفحہ ۳۷۱

۲۲۔آیت ایذاء

سورہ احزاب کی آیت ۵۷ میں ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا﴿۵۷﴾

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہے اور ان کے لیے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب تیار کیا ہے۔

بدیہی بات ہے کہ کوئی بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا نہ اُسے اذیت پہنچا سکتا ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچانے سے مراد (جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے) کفر اور الحاد ہے جو اللہ تعالیٰ کو غضبناک کرتا ہے اور ان افراد کے عقاب پر تاکید ہے جو رسول اور مومنین کو اذیت دیتے ہیں کیونکہ انہیں اذیت پہنچانا خدا کو اذیت پہنچانے کے مترادف ہے۔

اس حوالے سے اہل سنت اور اہل بیت کے حوالوں سے کئی روایات بیان ہوئی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''اے علیؑ! جو تمہیں اذیت اور تکلیف پہنچائے اس نے مجھے اذیت دی ہے۔'' اس لحاظ سے انہیں اذیت دینا حضرت رسول خدا ﷺ کو اذیت پہنچانے کے برابر ہے۔

حاکم حسکانی اپنی کتاب شواہد التنزیل میں جابر بن عبداللہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے سنا ہے کہ آپؐ نے علیؑ سے فرمایا: مَنْ آذاكَ فَقَدْ آذانی۔ یعنی: جس نے تمہیں تکلیف پہنچائی اُس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔[۱] ایک اور حدیث میں وہ ابن ابی سلمہ کے ذریعے سے زوجہ رسولؐ بی بی اُمّ سلّمہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو علیؑ سے فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ: اَنْتَ اَخی و حبیبی مَنْ آذاكَ فَقَدْ آذانی۔ یعنی: تم میرے بھائی اور حبیب ہو جس نے تمہیں ستایا اُس نے مجھے ستایا ہے۔[۲] اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ اسی مطلب کو ایک اور جماعت جس میں حضرت عمر، سعد بن ابی وقاص ابوھریرہ، ابن عباس اور ابوسعید خدری شامل، نے بھی نقل کیا ہے۔[۳]

نیز موصوف ایک اور حدیث حضرت علی بن ابی طالب سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بالوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اس حدیث کو اللہ کے رسولؐ نے میرے لیے بیان فرمایا ہے جب کہ آپؐ نے

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۹۸ (حدیث ۷۷۷)

[۲] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۹۸ (حدیث ۷۷۸)

[۳] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۹۸ (حدیث ۷۷۸)

اپنے بالوں کو پکڑا ہوا تھا، فرمایا:

مَنْ آذی شَعرَةً مِنْكَ فَقَدْ آذانی وَمَنْ آذانی فَقَدْ آذی اللهَ وَمَنْ آذی اللهَ فَعَلَيْهِ لعنة اللهِ

جو شخص تمہارے ایک بال کو بھی تکلیف پہنچائے اُس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور جو مجھے اذیت پہنچائے اُس نے خدا کو اذیت دی ہے اور جو خدا کو اذیت پہنچائے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔[1]

مذکورہ بالا احادیث میں صرف اس بات کا ذکر ہے علیؑ کو اذیت دینا، رسول خداؐ کو اذیت پہنچانا ہے، لیکن ان میں مذکورہ آیت سے استدلال نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ بعض دیگر روایات میں اس سے استدلال بڑی صراحت سے کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت حاکم نیشاپوری نے "مستدرک الصحیحین" میں نقل کی ہے جس کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ حدیث صحیح اور معتبر ہے۔ وہ ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ ایک شامی نے اس کے سامنے علیؑ کی ذات مقدس پر سب وشتم کیا تو ابن عباس نے اس سے کہا:

يا عَدُوَّ اللهِ آذَيْتَ رَسُولَ اللهِ (ص) إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا لو كانَ رَسُولُ اللهِ حَيّاً لَآذَيْتَهُ[2]

اے خدا کے دشمن! تم نے اپنی بات سے رسول خدا کو اذیت پہنچائی ہے (قرآن ارشاد فرماتا ہے) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں ان پر لعنت کرتا ہے (اپنی رحمت ان سے دور کرتا ہے) اور ان کے لیے اس نے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اگر پیغمبرؐ زندہ ہوتے تم نے انہیں اذیت دی ہوتی۔

اس حدیث کو ذھبی نے "تلخیص المستدرک" میں نقل کیا ہے اور واضح طور پر کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔[3] سیوطی نے بھی الدر المنثور میں ابن عباس سے مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔[4]

نیز مستدرک الصحیحین میں عمر بن شاس سے ایک مفصل حدیث منقول ہے اس کے آخر میں مذکورہ ہے: عمرو بن شاس بیان کرتے ہیں کہ میں نے مسجد نبوی میں علیؑ کے میرے ساتھ یمن کے سفر میں رویے کی شکایت کی۔ یہ بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کانوں تک پہنچی، صبح سویرے جب میں چند اصحاب کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا تو آنحضرتؐ نے میری طرف سخت نظروں سے دیکھا اور فرمایا: اللہ کی قسم اے عمر! تو نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں آپ کو تکلیف

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۹۷ (حدیث ۷۷۶)

[2] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۲۱ (مطبوعہ در المعرفۃ بیروت)

[3] تلخیص المستدرک جو کہ مستدرک الصحیحین کے حاشیہ پر چھپی ہے (جلد ۳ صفحہ ۱۲۲)

[4] الدر المنثور، ج۵، صفحہ ۲۲۰

پہنچاؤں۔'' آپؐ نے فرمایا: ہاں! جس نے علیؑ کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔'' (مَنْ آذی علیاً فَقَدْ آذانی) اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد حاکم نیشا پوری واضح طور پر کہتے ہیں یہ حدیث صحیح اور معتبر ہے۔[1]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ مختصر تاریخ دمشق کے مصنف نے مذکورہ حدیث کو چند اور احادیث کے ساتھ 'جابر' سعد بن ابی وقاص، عمرو بن شاس سے نقل کر کے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ کو تکلیف پہنچانا رسول اللہ کو تکلیف پہنچانا ہے۔[2]

احادیث کی یہ کثرت جن میں ایسی روایات بھی شامل ہیں جن کے صحیح اور معتبر ہونے کی گواہی اہل سنت کے علمانے صراحت کے ساتھ دی ہے، بڑے واضح طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ علیؑ جان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ان سے عقیدت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت ہے ان سے محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہے، ان کو اذیت پہنچانا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دینا ہے انہیں ستانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ستانے کے مترادف ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود کیا اس بات میں کوئی شک وتردید باقی رہ جاتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ تمام امت میں سب سے افضل اور برتر ہیں اور وہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت اور امامت وولایت کے بہترین حقدار ہیں؟

---

[1] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۲۲ (ذہبی کی تلخیص میں حدیث بعینہ ذکر ہوئی ہے)

[2] مختصر تاریخ دمشق: جلد ۱۷، صفحہ ۳۵۲

۲۳۔آیت انفاق

سورہ مبارکۂ بقرہ کی آیت ۲۷۴ میں ارشاد پروردگار ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

''جولوگ اپنا مال شب و روز، پوشیدہ اور اعلانیہ طور پر خرچ کرتے ہیں ان کا اجران کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ محزون ہوں گے۔''

بلا شک وشبہ اس آیت کا مفہوم کلی اور جامع ہے۔اس آیت میں مختلف طریقوں سے راہ خدا میں خرچ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔یعنی رات ہو یا دن، چھپ کر ہو یا ظاہر۔اور جو افراد خرچ کرتے ہیں ان کیلئے عظیم خوشخبری ہے کہ ان کا اجر وثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے اور انہیں گذشتہ پر کوئی غم اور افسوس نہیں ہوگا اور نہ اپنے مستقبل کا انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا۔

لیکن اسلامی روایات واحادیث یہ بتاتی ہیں کہ جن لوگوں کی اس آیت میں توصیف بیان ہوئی ہے ان کا کامل مصداق اور نمونہ حضرت علیؑ کی ذات ہے۔کیونکہ اس آیت کی شان نزول میں کئی ایسی روایات بیان ہوئی ہیں کہ جن کے مطابق یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی۔مثال کے طور پر ابن عباس کہتے ہیں: یہ آیت علی ابن ابی طالب (علیہما السلام) کے بارے میں نازل ہوئی کہ آپ کے پاس چار درہم تھے۔آپ نے ایک درہم رات کو خدا کی راہ میں خرچ کیا اور ایک درہم دن کو۔ایک درہم ظاہری طور پر اور ایک چھپ کر۔

رسولخدا ﷺ نے آپ سے پوچھا: ''مَا حَمَلَكَ عَلٰى هٰذَا''؟ یعنی (اے علی!) آپ کو کس چیز نے اس عمل پر آمادہ کیا؟ آپ نے جواب دیا: حَمَلَنِيْ عَلَيْهَا رَجَاءُ اَنْ اَسْتَوْجِبَ عَلَى اللهِ مَا وَعَدَنِي'' یعنی: یہ عمل میں نے اس لیے انجام دیا تاکہ اللہ تعالی نے مجھے جو وعدہ دیا ہے اس کا مستحق بن جاؤں۔'' رسولخدا ﷺ نے فرمایا: ''اَلَا ذٰلِكَ لَكَ'' یعنی: ''آگاہ رہو کہ تمہارے حق میں یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔اس موقعہ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں اس حدیث کو، اسی مضمون کی دیگر سات احادیث کے ہمراہ مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔[1] سیوطی نے اپنی تفسیر ''الدرّ المنثور''میں متعدد حوالوں سے اسی مطلب کو ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ان کے پاس چار درہم تھے، انہوں نے ایک درہم رات کو، ایک درہم دن کو، ایک درہم چھپ کر اور ایک درہم اعلانیہ طور پر راہ خدا میں خرچ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۱، ص ۱۰۹ تا ۱۱۵

[2] الدر المنثور جلد ۱، ص ۳۶۳

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انفاق کے حوالے سے حضرت علیؑ نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ہر وسیلہ استعمال کیا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ رات کو مختلف حالتوں میں (چھپ کر اور آشکارا) اور دن کو مختلف حالتوں میں (چھپ کر اور آشکارا) انفاق کیا۔ یہ ایثار اور انفاق جو اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی کو ہر طریقے سے حاصل کرنے کے شدید شوق سے مخلوط تھا، بارگاہ الہی میں قبول ہو گیا اور مذکورہ بالا آیت مجیدہ نازل ہو گئی۔

دیگر جن افراد نے مذکورہ بالا حدیث کو نقل کیا ہے ان میں سے محب الدین طبری نے ''ذخائر العقبیٰ'' میں [1]، سبط بن جوزی نے ''تذکرہ'' [2] میں، علامہ گنجی نے کفایۃ الطالب [3] میں، اور مشہور مفسر قرطبی نے اپنی تفسیر [4] میں اور ان کے علاوہ دیگر چند قابل ذکر افراد نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ عبارت بعینہ یا معمولی اختلاف کے ساتھ ذکر کی ہے۔

شبلنجی نے ''نور الابصار'' [5] میں اور شیخ سلیمان قندوزی نے بھی ''ینابیع المودۃ'' [6] میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ ''فضائل الخمسہ'' کے مصنف نے اس حدیث کو چند دیگر افراد سے نقل کیا ہے۔ جن میں یہ افراد شامل ہیں: اسد الغابہ [7] میں ابن اثیر، الصواعق المحرقہ [8] میں ابن حجر اور اسباب النزول [9] میں واحدی۔

ہم اس حدیث کو ابن ابی الحدید معتزلی کے ایک جملے پر ختم کرتے ہیں۔ وہ حضرت علیؑ کی اعلی صفات بیان کرتے ہوئے جب ان کے جود و سخا پر پہنچتا ہے تو سورہ ھل اتی کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے: ''وَرَوَى الْمُفَسِّرُونَ اَنَّهُ لَمْ يَمْلِكْ اِلَّا اَرْبَعَةَ دَرَاهِمَ، فَتَصَدَّقَ بِدِرْهَمٍ ...'' یعنی: ''مفسرین نے نقل کیا ہے کہ علیؑ کے پاس صرف چار درہم تھے۔ ان میں سے ایک درہم انہوں نے رات کو راہ خدا میں دے دیا، ایک دن میں خرچ کیا، ایک چھپ کر اور ایک اعلانیہ خرچ کیا۔ اس پر اللہ تعالی نے اس آیت کو ان کی فضیلت میں نازل کیا۔'' [10] [1] یہ عبارت بتاتی ہے کہ یہ مسئلہ مفسرین کے درمیان متفق علیہ یا کم از کم مشہور تھا۔

---

[1] ذخائر العقبیٰ، ص ۸۸

[2] تذکرۃ الخواص، ص ۱۷

[3] کفایۃ الطالب، ص ۱۰۸

[4] تفسیر قرطبی جلد ۲، ص ۱۱۱۵ (اسی آیت کے ذیل میں)

[5] نور الابصار، ص ۱۰۵

[6] ینابیع المودۃ، ص ۹۲

[7] اسد الغابہ، جلد ۴، ص ۲۵

[8] الصواعق المحرقۃ، ص ۷۸

[9] اسباب النزول، ص ۶۴ (فضائل الخمسہ، جلد ۱، ص ۲۱۳ اور ۳۲۲ کے نقل کے مطابق)

[10] [1] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۱ (ایک مقدمہ کے ضمن میں جو انہوں نے مولا علیؑ کی شرح حال میں لکھا ہے)

۲۴۔آیت محبت

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۴ میں ارشادربانی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اے ایمان والوتم میں سے جوبھی اپنے دین سے پلٹ جائے گا(وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا) توعنقریب اللہ ایک قوم کولے آئے گا جواس کی محبوب اوروہ اس سے محبت کرنے والی ہوگی مومنین کے سامنے خاکساراور کفار کے سامنے صاحب عزت راہ خدا میں جہاد کرنے والی اورکسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروانہ کرنے والی ہوگی یہ فضل خدا ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہےاوروہ صاحب وسعت اورعلیم ودانا ہے۔

یہ آیت واضح طور پر کہہ رہی ہے کہ تازہ مسلمانوں کی ایک جماعت کا اسلام سے پلٹ جانا، اسلام کی بنیاد کوکوئی نقصان نہیں پہنچا تا اللہ تعالی نے اہل ایمان کے ایک گروہ کو جو چند خصوصیات کا حامل ہے، دین مقدس کے دفاع کی ذمہ داری سونپی ہے وہ افراد جوخدا سے محبت کرتے ہیں اورخدا ان سے محبت کرتا ہے، وہ افراد جومومنین کے سامنے متواضع اورعاجزی کرنے والے ہیں اورکافروں اوراسلام کے دشمنوں کے مقابلے میں سخت اورشجاع ہیں۔ یہ افراد ہمیشہ راہ خدا میں برسر پیکار ہیں اورسرزنش کرنے والوں کی سرزنش سے ذرابرابر پریشان اورخوف زدہ نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان صفات کا کسی فرد یاافراد میں موجود ہونا فضل الٰہی ہےاور ہرشخص اسکا اہل نہیں ہے۔

بلاشک وشبہ اس آیت کامفہوم بھی گذشتہ بہت ساری آیات کی طرح وسیع ہے لیکن اہلسنت اورشیعہ حوالوں سے منقولہ روایات سے اچھی طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے اعلیٰ اوربہترین مصداق علیؑ ہیں۔فخررازی جب اس آیت کی تفسیر پرپہنچتے ہیں اوراس آیت پرتطبیق کے لیے مفسرین کے اقوال نقل کرتے ہوئے بحث کے آخر میں کہتے ہیں:''ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے''اوراپنے قول کے حق میں دودلیلوں سے استدلال کرتے ہیں۔ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جب خیبر کے دن رسول خداؐ نے علم علیؑ کودیا توفرمایا:

لَاَدْفَعَنَّ الرَّايَةَ غَدًا اِلٰى رَجُلٍ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

''کل میں علم اس مردکودوں گا جواللہ اوراس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اوراللہ اوراسکے رسول بھی اس سے محبت کرتے ہوں گے۔''

اس کے بعدوہ کہتے ہیں کہ یہ وہی صفت ہےجس کا مذکورہ بالا آیت میں ذکرہوا ہے۔اوران کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اسکے بعدوالی آیت

انّما وَلِیُّکُمُ اللہُ وَرَسُولُہُ .... ہے جو کہ علیؑ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا حق یہی بنتا ہے کہ ہم کہیں کہ پہلے والی آیت بھی علیؑ کی شان میں اتری ہے۔ (فخر رازی کی بات ختم ہوئی) [1]

فتح خیبر کے دن رسول خداؐ کے کلام سے فخر رازی کا استدلال کرنا اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے جو بہت ساری مشہور کتب میں حضرت علیؑ کے متعلق منقول ہے اور ان کے بہت بڑے فضائل میں شمار ہوتی ہے کیونکہ اس حدیث کے مطابق جب اسلامی لشکر کے کمانڈروں کو خیبر کو فتح کرنے میں پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تو رات کو پیغمبر اکرمؐ نے لشکر اسلام کے مرکز میں انہیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لَاُعْطِیَنّ الرایَۃَ غداً رجُلاً یُحِبُّ اللہَ وَ رَسُولَہُ وَ یُحِبُّہُ اللہَ و رَسُولُہُ کرّاراً غَیْرَ فَرارٍ، لایرجِعُ حَتیّٰ یَفْتَحَ اللہُ علیٰ یَدِہِ

خدا کی قسم کل میں علم اس مرد کے سپرد کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول بھی اسے چاہتے ہوں گے میدان میں جم کر لڑنے والا ہوگا اور ہرگز بھاگنے والا نہ ہوگا وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے گا جب تک اللہ اس کے ہاتھوں پر فتح نصیب نہیں کرے گا۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے پوچھا: علیؑ کہاں ہیں۔ جواب دیا گیا وہ بیمار ہیں اور انہیں آشوب چشم لاحق ہے (اور جنگ نہیں کر سکتے) فرمایا: انہیں بلایا جائے۔ علیؑ تشریف لائے تو پیغمبر اکرمؐ نے ان کی آنکھوں پر دم کیا اور دوسرے دن انہوں نے برق رفتاری سے حملہ کر کے خیبر فتح کرلیا (اور پیغمبر اکرمؐ کی ان کے بارے میں یہ عجیب پیش گوئی سچی ثابت ہوئی) اس حدیث کو فخر رازی کے علاوہ دیگر بہت سارے محدثین اور مورخین نے (تھوڑے بہت فرق کے ساتھ) اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے جیسے حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب المستدرک الصحیحین میں تین مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پہلے وہ ابن عباس سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ چند افراد نے اسکے سامنے علیؑ کے بارے میں نازیبا کلمات کہے وہ سخت غصے میں آئے اور کہا: تف ہے ان لوگوں پر جو اس شخص کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس میں بارہ سے زیادہ ایسی فضیلتیں موجود ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں پھر وہ علیؑ کے ایک ایک کر کے فضائل بیان کرتے ہیں اور ان میں سے سب سے پہلے یہی جنگ خیبر کا واقعہ تھا۔ [2]

دوسری حدیث وہ سعد بن ابی وقاص کے بیٹے عامر سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن معاویہ نے میرے والد سے کہا: تم علی ابن ابی طالبؑ پر سب وشتم کیوں نہیں کرتے ہو؟ میرے والد نے جواب دیا: میں جب بھی ان کے بارے میں رسول خداؐ کی تین باتوں کو یاد

---

[1] تفسیر کبیر، جلد ۱۲، صفحہ ۲۰

[2] المستدرک جلد ۳، صفحہ ۱۳۲۔

کرتا ہوں تو ان پر سب وشتم سے گریز کرتا ہوں ۔ یہ تین باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی میرے لیے ہوتی تو سرخ قیمتی اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب ہوتی ۔ معاویہ نے ان سے ان تین باتوں کے بارے میں پوچھا: سعد بن ابی وقاص نے سب سے پہلے حدیث کساء کے واقعے کو ذکر کیا ۔ پھر حدیث منزلت کو بیان کیا جو جنگ تبوک کے موقعہ پر بیان ہوئی تھی جس میں آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا تھا: ''اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هارُونَ مِنْ مُوْسیٰ ''۔ اور آخر میں اس نے جنگ خیبر کا حوالہ دیا جس میں رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

اُعْطِیَنَّ الرایَةَ غداً رجلاً یُحِبُّ اللهَ و یَفْتَحَ اللهُ عَلیٰ یَدِہِ۔

میں پرچم اس شخص کے سپرد کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت و دوستی رکھتا ہوگا اور اللہ اس کے ہاتھوں پر فتح نصیب فرمائے گا۔

پھر آنحضرتؐ نے علیؑ کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں اس کے بعد اپنے مبارک لعاب دہن سے انکی آنکھوں کو شفا دی اور پرچم ان کے حوالے کیا۔ میں جب بھی ان تین میں سے کسی حدیث کو یاد کرتا ہوں تو میں انہیں سب وشتم نہیں کرسکتا۔ خدا کی قسم معاویہ، چپ ہوگیا اور پھر ان سے کوئی بات نہ کی ۔ یہاں تک کہ وہ مدینے سے واپس چلا گیا۔ [1]

تیسری حدیث وہ عبداللہ بن بریدہ اسلمی سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے خیبر میں یہ جملہ فرمایا۔۔۔اس کے بعد مذکورہ واقعہ کو اضافے کیساتھ بیان کرتے ہیں ۔[2] جن افراد نے واضح طور پر کہا ہے کہ مذکورہ آیت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے ان میں سے ایک ثعلبی ہیں وہ اپنی تفسیر میں (مناقب عبداللہ الشافعی میں جو کچھ آیا ہے اس کی بنا پر) مذکورہ آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: ''اِنّها نَزَلَتْ فی عَلِی ''۔ یہ آیت علیؑ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ [3]

اسی طرح علامہ ثعلبی (کتاب العمدۃ میں ابن بطریق کے نقل کی بنا پر) اسی آیت کے ضمن میں تصریح کرتے ہیں کہ یہ علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [4] کنز العمال کے مصنف بھی اپنی کتاب میں سعد ابن ابی وقاص سے اسی حدیث کو نقل کرتے ہیں اور دوسری حدیث میں عامر بن سعد سے اسی مطلب کو کچھ اضافے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ [5]

یہ اور اس طرح کی دیگر احادیث جو کتب اہلسنت اور اہلسنت کی مشہور کتابوں میں منقول ہیں، ایک ایسی فضیلت کو بیان کرتی ہیں جو سعد بن ابی وقاص کے بقول بے مثل اور بے نظیر ہے اگر کسی کے پاس صرف یہی ایک فضیلت ہوتی تو اس کے فخر کے لیے یہی کافی تھی۔ اگر اس قسم کی بافضیلت شخصیت امت میں موجود ہو تو کیا اسکے ہوتے ہوئے رسول اللہؐ کے جانشینی اور خلافت کو کسی اور کے سپرد کرنا جائز ہے؟ کیا

---

[1] تلخیص المستدرک جو کہ مستدرک الصحیحین کے حاشیہ پر چھپی ہے (جلد ۳ صفحہ ۱۰۸،۱۰۹)

[2] المستدرک جلد ۳، صفحہ ۴۳۷

[3] مناقب، صفحہ ۱۶۰، مخطوطہ (احقاق الحق، جلد ۱۴، صفحہ ۲۴۸ کی نقل کی بنا پر)

[4] العمدۃ، صفحہ ۱۵۱ (احقاق الحق، جلد ۱۴، صفحہ ۲۴۸ کی نقل کی بنا پر)

[5] کنز العمال، جلد ۱۳، صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳ (حدیث ۳۶۴۹۵، ۳۶۴۹۶) مطبوعہ موسسہ الرسالۃ بیروت)

ایسا تصور کرنا ممکن ہے؟ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے جو مشہور کتب میں منقولہ روایات سے استفادہ ہوتا ہے اور جس کی تائید آیت مودت کرتی ہے کہ علیؑ نہ صرف اللہ اور اسکے رسول کے محبوب تھے بلکہ تمام مخلوقات میں سے ان کے نزدیک محبوب ترین فرد تھے۔

اس بات کی دلیل وہ حدیث ہے جو حدیث طیر کے نام سے مشہور ہے۔''**المستدرک علی الصحیحین**''میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے خادم حضرت انس آپؐ کے بعد لمبی عمر کرنے کے بعد بیمار پڑ گئے۔ محمد بن حجاج دیگر چند افراد کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے گئے ہر قسم کی باتیں ہونے لگیں، اتنے میں علیؑ کا اسم مبارک لیا گیا، حجاج کے بیٹے نے ان کے متعلق توہین آمیز جملے کہے۔ انس غصے میں آ گئے اور پوچھا یہ کون شخص ہے؟ اس نے کہا مجھے بٹھاؤ۔ اسے بٹھایا گیا۔ اس نے کہا:

''اے حجاج کے بیٹے! علی بن ابی طالبؑ کی کیوں برائی اور توہین کرتے ہو؟ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا: میں آنحضرتؐ کا خادم تھا (ہر روز انصار میں سے ایک جوان آنحضرتؐ کی خدمت کیا کرتا تھا) اس دن میری باری تھی ''ام ایمن'' آنحضرتؐ کے لیے ایک بھنا ہوا پرندہ لے کر آئیں اور آپؐ کے سامنے رکھ دیا۔ آنحضرتؐ نے پوچھا: ام ایمن اس پرندے کو کہاں سے لائی ہو؟ اس نے کہا میں نے خود اس پرندے کو شکار کیا ہے اور اسے آپؐ کے لیے بھون کر لائی ہوں۔ اس موقعہ پر رسول خداؐ نے دست دعا بلند کیے اور فرمایا:

اَللّٰهُمَّ جِئْنِي بِأَحَبِّ خَلْقِكَ إِلَيكَ وَإِلَيَّ يَأْكُلُ مَعِي مِنْ هٰذا الطَّيْرِ۔

اے اللہ! اپنی مخلوق میں سے اپنے اور میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب شخص کو میرے پاس بھیج جو میرے ساتھ اس پرندے کو تناول کرے۔

اسی وقت گھر کا دروازہ کھٹکھایا گیا۔ رسول خداؐ نے فرمایا! انس دیکھو دروازے پر کون ہے، میں نے دل میں کہا اے اللہ یہ انصار میں سے کوئی ہو (تاکہ یہ اعزاز انصار کے حصے میں آئے) لیکن جب نے دروازہ کھولا تو علی علیہ السلام دروازے پر موجود تھے، میں نے ان سے عرض کیا اس وقت رسول اللہؐ کسی کام میں مصروف ہیں۔ میں واپس آ گیا اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھوڑی دیر بعد دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی، رسول خداؐ نے فرمایا: انس جاؤ اور جو بھی دروازے پر ہو اسے اندر لے آؤ۔ اپنی قوم سے محبت کرنے والے تم پہلے فرد نہیں ہو، آنے والا انصاری نہیں ہے۔ میں گیا اور دروازہ کھولا انہیں اندر لے آیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اے انس! پرندے کو ان کے نزدیک کرو، میں نے اسے پیغمبر اکرمؐ اور علی علیہ السلام کے درمیان رکھا۔ دونوں نے اس پرندے کو تناول فرمایا۔''

حجاج کے بیٹے نے پوچھا۔ اے انس! تم خود موجود تھے اور تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ انس نے جواب دیا: ہاں۔ حجاج کے فرزند نے کہا میں اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی علیؑ پر اعتراض نہیں کروں گا اور اگر کسی اور کو ان کی برائی کرتے ہوئے دیکھا تو اس کا چہرہ بدصورت بنا دوں گا (اسے بے عزت کروں گا)[1]

---

[1] المستدرک علی الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۳۱ (مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

اسی حدیث کو ذھبی نے تلخیص المستدرک میں بیان کیا ہے جو مستدرک کے حاشیے پر لکھی گئی ہے۔ مذکورہ باتوں کے علاوہ یہ حدیث "حدیث طیر" کے عنوان سے تمام بڑی اسلامی کتب میں ذکر ہوئی ہے ان کتابوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ علامہ امینی مرحوم کہتے ہیں کہ حدیث طیر متواتر اور صحیح ہے اس کے تواتر اور صحت کے سامنے آئمہ حدیث خاضع ہیں۔ موفق بن احمد ایک بڑے فقیہ، محدث، قوی خطیب، ادیب اور شاعر تھے، اس نے اپنی کتاب میں اس حدیث کو بیان کیا ہے۔[1]

اس سے اہم محدث بزرگ ترمذی نے اپنی کتاب جو کہ صحیح ترمذی کے نام سے مشہور ہے، میں انس بن مالک سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس ایک بھنا ہوا پرندہ تھا آپؐ نے دعا کی:

اللّٰهمّ ائْتِنِي بِأَحِبِّ خَلْقِكَ إِلَيْكَ يَأْكُلُ مَعِيَ هَذَا الطَّيْرَ فَجَاءَ عَلِيٌّ فَأَكَلَ معهُ۔

اے اللہ! میرے پاس اپنی محبوب ترین ہستی کو بھیج جو میرے ساتھ اس پرندے کے کھانے میں شریک ہو

پس علیؑ تشریف لائے اور انہوں نے آنحضرتؐ کے ہمراہ پرندہ تناول کیا۔[2]

"کفایۃ الطالب" میں علامہ گنجی شافعی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: اس حدیث میں اس بات پر واضح دلالت موجود ہے کہ علیؑ خلق خدا میں سے محبوب ترین ہستی ہیں (پیغمبر اسلامؐ کے بعد) اور اس مطلب پر بہترین دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ کی دعا کو قبول فرمایا۔ بنابرایں درگاہ الٰہی میں تقرب کا بہترین وسیلہ علی بن ابی طالبؑ کی محبت ہے اور ان کی محبت ہے جو انہیں دوست رکھتے ہیں۔[3]

تیسری صدی ہجری کے عالم علامہ نسائی اپنی معروف کتاب خصائص میں اس حدیث کو کچھ اضافے کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔[4]

دیگر علمائے کرام جنہوں نے اس حدیث کو اپنی کتب میں نقل کیا ہے، ان میں سبط ابن جوزی نے تذکرہ میں، ابن اثیر نے اسد الغابہ میں، ابن مسعود شافعی نے مصابیح السنہ میں محب الدین طبری نے ذخائر العقبی میں، شیخ سلیمان بلخی قندوزی نے ینابیع المودۃ میں اور دیگر افراد نے جن کا ذکر طول پکڑ جائے گا، اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

ایک نکتہ شاید بعض افراد کے لیے حیرانی کا باعث ہو وہ یہ ہے کہ ابن اثیر حدیث طیر کو جب اپنی کتاب اسد الغابہ میں چند حوالوں سے نقل کرتے ہیں تو ان میں سے ایک حوالے سے انس بن مالک سے حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر آئے۔ انس نے انہیں واپس کر دیا پھر حضرت عثمان آئے۔ انس نے انہیں بھی واپس بھیج دیا (خصائص نسائی میں منقول ایک اور حدیث میں حضرت عثمان کی جگہ پر حضرت عمر کا نام ہے) اس کے بعد حضرت علیؑ آئے اور انہیں اس نے اندر آنے دیا۔ حدیث کے آخر میں ابن

---

[1] مناقب، صفحہ ۶۷

[2] صحیح ترمذی، جلد ۱۳، صفحہ ۱۷۰ (مطبوعہ الصادی مصر)

[3] کفایۃ الطالب، صفحہ ۵۹ (بحوالہ احقاق الحق، جلد ۵، صفحہ ۳۱۹)

[4] الخصائص، صفحہ ۵ (مطبوعہ تقدم مصر)

اثیر کہتے ہیں حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کا اس حدیث میں نام لینا واقعاً عجیب ہے۔[1]

اس سے بھی حیران کن بات تو یہ ہے کہ اہلسنت کے بہت سارے محدثین نے حضرت علیؑ کی اس بے نظیر فضیلت سے بڑی سادگی کے ساتھ گذرنا چاہا ہے اور حقائق سے چشم پوشی کی ہے۔ انہوں نے اس حدیث کی سند میں شک وتردید کا اظہار کیا ہے جیسا کہ البدایۃ والنھایۃ کے مصنف ابن کثیر دمشقی نے کیا ہے۔ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: "وَ فِي الْقَلْبِ مِنْ صِحَّةِ هٰذَا الْحَدِيثِ نَظَرٌ وَ إِنْ كَثُرَتْ طُرُقُهُ" یعنی: "میرے دل میں اس حدیث کے صحیح ہونے کے بارے میں شک ہے اگرچہ اس حدیث کے حوالے کثیر اور فراوان ہیں۔[2]

حالانکہ یہ حدیث بہت ساری مشہور کتب میں بطور متواتر اور وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے اور سند اور دلالت کے لحاظ سے اس میں کوئی مشکل نہیں ہے مگر یہ کہ پہلے سے بنائے ہوئے عقیدے کے برخلاف ہے۔ علامہ امینی مرحوم کا اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد ایک قابل توجہ جملہ ہے وہ کہتے ہیں اس حدیث میں صحت کی تمام شرائط کے پائے جانے کے باوجود کسی کے دل میں شک ہو تو اعتراض اس کے دل پر ہے نہ کہ اس حدیث پر۔

---

[1] اسد الغابہ، جلد ۴، صفحہ ۳۰ (مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

[2] البدایۃ والنھایۃ، صفحہ ۳۵۳)

۲۵۔آیت مسئولون

سورہ صافات کی آیت ۲۴ میں ظالموں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عذاب کے فرشتوں سے خطاب ہوگا کہ انہیں (ظالمین کو) روکو، ان سے باز پرس کی جانی ہے(وَ قِفُوهم اِنَّهُم مَسْئُولُون)لیکن سوال یہ ہے کہ ان سے کس چیز کا سوال کیا جائے گا؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ جو بدعتیں انہوں نے ایجاد کی ہوں گی، ان کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا،بعض نے کہا ہے کہ ان کے برے اعمال اور خطاؤں کے متعلق پوچھا جائے گا اور بعض نے اضافہ کیا ہے کہ توحید اور ''لا الہ الا اللہ'' کے بارے میں سوال ہوگا۔[1]

اور اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ تمام باتیں آیت کے مفہوم میں موجود ہوں۔لیکن متعدد روایات میں آیا ہے کہ اس سے مراد علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کا سوال ہے۔یہ روایات معروف اسلامی منابع میں منقول ہیں۔شواہد التنزیل میں دو حوالوں سے ابو سعید خدری پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

عن وَلايَةِ عَلِيّ بْنِ اَبي طالِبٍ۔

علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔[2]

دوسری حدیث میں سعید بن جبیر ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

اِذا كانَ يَوْمُ القِيامَةِ اُوقَفُ اَنا وَ عَلِيٌّ عَلَى الصِّراطِ فَما يَمُرُّ بِنا اَحَدٌ اِلاّ سَئَلْناهُ عَنْ وَلايَةِ عَلِيٍّ، فَمَنْ كانَتْ مَعَهُ، وَ اِلاّ اَلْقَيْناهُ فِي النّارِ! وَ ذلِكَ قَوْلُهُ: "وَقِفُوهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ"۔

جب قیامت کا دن ہوگا، میں اور علیؑ صراط پر کھڑے ہو جائیں گے جو بھی ہمارے پاس سے گزرے گا اس سے ولایت علیؑ کے بارے میں پوچھیں گے، جو ولایت رکھتا ہوگا (وہ پل صراط سے گزر جائیگا) ورنہ اسے جہنم میں ڈال دیں گے اور یہ ہے آیت:وَقِفُوهم اِنَّهُمْ مَسْئُولُون، کا مطلب۔[3]

حاکم حسکانی نے مذکورہ کتاب میں اس حدیث کو دوسرے ذریعے سے بھی نقل کیا ہے۔نیز ابن حجر نے اپنی کتاب صواعق میں

---

[1] مجمع البیان، جلد ۷، صفحہ ۴۴۱ (مذکورہ آیت کی تفسیر میں)

[2] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷ (حدیث ۷۸۶، ۷۸۷)

[3] ایضا، حدیث ۷۸۸

اس حدیث کوابوسعید خدری کے ذریعے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے۔[1]

مذکورہ حدیث کونقل کرنے والوں میں (اہلسنت کے چار اماموں میں ایک)احمد بن حنبل ہیں انہوں نے اپنی مسند میں اس حدیث کوابوسعید خدری سے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔عزّالدین حنبلی نے کشف الغمہ میں [2] آلوسی نے اپنی تفسیر میں [3] سبط بن جوزی نے تذکرہ میں [4] ابونعیم اصفہانی نے کفایۃ الخصام [5] میں، شیخ سلیمان قندوزی نے ینابیع المودۃ [6] میں اور دیگر بہت سے افراد نے اسے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان میں سے بعض روایات میں علیؑ کی ولایت کے علاوہ اہلبیت کی ولایت کا ذکر بھی آیا ہے۔[7]

یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ مندرجہ بالا تمام روایات اہلسنت کی معتبر اور مشہور کتب سے اور ان کے قابل اعتماد راویوں کے ذریعے نقل ہوئی ہیں اس کے باوجود آلوسی جب اس روایت کونقل کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ:" روی بعض الاماٰمیۃِ عَنِ ابْنِ جُبَیْرٍ عَنْ ابن عَباس یُسْئَلُونَ عَنْ ولایۃِ عَلِیّ"۔یعنی:بعض امامیہ نے ابن جبیر کے ذریعے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ علیؑ کی ولایت کے متعلق سوال ہوگا۔اسی طرح اس ولایت کو(امامیہ نے)ابوسعید خدری سے بھی بیان کیا ہے۔[8]

انتہائی تعجب کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس نے دوسرے خلفاء کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا گیا ہے۔یہ متعصب مفسر یہ خیال کرتا ہے کہ جو بھی حدیث علیؑ کے فضائل کے بارے میں ہو وہ قطعی طور پر شیعہ اور امامیہ راویوں کی ہوگی گویا مذہبی تعصب کی عینک سے اسے دکھائی نہیں دیتا یہ حدیث کس قدر وسیع پیمانے پر اہلسنت کی مشہور کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔گویا اسے یقین نہیں تھا کہ آئندہ آنے والے اس کے الفاظ کو پڑھیں گے اور اس پر اعتراض کریں گے کہ اس حدیث کے راوی امامیہ نہیں ہیں بلکہ ان کی اکثریت اہل سنت کے بڑے افراد ہیں۔

بہرصورت ان احادیث اور اسی طرح مذکورہ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قیامت کے دن صرف علی بن ابی طالب کی ولایت کا سوال ہوگا۔کیونکہ قیامت کا دن تو تمام کاموں،تمام نعمتوں اور تمام ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔اس سے مراد یہ ہے کہ اہم ترین چیزیں جن کے متعلق سوال ہوگا ان میں ایک ان کی ولایت ہے۔بلا شک یہاں پر ولایت کا مطلب عام اور معمولی دوستی

---

[1] الصواعق المحرقۃ،صفحہ ۸۹

[2] کشاف الغمہ،صفحہ ۹۲

[3] روح المعانی مذکورہ آیت کی تفسیر میں

[4] تذکرہ،صفحہ ۲۱۔

[5] کفایۃ الخصام،صفحہ ۳۶۱

[6] ینابیع المودۃ،صفحہ ۲۵۷۔

[7] علی فی الکتاب والسنۃ،جلد۱،صفحہ ۲۲۹۔

[8] روح المعانی،جلد ۲۳،صفحہ ۷۴۔

نہیں جسے ہر صاحب ایمان کو دوسروں کے بارے میں رکھنی چاہیے کیونکہ یہ چیز دین کے عام فروعات میں سے ہے اس سے مراد اس مسئلہ سے بڑھ کر کوئی اور چیز ہے ایسی چیز جو ارکان اسلام کے ہم پلہ اور برابر ہے۔

کیا یہ موضوع پیغمبر اکرمؐ کے بعد الٰہی رہبریت اور خلافت کے علاوہ کوئی اور ہوسکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ علی بن ابی طالبؑ وہ ذات ہیں جس کی ولایت اسلام کے اہم ترین ارکان اور ایمان کی اہم ترین شرائط میں سے ہے۔ یہ ان درجہ اوّل کے امور میں سے ہے جن کے متعلق قیامت کے دن پوچھا جائیگا۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ دشمنوں کی تمام تر عداوتوں کے باوجود جوانہوں نے ان کے حق میں روا رکھیں اور ان کے فضائل کو چھپایا (اور ابھی تک چھپا رہے ہیں) اور دوستوں نے خوف و ہراس سے ان کے فضائل کو مخفی رکھا، ان کے فضائل اور اعزازت سے احادیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور قرآن مجید کی آیات میں ان کی شخصیت درخشندہ ہے۔

اس گفتگو کا اختتام اس مشہور حدیث سے کرتے ہیں جو معتبر کتب میں ابن عباس سے نقل ہوئی ہے وہ کہتے ہیں:

ما نَزَلَ القُرانُ: "یاَاَیُّها الّذِین آمَنُوا" اِلاّ عَلِیٌّ سَیِّدُها و شَرِیْفُها وَ اَمِیْرُها وَ ما اَحَدٌ مِنْ اَصحابِ رَسُولِ اللهِ اِلاّ قَدْ عاتَبَهُ اللهُ فِی القُرآنِ ما خَلاَ عِلِیُّ بنَ اَبی طالِبٍ فَاِنَّهُ لَمْ یُعاتِبْهُ بِشَیْءٍ وَ ما نَزَلَ فِی اَحَدٍ مِنْ کِتابِ اللهِ ما نَزَلَ فِی عَلِیٍّ ..... نَزَلَتْ فِی عَلِیٍّ ثَلاثَمِأةُ آیةٍ

قرآن مجید میں جہاں بھی ''یاایھا الذین آمنوا'' کے الفاظ آئے ہیں، علیؑ ان کے سرداران سب سے شریف اور ان کے امیر ہیں (یعنی اتم اور اکمل مصداق علیؑ ہیں) رسول خداؐ کا کوئی صحابی ایسا نہیں ہے جس کی قرآن نے سرزنش نہ کی ہو سوائے علی بن ابی طالبؑ کے، اللہ تعالیٰ نے کسی چیز میں بھی ان کی سرزنش نہیں فرمائی ہے۔۔۔ قرآن مجید میں جتنے فضائل اور مدائح علیؑ کے بیان ہوئے ہیں اتنے کسی اور کے نازل نہیں ہوئے۔۔۔ قرآن مجید کی تین سو آیات علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔[1]

اس حدیث (بالخصوص اس کا پہلا حصہ) کو بہت سارے راویوں نے نقل کیا ہے۔ جیسے حافظ ابونعیم اصفہانی نے اسے حلیۃ الاولیاء میں، محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ میں، علامہ گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب میں، سبط بن جوزی نے تذکرہ میں، شبلنجی نے نور الابصار میں، ہیثمی نے صواعق میں، سیوطی نے تاریخ الخلفاء اور قندوزی نے ینابیع المودۃ میں ذکر کیا ہے۔[2]

یہ تھیں قرآن کی بعض آیات جو علیؑ کے بارے میں قرآن مجید میں نازل ہوئی ہیں ہم نے ان میں سے بعض کا انتخاب کر کے گلدستہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

---

[1] مختصر تاریخ دمشق: جلد ۱۸، صفحہ ۱۱، مطبوعی دار الفکر

[2] مزید معلومات کے لیے احقاق الحق: جلد ۳، صفحہ ۴۷۶ کا مطالعہ کریں

بارہ امام

اشارہ

اگرچہ مذہب شیعہ ''امامیہ اثنا عشریہ'' میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے فرقے بھی موجود ہیں جیسے زیدیہ جو صرف چار اماموں کو مانتے ہیں اور اسماعیلیہ جو کہ سات اماموں پر عقیدہ رکھتے ہیں۔لیکن ان میں سے مشہور ومعروف بارہ امامی شیعہ ہیں جو پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک حصہ ہیں بعض ممالک جیسے ایران، عراق اور بحرین میں ان کی بھاری اکثریت ہے۔ان کے علاوہ دیگر اسلامی ملکوں میں بھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔شیعہ اثنا عشریہ کے بڑے بڑے علمی مراکز ہیں جن میں ہزاروں علماء اور طلباء تحقیق، تدریس اور اسلامی علوم کے حصول میں مصروف ہیں۔شیعہ علماء کی طرف سے ہزاروں کتابیں عقائد اسلامی، فقہ اصول، تفسیر، حدیث، فلسفہ، رجال، درایہ اور تاریخ اسلام کے بارے میں تالیف وتصنیف ہوکر طباعت کے بعد منظر عام پر آئی ہیں۔

عالیقدر محقق مرحوم ''شیخ آقا بزرگ تہرانی'' کی کتاب ''الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ'' جو حال میں ۲۶ جلدوں میں چھپی ہے، اس کتاب میں انہوں نے شیعہ علماء کی ہزاروں کتب کے نام، ان کے مصنفین کے نام کے ساتھ ذکر کیے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بیان کی ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیعہ علماء اور دانشوروں نے اسلامی علوم کی کس قدر خدمت کی ہے اور کس طرح تمام فنون اسلامی اور بشری علوم میں اہم اور گرانمایہ کتب یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ وہ افراد جو ان حقائق کو نہیں مانتے وہ دنیا کے مختلف علاقوں میں شیعوں کے علمی مراکز کا دورہ کریں ان کے علماء وفضلا اور طلاب کو قریب سے دیکھیں جو مختلف اسلامی علوم میں مہارت رکھتے ہیں ان کے کتابخانوں اور لائبیریوں کا مطالعاتی دورہ کریں جو شیعہ علماء کی علمی کتب اور اسی طرح اہلسنت کے علماء کی علمی کتب سے بھری پڑی ہیں۔ان کے فقہا، متکلمین، مفسرین قرآن، توانا ادباء، اہل بیت قوی خطباء اور قرآن کے حافظوں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، کا نزدیک سے مشاہدہ کریں۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسلامی خبر رساں ذرائع پر سخت سنسر اور اکثر اسلامی کتابخانوں پر پابندیوں کی وجہ ابھی تک اہلسنت کے غیر جانبدار محققین کو موقعہ نہیں ملا کہ وہ مکتب اہلبیت کے پیروکاروں، ان کے علماء اور ان کی علمی کتب سے آگاہ ہوسکیں۔ ہمارے ہاں لائبیریریاں اور کتابخانے شیعہ علماء کی کتب کے ساتھ ساتھ سنی علماء کی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں اور کتابوں کی موجودگی کے حوالے سے شیعہ اور سنی کی کوئی تمیز اور فرق نہیں ہے اور اس لحاظ سے کوئی بھی اپنے مذہب کے بارے میں خطرہ محسوس نہیں کرتا لیکن برادران اہلسنت کے کتابخانوں اور لائبیریریوں کی صورتحال کچھ اور منظر پیش کرتی ہے وہاں شیعہ علماء کی ہزاروں مشہور علمی کتب کا نام ونشان نہیں ہے اگر ہیں تو بہت ہی تھوڑی تعداد میں۔

بہرحال ہم امید کرتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئے جب محققین تمام تعصّبات سے بالاتر ہوکر، غیر جانبداری کے ساتھ مذکورہ

مطالب کی تحقیق اور چھان بین کریں اور شیعوں کو اس طرح پہچانیں جس طرح وہ ہیں نہ کہ اسطرح جو ان کے دشمن کہتے ہیں اور نہ ہی استعماری پروپیگنڈے کی روشنی میں، یقینا اس دن اسلامی دنیا کا رویہ مکتب اہلبیت کے پیروکاروں کے ساتھ تبدیل ہوجائے گا، اسلامی دنیا میں سمجھنے سمجھانے کی نئی فضا قائم ہوگی، فکر ونظر کے نئے دریچے کھلیں گے اور ہم آہنگی کا بہتر ماحول وجود میں آئے گا۔

ہم اصل موضوع سے ہٹ نہ جائیں، قرآن کی آیات میں اہلبیت کے معصوم اماموں کی طرف اشارے موجود ہیں۔ معتبر اسلامی کتب میں ان آیات کی تفسیر میں منقولہ روایات کی مدد سے یہ اشارے آشکار اور زیادہ واضح ہوجاتے ہیں۔

ایسی آیات متعدد ہیں یہاں پر بعض آیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے البتہ ان میں سے بعض آیات کا ذکر علی علیہ السلام کی امامت وولایت کے موضوع میں گزر چکا ہے۔ مثلاً

۱۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (احزاب / ۳۳)

اس آیت کا مفہوم عام ہونے پر شاہد ہے اسی طرح اس کی تفسیر وتشریح میں رسول اکرمؐ سے جو احادیث بیان ہوئی ہیں ان کے مطابق بھی اس آیت کا مفہوم عمومی ہے۔ یعنی یہ آیت حضرت علیؑ کے علاوہ باقی اماموں کو بھی شامل ہے بالخصوص امام حسنؑ اور امام حسینؑ جن کا نام ان روایات میں واضح طور پر موجود ہے۔

۲۔ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ (شوریٰ / ۲۳)

یہ آیت بھی اجمالی طور پر تمام اماموں کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ سعید بن جبیر اور ابن عباس کے ذریعے رسول خداؐ سے منقولہ متعدد روایات میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اس آیت میں "قربیٰ" سے مراد علیؑ فاطمہؑ اور ان کے بیٹے ہیں اور بعض میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ناموں کی تصریح موجود ہے۔ مزید وضاحت کے لیے شواہد التنزیل اور دیگر کتب کا مطالعہ کیا جائے جن کا تذکرہ اس آیت کی تشریح کے موقع پر کیا گیا ہے۔[1]

۳۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (نساء / ۵۹)

یہ بھی اسی طرح ہے کیونکہ اس آیت کا مفہوم بھی عام ہے اور ہر دور کو شامل ہے بناء برایں ہر دور اور ہر عصر میں "اولوالامر" کا مصداق ہونا چاہیے ایک ایسا فرد جو گناہ سے پاک اور معصوم ہو (کیونکہ بلا قید وشرط اور مطلق اطاعت معصوم کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے) علاوہ ازیں اہلسنت کی کتب میں مذکورہ بعض روایات میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے نام ذکر ہوئے ہیں۔

۴۔ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (توبہ / ۱۱۹)

جیسا کہ گزر چکا ہے کہ اس آیت کا مفہوم بھی عام ہے اور ہر دور اور زمانے کو شامل ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر دور اور زمانے میں ایک صادق معصوم موجود ہے۔ (کیونکہ بلا قید وشرط اور مطلق پیروی اور ہمراہی کا حکم معصومین کے علاوہ کسی اور کیلئے نہیں ہوسکتا)

---

[1] شواہد التنزیل میں مختلف طرق سے چھ روایتیں اس بارے میں بیان ہوتی ہیں (جلد ۲، صفحہ ۱۳۰ سے ۱۳۴ تک)

علاوہ ازیں اس آیت کی تشریح میں منقولہ روایات میں صادقین کی تفسیر محمدؐ اور اہلبیت محمدؐ سے کی گئی ہے۔[1]

چونکہ یہ آیات اور ان سے متعلق روایات کا ذکر ان ابحاث کے آغاز میں تفصیل سے ہو چکا ہے لہٰذا ان کا دوبارہ ذکر نہیں کرتے بلکہ فضیلت والی آیات کو بیان کرتے ہیں۔ ہم دوبارہ تاکید کرتے ہیں کہ آیات فضیلت کو ہم اس عنوان سے بیان نہیں کر رہے کہ یہ آئمہ اہلبیت کی امامت وولایت پر براہ راست دلالت کرتی ہیں۔ بلکہ ان کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ واضح کیا جائے کہ ان میں سے ہر فرد اپنے زمانے کے بہترین اور اعلیٰ ترین افراد تھے۔ اور چونکہ گزشتہ آیات کے مطابق ہر دور اور زمانے میں اولوالامر اور امام معصوم کا ہونا ضروری ہے، لہٰذا یہ معصوم ہستیاں اس مطلب کا مصداق ہیں۔

ا۔ آیت صلوٰات ودرود

سورہ احزاب کی آیت نمبر ۵۶ میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی درود وسلام بھیجو اور اس کے حکم پر سر تسلیم خم کردو۔

اس آیت میں پیغمبر اسلام کے مقام ومرتبے کو اعلیٰ ترین صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بھی اور اس کے مقرب فرشتے بھی نبی اکرمؐ پر درود بھیجتے ہیں اور بلا استثناء تمام مومنین کو بھی حکم دیا گیا ہے وہ بھی ان پر سلام و درود اور رحمت بھیجیں۔ اس سے بڑھ کر اور مرتبہ کیا ہوگا؟ اور اس سے زیادہ اور عظمت کیا ہوگی؟ یہ بات صحیح ہے کہ اس آیت میں آل رسولؐ کا ذکر نہیں ہوا لیکن بہت ساری روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب اصحاب نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ آپ پر ہم کس طرح درود وسلام بھیجیں تو نبی اکرمؐ نے اپنے ساتھ ''آل'' کا بھی ذکر کیا اور تمام درود اور رحمت جو آپ پر بھیجی جاتی ہے وہ آپؐ کی آل پر بھی بھیجی جائے۔

یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کا درود وسلام بھی عمومیت رکھتا ہے۔ پیغمبر اکرم کو بھی شامل ہے اور آپ کی آل کو بھی شامل ہے۔ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد ان کا ہی مقام ومرتبہ ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی ذمہ داریوں کی طرح ان کی بھی ذمہ داریاں ہیں بصورت دیگر یہ اعلیٰ مقام ومرتبہ صرف رشتہ داری کی وجہ سے ممکن نہیں۔

اب ہم ان میں سے بعض روایات کا ذکر کرتے ہیں جو اہلسنت کی کتب میں نقل ہوئی ہیں:

ا۔ صحیح بخاری میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ اے رسول خدا! آپؐ پر سلام ہمیں معلوم ہے آپ پر کس طرح صلوات بھیجیں یہ ہمیں بتائیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

قُولُوا اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ رَسُوْلِكَ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ آلِ

[1] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۲۶۲۔

اِبرَاهِیمَ و بَارِكْ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ عَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ کما بارَکتَ عَلیٰ اِبرَاهِیمَ ۔[1]

کہواے اللہ اپنے بندے اور رسول محمدؐ پر درود بھیج جس طرح تونے ابراھیم اور آل ابراھیم پر درود بھیجا ہے، محمد وآل محمد پر برکتیں نازل فرما جس طرح تونے ابراہیم پر برکتیں نازل فرمائیں۔

مذکورہ کتاب کے اسی صفحہ پر یہ حدیث مکمل طور پر کعب بن عجرہ (صحابی رسولؐ) سے نقل ہوئی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خداؐ سے عرض کیا گیا کہ ہم آپ پر سلام کرنا تو جانتے ہیں لیکن آپ پر صلوات بھیجنا نہیں جانتے ہم کس طرح آپ پر درود بھیجیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: کہو!

اللّٰھُمَّ صَلِّ علی مُحَمَّدٍ کمَا صَلَّیتَ عَلیٰ اِبرَاهِیمَ وَ آلِ اِبرَاهِیمَ و بَارِكْ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ عَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ کما بارَکتَ عَلیٰ اِبرَاهِیمَ فی العالمین اِنَّكَ حمیدٌ مَجِیدٌ۔[2]

توجہ رہے کہ امام بخاری نے ان احادیث کو آیت مجیدہ "ان اللہ وملائکتہ۔۔۔" کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

۲۔صحیح مسلم، برادران اہلسنت کا حدیث کا دوسرا بڑا منبع ہے، اس میں ابومسعود انصاری سے منقول ہے کہ پیغمبراکرمؐ ہمارے پاس تشریف لائے اس وقت ہم سعد بن عبادہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، سعد کے بیٹے بشیر نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے ہم کس طرح آپؐ پر صلوات بھیجیں؟ رسول خداؐ پہلے تو خاموش رہے پھر فرمایا: اس طرح کہو

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وَ عَلی آلِ مُحَمَّدٍ کما صَلَّیتَ عَلی آلِ اِبرَاهِیمَ بارِكْ عَلی مُحَمَّدٍ وَ عَلی آل مُحَمَّدٍ کما بَارَکتَ عَلی آلِ اِبرَاهِیمَ فی العالَمینَ اِنَّكَ حمیدٌ مَجِیدٌ۔[3]

۳۔تفسیر الدرالمنثور، روائی تفسیروں میں سے مشہور ترین تفسیر ہے۔ اس میں ابوسعید خدری والی حدیث کو بخاری، نسائی، ابن ماجہ اور ابن مردویہ کے ذریعے سے رسول خداؐ سے نقل کیا ہے۔[4] اسی کتاب میں ابومسعود انصاری کے الفاظ کو ترمذی، نسائی اور ابن مردویہ سے نقل کیا ہے۔[5] بالکل اسی مطلب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ سیوطی نے مالک، احمد، بخاری مسلم، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ اور ابن مردویہ کے ذریعے ابواحمد ساعدی سے بھی بیان کیا ہے۔[6]

---

[1] صحیح بخاری، جلد۶، صفحہ ۱۵۱ (مطبوعہ دارالجیل بیروت

[2] ایضا

[3] صحیح مسلم، جلد۱، صفحہ ۳۰۵، حدیث ۶۵ (مطبوعہ احیاء تراث العربی، بیروت)

[4] الدرالمنثور، جلد۵، صفحہ ۲۱۷

[5] ایضا۔

[6] ایضا۔

حاکم نیشاپوری"المستدرک علی الصحیحین" میں ابن ابی لیلی سے نقل کرتے ہیں کہ "کعب بن عجز" نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا: کیا میں تمہیں تحفہ نہ دوں جو میں نے رسول خداؐ سے سنا ہے؟ میں نے جواب میں کہا تحفہ دو! اس نے کہا ہم نے رسول خداؐ سے پوچھا: ہم کس طرح آپ اہلبیت پر صلوات بھیجیں؟ آپ نے فرمایا: یوں کہو:

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ عَلیٰ آل مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلیٰ اِبْرَاھِیْمَ و عَلیٰ آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حمیدٌ مَجِیْدٌ: اللّٰھم بارِکْ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ عَلیٰ آل مُحَمَّدٍ کما بارَکْتَ عَلیٰ اِبْرَاھِیْمَ و عَلیٰ آلِ ابراھیمَ اِنَّکَ حمیدٌ مَجِیْدٌ۔

حاکم نیشاری کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ ان احادیث کو ذکر کرتے ہیں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نہیں ہیں۔ مذکورہ حدیث کو ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: اس حدیث کو اسی سند اور انہی الفاظ کے ساتھ امام بخاری نے اپنی کتاب میں "موسیٰ بن اسماعیل" سے بیان کیا ہے۔ اگر یہاں پر میں نے اسے مکرر نقل کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ "اہل بیت" اور "آل" سب ایک ہی ہیں۔ (توجہ رہے کہ حاکم نے اس حدیث کو حدیث کساء کے بعد نقل کیا ہے جس میں تصریح ہوئی ہے کہ میرے اہلبیت علیؑ، فاطمہؑ حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ [1]

یہ الفاظ پر معنی ہیں۔ اس کے بعد حاکم حدیث ثقلین اور اس کے بعد ابوھریرہ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کی طرف دیکھا اور فرمایا: "اَنَا حَرْبٌ لِمَنْ حَارَبَکُمْ وَ سِلْمٌ لِمَنْ سَالَمَکُمْ۔" یعنی: جو تمہارے ساتھ جنگ کرے میرا بھی اس سے اعلان جنگ ہے اور جو تمہارے ساتھ صلح کرے میری بھی اس سے صلح ہے۔ [2]

نیز "محمد بن جریر طبری" نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کی تشریح میں مذکورہ بالا روایت کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ "موسیٰ بن طلحہ" کے ذریعے ان کے باپ سے نقل کیا ہے، ایک اور روایت میں اسی بات کو ابن عباس سے بیان کیا ہے۔ تیسری روایت کو "زیاد" کے ذریعے ابراہیم سے بیان کیا ہے اور چوتھی روایت کو عبدالرحمن بن بشر بن مسعود انصاری سے نقل کیا ہے۔ [3]

نیز بیہقی نے اپنی مشہور کتاب " سنن" میں اس موضوع پر متعدد روایات نقل کی ہیں ان میں بعض نماز اور تشہد کے موقعہ پر مسلمانوں کے فریضے کو واضح کرتی ہیں۔ انہی میں ایک حدیث ابی مسعود، عقبہ بن عمرو سے منقول ہے کہ ایک شخص رسول خداؐ کی خدمت میں آیا اور بیٹھ گیا، ہم بھی اس کے پاس تھے، اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم آپؐ پر سلام بھیجنے کی کیفیت کو جانتے ہیں، لیکن نماز کے دوران آپؐ پر کس طرح صلوات پڑھیں؟ پیغمبر اکرمؐ نے سکوت اختیار کیا یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ کاش یہ شخص سوال ہی نہ کرتا۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

---

[1] المستدرک علی الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۴۸۔

[2] ایضاً صفحہ ۱۴۹۔

[3] تفسیر جامع البیان (طبری) جلد ۲۲، صفحہ ۳۲ (مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت)

اِذا اَنْتُمْ صَلّیْتُم عَلَیَّ فَقُولُوا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ النَّبیّ الاُمِیّ وَ عَلی آلِ مُحَمَّدٍ کما صَلَّیْتَ عَلی اِبْراھِیْمَ وَ عَلی آلِ اِبْرَاھِیْمَ وَبَارِكْ عَلی مُحَمَّدٍ النبیّ الاُمِیّ و عَلی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلی اِبْرَاھِیْمَ و عَلی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حمیدٌ مَجِیْدٌ

اس کے بعد وہ ابوعبداللہ شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے جو نماز میں پیغمبر اکرم ﷺ پر صلوات بھیجنے کی بات کرتی ہے۔[1]

بیہقی نے دیگر متعدد احادیث رسول خدا ﷺ پر صلوات بھیجنے کے متعلق خواہ نماز میں یا نماز کے علاوہ بیان کی ہیں، خصوصاً وہ ایک حدیث میں کعب بن عجرہ سے پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ: اِنَّہ کانَ یَقُولُ فِی الصَّلوٰۃِ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ و آلِ مُحَمَّدٍ کما صَلَّیْتَ عَلی اِبْراھِیْمَ وَ آلِ اِبْرَاھِیْمَ، وبَارِكْ عَلی مُحَمَّدٍ و آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلی اِبْرَاھِیْمَ و آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّكَ حمیدٌ مَجِیْدٌ۔ پیغمبر اکرم ﷺ اپنی نماز میں یوں فرماتے تھے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وآلِ مُحَمَّدٍ، کما صَلَّیْتَ.....[2]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ اپنی نمازوں میں یہی صلوات پڑھتے تھے انہی روایات میں سے کسی ایک کے ضمن میں، جس میں نماز کا ذکر نہیں آیا ہے۔ بیہقی کہتے ہیں: یہ روایات بھی حالت نماز کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیونکہ ''قَدْ عَلِمْنَا کَیْفَ نُسَلِّمُ'' (ہم جانتے ہیں کس طرح آپ پر سلام بھیجیں) کا جملہ تشہد میں سلام کی طرف اشارہ ہے۔ السَّلام علیك اَیُّھَا النَّبِیُّ و رحمۃ اللہ وَ بَرَکَاتُہ، اس بنا پر صلوات سے مراد بھی تشہد میں صلوات بھیجنا ہے۔

اس لحاظ سے تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ جس تمام مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق نماز کے پیغمبر اکرمؐ پر ''السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ'' کی شکل میں سلام بھیجیں اسی طرح ان پر فرض ہے کہ نماز کے تشہد میں نبی اکرمؐ پر صلوات بھی بھیجیں۔ اگرچہ یہاں پر اہلسنت کے چار مذاہب کے درمیان کچھ فرق دکھائی دیتا ہے شافعیوں اور حنبلیوں کا کہنا ہے کہ رسول اللہؐ پر صلوات دوسرے تشہد میں بھیجنا واجب ہے جبکہ مالکی اور حنفی اسے سنت سمجھتے ہیں۔[3]

البتہ مندرجہ بالا روایات کے مطابق تو سب پر واجب ہے۔ محمد وآل محمد پر صلوات سے (بطور مطلق یا خصوصا نماز کی تشہد میں) سے متعلق منقولہ روایات پر مشتمل کتابوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جو یہاں پر بطور مختصر بیان ہوئی ہیں مذکورہ بالا روایات اور کتب تو اس کا ایک نمونہ ہے ان روایات کو صحابہ کی جماعت نے نقل کیا ہے جن میں ابن عباس، طلحہ، ابوسعید خدری، ابوہریرہ، ابومسعود انصاری، بریدہ، ابن مسعود، کعب بن عجرہ اور خود علیؑ جیسی شخصیات شامل ہیں۔

---

[1] سنن بیہقی، جلد ۲، صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷

[2] ایضا۔

[3] الفقہ علی المذاھب الاربعہ، جلد ا، صفحہ ۲۶۶ (مطبوعہ دار الفکر)

قابل تعجب نکتہ یہ ہے کہ اہلسنت کے علماء ان تمام تاکیدات کے باوجود جو احادیث نبویؐ میں آل محمدؐ کے اضافے کرنے کے بارے میں آئی ہیں، ہمیشہ (نادر مواقع کے علاوہ) آل محمدؐ کو درود سے حذف کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں صلّی اللہ علیہ و سلّم اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حدیث کی کتب میں ان ابواب میں جہاں درود میں آل محمدؐ کا اضافہ کرنے کی روایات نقل ہوئی ہیں جب پیغمبر اکرمؐ کا اسم مبارک انہی احادیث کے ضمن میں ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں صلّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلّم۔ (یعنی آل کے بغیر) ہم نہیں جانتے کہ رسول اللہؐ کی بارگاہ میں آنحضرتؐ کے اس حکم کی واضح مخالفت پر ان کے پاس کیا عذر ہے؟

مثال کے طور پر بیہقی اسی باب کے عنوان میں لکھتے ہیں ."باب الصّلوۃِ عَلَی النّبیّ صلّی اللہ علیہ وَسَلّم فِي التشھدِ"۔ اور اسی طرح بعض دوسری مشہور کتب حدیث میں ہے۔ اس عنوان کو خواہ مولفین نے اختیار کیا ہو یا بعد والے محققین نے، اس باب میں جو مذکورہ ہے اس سے بہت سا تضاد رکھتا ہے اور بہت ہی عجیب ہے۔ آخر میں دو احادیث اور بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ ابن حجر اپنی کتاب صواعق میں یوں نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا تُصَلُّوا عَلَيَّ الصَّلاۃ اَلْبَتراءُ، قالُو وما الصَّلاۃُ البَتْرُ قالَ: تقولُون: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ و تُمْسِکُونَ، بل قُولُوا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ و آلِ مُحَمَّدٍ۔

مجھ پر ناقص اور دم بریدہ صلوات مت بھیجو۔ پوچھا گیا: ناقص اور دم بریدہ صلوات کونسی ہے؟ فرمایا: یوں کہو: "اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ' اور پھر رک جاؤ اور آگے نہ بڑھو۔ بلکہ صلوات اس طرح پڑھو: "اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ"[1]

اس حدیث سے ثابت ہوتا کہ لفظ علیٰ بھی محمد اور آل محمد کے درمیان فاصلہ نہ بنے۔ اور یوں کہا جائے: اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

۲۔ سمھودی اپنی کتاب "الاشرافُ علی فَضْلِ الاَشْرافِ" میں ابن مسعود انصاری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا: "مَنْ صَلّی صَلاۃً لَمْ یُصَلِّ فِیہا عَلَيَّ و عَلی اَھْلَ بَیْتِي لَمْ تُقْبَل" یعنی: جو شخص نماز پڑھے لیکن اس میں مجھ پر اور میرے اہل بیت پر صلوات نہ بھیجے تو اس کی نماز قبول نہیں ہے۔[2]

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ امام شافعی نے اپنے مشہور شعر اسی روایت کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں:

یا اَھْلَ بَیْتَ رَسُوْلِ اللهِ حُبُّکُمْ
فَرْضٌ مِنَ اللهِ فِي القُرآنِ اَنْزَلَهُ

---

[1] صواعق، صفحہ ۱۴۴۔

[2] سمھودی درالاشراف صفحہ ۲۸ (احقاق الحق، جلد ۱۸، صفحہ ۳۱۰ کے مطابق)

كَفاكُمْ مِنْ عظيم القَدْرِ اَنَّكُمْ
مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لا صَلاةَ لَهُ

اے رسول اللہ کے اہلبیت تمہاری محبت قرآن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب قرار دی گئی ہے۔
تمہارے عظیم مقام ومنزلت کیلئے اتنا کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ بھیجے اس کی نماز باطل ہے۔[1]

کیا وہ شخصیات جن کا مقام ومرتبہ یہ ہو کہ ان کا نام نماز میں پیغمبر اکرمؐ کے نام کے ساتھ لینا واجب ہو، انہیں دوسروں کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی موجودگی میں امامت وولایت اور رسول خداؐ کی خلافت اور جانشینی کے لیے کوئی اور اہل ہو سکتا ہے یا اس کی جگہ بنتی ہے؟ کون منصف اس مقام ومرتبے اور فضیلت کے ہوتے ہوئے دوسروں کو ان پر ترجیح دے گا؟ کیا یہ تمام دلائل مسئلہ ولایت اور خلافت کو بلا واسطہ ثابت نہیں کرتے؟ فیصلہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔

۲۔آیت نور اور بیوت

سورہ نور میں آیت "اللہ نور السماوات و الارض" کے بعد ۳۶ سے ۳۸ آیات میں ارشاد الٰہی ہے:

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

یہ نور الٰہی ان گھروں میں ہے جن کے بارے میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی دیواروں کو اونچا کیا جائے (تاکہ وہ شیاطین کی مداخلت سے محفوظ رہیں) اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے کہ ان گھروں میں صبح وشام اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔ وہ مرد جنہیں کاروبار یا دیگر خرید وفروخت ذکر خدا، قیام نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر سکتی؛ یہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن کے ہول سے دل اور نگائیں سب الٹ جائیں گی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے سکے اور اپنے فضل سے مزید اضافہ کرے اور خدا جسے چاہتا ہے رزق بے حساب عطا کرتا ہے۔ (اور اپنے بے انتہا نعمتوں سے بہرہ مند کرتا ہے۔)

اس سورت کی آیت نمبر ۳۵ میں نور الٰہی کی اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبصورت، دقیق اور ظریف مثال کے ساتھ وضاحت کرنے کے بعد، مذکورہ آیات میں اس نور کی جگہ اور مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا: یہ نور درج ذیل خصوصیات کے حامل گھروں میں ہے۔

[1] کتاب الغدیر میں امام شافعی سے ان اشعار کے انتساب کو "شرح المواہب رزقانی" جلد ۷، صفحہ ۷ اور کچھ افراد سے نقل کیا ہے۔

۱۔اونچی اور غیر قابل نفوذ دیواریں تاکہ شیطانوں اور ہوا وہوس کے بچاریوں کی دسترس سے محفوظ رہیں۔

۲۔ان کی حفاظت اور پاسداری ایسے مرد کرتے ہیں جن کا وطیرہ یاد الٰہی اور صبح وشام اس کی تسبیح ہے۔دنیا کی رنگینیاں اور زرق برق مادی اشیاء انہیں یاد خدا سے غافل نہیں کرتیں، وہ ایسے افراد ہیں جن کا اپنے رب سے دائمی رابطہ بذریعہ نماز اور مخلوق خدا سے دائمی رابطہ بذریعہ زکوٰۃ برقرار ہے۔وہ ایسے مرد ہیں جو قیامت اور اعمال کے حساب وکتاب سے ڈرتے ہیں اور یہ امید سے آمیختہ خوف ہمیشہ انہیں حق کے راستے پر ثابت قدم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے افراد کو بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔

مندرجہ بالا الفاظ میں غور وفکر کریں اور دیکھیں کہ ان آیات الٰہی میں ان خدائی گھروں اور ان کے محافظین کی کیا عظمت ومقام بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد مندرجہ ذیل روایات میں غور وفکر کریں۔تفسیر الدرالمنثور میں جلال الدین سیوطی، دو اصحاب رسولؐ انس بن مالک اور بریدہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب نبی اکرمؐ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا: ''اَیُّ بُیُوْتٍ هٰذِهِ یا رسول الله؟'' یعنی: ''اے اللہ کے رسولؐ اس آیت میں جن گھروں کی توصیف کی گئی ہے وہ کون سے گھر ہیں؟'' رسول خداؐ نے فرمایا: "بُیُوت الاَنْبِیاء!" یعنی: ''انبیاء کے گھر''۔حضرت ابو بکر کھڑے ہوئے اور عرض کیا: ''هٰذَا الْبَیْتُ مِنْهاَ لَبَیْتُ عَلِیٍّ وَ فاَطِمَةَ؟ یعنی: ''کیا یہ علیؑ وفاطمہؑ کا گھر انہی گھروں میں سے ہے؟'' آنحضرتؐ نے جواب دیا: ''نعَمْ مِنْ افاضِلِها'' یعنی: ''ہاں! یہ تو ان میں سے بہترین گھروں میں سے ہے۔''[1]

اسی طرح کی بات حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں صحابی رسولؐ ابو برزہ کے ذریعے رسول خداؐ سے بیان کی ہے۔اس روایت میں کسی کا نام لیے بغیر یوں کہا گیا ہے: قِیْلَ یا رَسُول اللهِ اَبَیْتُ عَلِیٍّ و فاطِمَةَ مِنْهاَ؟ قالَ: ''مِنْ اَفْضَلِها'' یعنی: پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول کیا علیؑ اور فاطمہؑ کا گھر انہی میں سے ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''یہ ان میں سے اعلیٰ ترین گھر ہے۔''[2]

اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد پہلی روایت کو دو حوالوں سے انس بن مالک اور بریدہ سے بھی نقل کیا ہے۔[3]

دلچسپ امر یہ ہے کہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں عام طور پر اہل بیتؑ کے تمام فضائل کو سرد مہری اور بے رغبتی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔اس کے برعکس یہاں پر پہلی روایت کو انس بن مالک اور بریدہ سے نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے: ''و هذا اِنْ صَحَّ لایَنْبَغی العُدُول عَنْه'' یعنی: ''اگر یہ روایت صحیح ہو تو پھر (آیت کی تفسیر میں) اس سے عدول اور انحراف جائز نہیں ہے۔'' (دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ آیت کی تفسیر میں بہترین بات یہ ہے کہ اس سے مراد انبیاء کے گھر ہیں اور ان میں سے بہترین علیؑ اور فاطمہؑ کا گھر ہے۔[4]

اہلسنت کے بڑے علماء کی ایک جماعت نے اس روایت کو اپنی کتب میں درج کیا ہے۔یقیناً یہ روایات علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے

---

[1] الدرالمنثور، جلد ۵، صفحہ ۵۰

[2] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۴۱۰، حدیث ۵۶۶۔

[3] ایضا، حدیث ۵۶۷، ۵۶۸۔

[4] روح المعانی جلد ۱۸، صفحہ ۱۵۷، مذکورہ آیت کے ضمن میں۔

بیٹوں حسنؑ اور حسینؑ کو شامل ہیں اسی طرح فاطمہ زہراؑ کے فرزندان جو امام حسینؑ کی نسل سے ہیں یعنی معصوم امام، ان کو بھی آیت شامل ہے کیونکہ یہ بھی اسی راستے اور اسی دین کو جاری وساری رکھنے والے ہیں۔ ہاں! ان کے گھر انبیاء کے گھروں کی طرح ہیں۔ ایسے گھر ہیں جہاں ہمیشہ نور الٰہی چمکتا ہے اور شیطانوں کی دسترس سے محفوظ ہیں بلکہ ان میں سے یہ برتر شمار ہوتے ہیں۔ یقیناً ان گھروں کے مکین بھی تمام انسانوں سے بہتر اور برتر ہیں اور فضائل میں انبیاء کی مانند ہیں یہ وہ باتیں ہیں جنہیں مذکورہ بالا روایات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کیا اس کے باوجود دوسروں کو ان پر ترجیح دینا ظلم نہیں ہے؟

۳۔صراط مستقیم

سورہ حمد کی پانچویں آیت جسے ہم صبح وشام اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں، اس میں ہم دعا کرتے ہیں:

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ‏ ﴿۵﴾

اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر قائم رکھ۔

ایسا راستہ جو ہمیں تجھ تک اور جو تیری رضا وخوشنودی کا موجب ہے، اس تک پہنچا دے ایسا راستہ جو ان لوگوں کے راستے سے جدا ہے جن پر تیرا غضب ہوا ہے اور اسی طرح گمراہوں کے راستے سے بھی جدا ہے۔ اے اللہ! ہمیں ایسے راستے کی ہدایت فرما اور اس پر ہمیں ثابت قدم اور قائم ودائم فرما۔

بے شک ''صراط مستقیم'' کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ اس لیے بعض نے اس کا معنی اسلام اور بعض نے قرآن کیا ہے۔ بعض دوسروں نے اس سے مراد پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومینؑ لیا ہے۔ بعض نے اسے ''آئین للہ'' کہا ہے اور کچھ افراد نے اس کی تفسیر، انبیاء کی روش اور راستے سے کی ہے ان میں سے ہر ایک آیت کے وسیع مفہوم کا حصہ ہو سکتا ہے۔ لیکن مختلف حوالوں سے نبی اکرمؐ سے منقولہ روایات میں اس کے ظاہر ترین مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں صراط مستقیم کی تفسیر علی بن ابی طالب یا محمد وآل محمدؐ کی روش اور سیرت سے کی گئی ہے۔

حاکم حسکانی اپنی کتاب شواہد التنزیل میں جابر بن عبداللہ انصاری کے ذریعے رسول خداؐ سے بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

اِنّ اللهَ جَعَلَ عَلِياًؑ و زَوْجَتَهُ وَ اَبۡنآئَهُ حُجَجَ اللهِ عَلى خَلۡقِهِ وَ هُمۡ اَبۡوَابُ العِلۡمِ فِي اُمّتِي، مَنۡ اِهۡتَدیٰ بِهِمۡ هُدِیَ اِلیٰ صِراطٍ مُسۡتَقِيمٍ۔

اللہ تعالیٰ نے علیؑ ان کی زوجہ (فاطمہ زہراؑ) اور ان کے فرزندوں کو اپنی مخلوق پر اپنی حجتیں قرار دیا ہے وہ میری امت میں علم کے دروازے ہیں جو بھی ان کے ذریعے سے ہدایت پائے گا اس نے صراط مستقیم کی طرف

ہدایت پائی ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں وہ ابن عباس کے ذریعے رسول خدا سے یوں نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے علی بن ابی طالبؑ سے فرمایا:

اَنْتَ الطّرِیقُ الواضِحُ وَ اَنْتَ الصِّراطُ المُستَقِیم وَ اَنْتَ یَعْسُوبُ المُؤمِنِیْنَ

آپ واضح راستہ، صراط مستقیم اور مومنین کے رہبر و راہنما ہیں۔[2]

تیسری حدیث بھی وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ وہ "اھدنا الصراط المستقیم" کی تفسیر میں کہتے تھے:

قُولُوا (مَعَاشِرَ العبادِ) اِھْدِنا اِلٰی حُبِّ النّبِیّ وَ اَھْلِ بَیْتِہٖ

اے اللہ کے بندو! کہو اے اللہ ہمیں نبی اکرمؐ اور ان کے اہلبیت کی محبت کی طرف ہدایت فرما۔[3]

اسی آیت کی تفسیر میں وہ چوتھی حدیث میں "ابو بریدہ" سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "اس سے مراد محمد و آل محمد (علیہم السلام) ہیں۔[4]

اس حدیث کو علامہ ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔[5] شیخ عبد اللہ حنفی نے بھی اپنی کتاب "ارجح المطالب" میں اس حدیث کو ابوھریرہ سے نقل کیا ہے۔[6] شواہد التنزیل میں پانچویں حدیث میں مذکورہ ہے کہ عبدالرحمن بن زید نے اپنے والد سے "صِراطَ الّذین اَنْعَمْتَ علیھم" کی تفسیر کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: **ھُوَ النّبِیُّ وَ مَنْ مَعَہُ وَ عَلِیُّ بْنُ اَبی طالِبٍ وَ شِیْعَتُہُ** یعنی: جن لوگوں پر خدا کا انعام ہوا، وہ نبی اکرم اور آپ ﷺ کے ساتھ علی بن ابی طالب - اور ان کے شیعہ ہیں۔[7]

مکتب اہل بیت کے پیروکاروں اور شیعہ کتب میں بھی اس کے متعلق متعدد روایات بیان ہوئی ہیں ایک روایت میں امام صادقؑ سے "صِراطَ الّذِین انعمت علیھم" کی تفسیر کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یعنی "مُحَمّداً وَ ذُرِّیَّتَہُ علیھم السلام" اس سے مراد محمدؐ اور ان کی ذریت ہے۔[8]

اس لحاظ سے صراط مستقیم کے واضح ترین اور ظاہر ترین مصادیق، رسول خداؐ، علیؑ اور نسل فاطمہؑ سے ان کے معصوم بیٹوں کا راستہ

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۸۸، حدیث ۸۹

[2] ایضا، حدیث ۸۸

[3] ایضا، حدیث ۸۷

[4] ایضا، حدیث ۸۸

[5] تفسیر ثعلبی بمطابق، کفایہ الخصام، ص ۳۴۵۔

[6] جمع المطالب، صفحہ ۸۵، مطبوعہ لاہور

[7] شواہد التنزیل جلد ا، صفحہ ۶۶، حدیث ۱۰۵۔

[8] ان احادیث کے بارے میں مزید معلومات کی لئے تفسیر نور الثقلین اور برہان کا مطالعہ کریں، نور الثقلین، جلد ا، صفحہ ۲۳، حدیث ۱۰۱۔

ہے، جوبھی ان کی ولایت کے دامن سے متمسک ہو جائے اور ان کے نقش قدم پر چلے اس نے صراط مستقیم پر قدم رکھا ہے جو اُسے خدا کے مقام قرب تک لے جائے گا اور یہ گمراہی اور انحراف سے دور ہے۔

۴۔ آدمؑ کی توبہ کی قبولیت کا وسیلہ

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۷ میں آیا ہے کہ ترک اولی کے بعد حضرت آدمؑ نے اپنے پروردگار کی طرف سے کلمات حاصل کیے اور ان کے ذریعے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کیا کیونکہ اللہ تواب اور رحیم ہے۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۳۷﴾

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے چند کلمات سیکھ لیے تو خدا نے ان کی توبہ قبول فرمائی؛ بے شک وہ بہت بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کلمات کیا تھے جو اللہ تعالیٰ نے توبہ کے لیے حضرت آدمؑ کو سکھائے؟ اس حوالے سے مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ یہ وہی کلمات ہیں جو سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۳ میں آئے ہیں: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ یعنی: ''ان دونوں (آدم اور حوا) نے کہا: پروردگارا! ہم نے اپنے آپ پر ظلم وستم کیا ہے، اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کھایا تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد ایک اور دعا اور راز و نیاز الٰہی ہے۔ ان میں سے ایک حضرت یونسؑ کی دعا ہے جب وہ مچھلی کے شکم میں قیدی تھے۔ یعنی ''سُبۡحَانَكَ اِنِّیۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ'' لیکن متعدد روایات جو رسول اکرمؐ یا اصحاب کرام سے نقل ہوئی ہے بتاتی ہیں کہ یہ کلمات، اللہ تعالیٰ کو محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے حق کا واسطہ دینا تھے۔

الدرالمنثور میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں سیوطی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: وہ کلمات اور الفاظ کون سے تھے جو حضرت آدمؑ نے اپنے رب سے حاصل کیے اور ان کے ذریعے توبہ کی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سَئَلَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وعَلِيٍّ و فاطِمَةَ وَالۡحَسَنِ وَالۡحُسَيۡنِ اِلَّا تُبۡتَ عَلَيَّ فَتَابَ عَلَيۡهِ'' یعنی: ''اُس نے محمد، علی، فاطمہ، حسن اور حسین (علیہم السلام) کے حق کا واسطہ دے کر دعا کی کہ مجھے بخش دے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔''[۱]

نیز اسی کتاب میں وہ حضرت علیؑ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو حکم دیا کہ کہو:

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسۡئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ اٰلِ مُحَمَّدٍ سُبۡحَانَكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنۡتَ عَمِلۡتُ سُوۡءً وَ ظَلَمۡتُ

---

[۱] الدرالمنثور، جلد۱، صفحہ ۶۰

نَفْسِی فَاغْفِرْلِی اِنَّکَ اَنْتَ الغَفُورُ الرَّحِیم اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ سُبْحانَکَ لا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوءً و ظَلَمْتُ نَفْسِی فَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوابُ الرَّحِیْمُ فَھٰؤلاءِ الکَلِماتُ الّتی تَلَقّٰی آدَمُ

اے اللہ! میں تجھے محمد و آل محمد کے حق کا واسطہ دیتا ہوں تو پاک و منزہ ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے بُرا کیا اور اپنے پر ظلم کیا ہے مجھے بخش دے، بے شک تو غفور اور رحیم ہے، اے اللہ! بحق محمد و آل محمد سوال کرتا ہوں تو پاک و منزہ ہے تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، میں نے بُرا کیا ہے، اپنے پر ستم کیا ہے۔ میری توبہ کو قبول فرما، بے شک تو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[۱]

اس روایت سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا تین تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ سب الفاظ حضرت آدمؑ کی دعا میں جمع تھے۔ ابن مغازلی اپنی کتاب مناقب میں اسی مطلب کو سعید بن جبیر کے ذریعے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا گیا کہ وہ کون سے الفاظ تھے جو حضرت آدمؑ نے اپنے رب حاصل کیے اور اللہ تعالیٰ نے اِن کی توبہ قبول فرمائی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

سَئَلَہُ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ عَلِیٍّ وَ فاطِمَۃَ وَ الْحَسَنِ وَ الْحُسَیْنِ اِلَّا ما تُبْتَ عَلَیَّ فَتَابَ عَلَیْہِ[۲]

اس نے بحق محمد، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ÷ دعا کی کہ میری توبہ قبول فرما اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

اسی طرح علامہ قندوزی نے ینابیع المودۃ، بیہقی نے دلائل النبوۃ میں بدخشی نے مفتاح النجاح میں اور عبداللہ شافعی نے مناقب میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے۔ اگرچہ بہت ساری کتب میں اس حدیث کی سند ابن عباس پر ختم ہوتی ہے لیکن اس کے راوی فقط ابن عباس میں منحصر نہیں ہیں۔ کیونکہ الدر المنثور میں دیلمی کی مسند الفردوس سے جو حدیث منقول ہے اس کی سند حضرت علیؑ تک پہنچتی ہے، اس میں یہی بات بیان ہوئی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: میں نے پیغمبر اکرمؐ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا اور پھر آنحضرتؐ نے فرمایا۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تعلیم دی کہ وہ اس سے محمد و آل محمد کا واسطہ دے کر دعا کرے تا کہ وہ اس کی توبہ قبول فرمائے۔[۳]

یہی مطلب اہل سنت کی کتب اور اہل بیت کی روایات میں امام صادقؑ سے بھی بیان ہوا ہے، اس بارے میں روایات متعدد ہیں

---

[۱] الدر المنثور، جلد ۱، صفحہ ۶۰

[۲] مناقب ابن مغازلی (احقاق الحق، جلد ۹، صفحہ ۱۰۲ کے مطابق)

[۳] الدر المنثور، جلد ۱، صفحہ ۶۰ (تلخیص کے ساتھ)

اوراس کی اسناد مختلف قسم کی ہیں۔[1]

اس حدیث کو ایک معمولی اور عام فضلیت نہیں سمجھنا چاہیے اور سادگی سے اس سے نہیں گزر جانا چاہیے۔ جب حضرت آدمؑ اپنے ترک اولی سے توبہ کرنا چاہتے ہیں (اور یہ ان کا پہلا ترک اولی تھا جو ان سے سرزد ہوا) تو انہیں خداوند کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بحق محمد وآل محمد یا بحق محمد، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ÷ دعا مانگے تاکہ اس کی توبہ قبول کی جائے۔ ان کے علاوہ یہ بات کسی اور کے بارے میں ذکر نہیں ہوئی ہے یہ ایک بلند مقام ومنزلت ہے جو انہی سے مخصوص ہے۔ اور یہ پنجتن پاک، رسولؐ اوران کی اہل بیت اور معصومہ آئمہ کی غیر معمولی عظمت کا نشان ہے۔ ایسی صورت حال میں خلافت رسولؐ اور امامت کے لیے ان سے زیادہ اہل اور قابل کس کو سمجھا جا سکتا ہے اور کس کو ان پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ کیا ان دلائل کی موجودگی میں حیران ہونے کی بات ہے کہ امامت قیامت تک نسل رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آل محمدؑ میں باقی رہے؟

۵۔ بہترین نیکیاں

سورہ نمل کی آیت ۸۹ میں ارشاد الٰہی ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿٨٩﴾

جو کوئی نیکی انجام دے اس کے لیے اس سے بہتر اجر ہوگا اور وہ اس دن (روز قیامت) کے خوف و وحشت سے امان میں ہوگا۔

یہاں پر ''حسنہ'' کا معنی بہت وسیع ہے اور تمام نیکیوں کو شامل ہے، اس میں بشارت دی جا رہی ہے کہ جو نیکی بجالائے اللہ تعالیٰ اس نیکی سے بہتر اُسے جزا دے گا اور اس کے اہم ترین اثرات میں سے ایک روز محشر کے خوف اور ڈر سے امان ہے جو کہ بہت بڑی خوف و وحشت کی فضا ہوگی۔ لیکن بعض روایات میں اس آیت میں حسنہ کا اہم ترین اور واضح ترین مصداق محبت اہل بیتؑ رسول بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے دن امن وامان کے لیے یہ محبت بہترین وسیلہ ہے۔

شواہد التنزیل میں اس آیت کے ضمن میں کئی روایات نقل ہوئی ہیں جو اس مطلب کو بیان کرتی ہیں کہ مذکورہ آیت میں حسنہ سے مراد محبت اہل بیتؑ ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں ابوعبداللہ جدلی، علیؑ سے بیان کرتے ہیں کہ امامؑ نے مجھے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے آیت 'مَنْ جاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْها ' کی تفسیر بیان کروں؟ میں نے عرض کیا: ہاں! قربان جاؤں۔ امامؑ نے فرمایا:

وَ الْحَسَنَة حُبُّنا اَهْلَ البَيْتِ و السَّيِئَةُ بُغْضُنا

[1] تفسیر برہان، جلد ا، صفحہ ۸۶، نور الثقلین، جلد ا، صفحہ ٦٧ کے بعد، بحار الانوار، جلد ۲۶، صفحہ ۳۱۹ کے بعد

حسنہ (نیکی) ہم اہل بیت کی محبت ہے اور برائی ہمارا بغض اور دشمنی ہے۔

پھرانہوں نے آیت کی تلاوت فرمائی۔[1]

اسی مطلب کو حاکم حسکانی نے حدیث ۵۸۲ اور ۵۸۷ میں بھی بیان کیا ہے۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ تیسری حدیث میں آیا ہے کہ:

اَلاَ اُخْبِرُكَ بِالسَّيِئَةِ الّتی مَنْ جاءَ بِها اَكَبَّهُ اللهُ عَلىٰ وَجْهِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ بُغْضُنا اَهْلَ الْبَيْتِ

کیا میں تمہیں ایسی برائی کے بارے میں نہ بتاؤں جس کے انجام دینے والے کواللہ تعالیٰ اوندھے منہ آتش جہنم میں ڈالے گا، وہ برائی ہم اہل بیت کی دشمنی اور بغض ہے۔

پھرامیرالمومنینؑ نے دوسری آیت تلاوت فرمائی:

وَمَنْ جاءَ بِالسَّيِئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُم فِي النَّارِ[2]

ایک اور حدیث ابوامامہ باھلی[3] سے نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ خَلَقَ الاَنْبِيَاءَ مِنْ شَجَرٍ شَتّٰى و خَلَقَنِي وَعَلِيّاً مِنْ شَجَرَةٍ واحِدَةٍ فَاَنَا اَصْلُها وَ عَلِيٌّ فَرْعُها، وَ الحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ ثِمارَها، وَ اَشْيَا عُنَا اَوْرَاقُها، فَمَنْ تَعَلَّقَ بِغُصْنٍ مِنْ اَغْصانِها نجا ومَنْ زاغ هَوى وَلَوْ اَنَّ عابِدًا عَبَدَ اللهَ اَلْفَ عامٍ ثُمَّ اَلْفَ عامٍ ثُمَّ لَمْ يُدْرِكْ مَحَبَّتَنَا اَكَبَّهُ اللهُ عَلى مِنْخَرَيْهِ فِي النَّار

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کومختلف درختوں سے خلق فرمایا ہے، مجھے اور علیؑ کوایک ہی درخت سے خلق کیا ہے میں اس کی بنیاد (جڑ) ہوں اور علیؑ اس کی شاخیں ہے، حسنؑ اور حسینؑ اس درخت کے پھل ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے پتوں کی مانند ہیں پس جوان شاخوں میں سے کسی شاخ کو پکڑ لے وہ نجات پائے گا جو اس سے منحرف ہو گا وہ ہلاک ہوگا اور اگر کوئی خدا کی عبادت کرنے والا ایک ہزار سال عبادت کرے پھر ایک ہزار سال

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۴۲۵، حدیث ۵۸۱۔

[2] ایضاً۔

[3] ابوامامہ باھلی، رسولخداؐ کے صحابی تھے اس کی وفات ۸۱ھ میں بتائی گئی ہے وہ آخری صحابی تھے جس نے شام میں وفات پائی ہے۔ (اسد الغابۃ، صدیہ کے لفظ میں) لیکن الکنی والالقاب میں اس کی وفات ۸۶ ہجری لکھی ہے اور ان کا نام صدی یعنی رُجیل کے وزن پر ہے ان پر معاویہ نے جاسوس مقرر کیے تھے کہ وہ علیؑ کی طرف نہ جائے۔

عبادت کرے اس کے بعد پھر ہزار سال عبادت کرے لیکن اس کے پاس ہماری محبت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اُسے منہ کے بل دوزخ میں ڈالے گا۔ [۱]

نیز علامہ قندوزی نے پہلی حدیث کے مضمون کو علیؑ سے نقل کیا ہے اور حدیث کو یہاں ختم کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

اَلْحَسَنَةُ حُبُّنَا وَ السَّيِّئَةُ بُغْضُنَا

حسنہ ہماری محبت ہے اور برائی ہماری دشمنی وعداوت ہے۔ [۲]

اسی کتاب میں بنی کثیر سے امام صادق - سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا: مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (جو کوئی نیکی انجام دے اُسے دس برابر اجر ملے گا) کی آیت تمام مسلمانوں کے لیے ہے لیکن وہ حسنہ اور نیکی جس کے انجام دینے پر اس سے بہتر جزا ملے گی اور قیامت کے دِن خوف ووحشت سے امان کا باعث ہوگی وہ ہم اہل بیت کی محبت اور ولایت ہے۔

مفسرین اور ارباب حدیث کی ایک جماعت نے اگر چہ زیر بحث آیت کے حوالے سے مودت اہل بیت کو بڑی نیکی کے عنوان سے ذکر نہیں کیا ہے لیکن سورہ شوریٰ کی آیت ۲۳: "وَ مَنْ يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا" (جو نیکی کمائے ہم اس کے لیے اس کے حسن اور اچھائی میں اضافے کریں گے) کی تفسیر میں انہوں نے اسی مفہوم پر مشتمل روایات نقل کی ہیں۔ جیسے جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں ابن ابی حاتم کے ذریعے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ 'الْمَوَدَّةُ لِآلِ مُحَمَّدٍ (ص)' اس سے مراد آل محمد سے محبت ودوستی ہے۔ [۳]

تفسیر روح المعانی میں آلوسی اسی آیت (شوریٰ / ۲۳) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ بعض مفسروں کا کہنا ہے کہ "حسنہ" سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذوی القرباء کی محبت ہے اس کے بعد وہ کہتے ہیں: یہ بات ابن عباس اور سدی سے نقل ہوئی ہے پھر وہ مزید لکھتے ہیں۔ آل رسول ﷺ کی محبت سب سے بڑی حسنات میں سے ہے اور اس آیت میں حسنہ کے عنوان کے تحت درجہ اول میں قرار پاتی ہے۔ [۴]

مذکورہ بالا احادیث کی طرح اور بہت سی حدیثیں دیگر کتب میں بھی ذکر ہوئی ہیں ان سب کو بیان کرنے سے بات طول پکڑ جائے گی۔ ہم اس بحث کو محبت اہل بیت کے بارے میں ایک حدیث کو بیان کر کے ختم کرتے ہیں (اگر چہ یہ حدیث مذکورہ آیت کی تفسیر میں نہیں آئی ہے) شبلنجی نے نورالابصار میں ایک حدیث پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۴۲۸، حدیث ۵۸۸

[۲] ینابیع المودۃ، صفحہ ۹۸

[۳] الدر المنثور جلد ۶، صفحہ ۷

[۴] روح المعانی، جلد ۲۵، صفحہ ۳۱۔

اس کے ضمن میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وَاللہِ لَا یَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلٍ اِلَّا یمانُ حتیّٰ یُحِبَّھُمْ (اَھْلَبَیْتِی) لِقَرابَتِہِمْ مِنِّیْ۔

اللہ کی قسم کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوگا جب تک میرے اہل بیت سے میری قرابت کی وجہ سے محبت و دوستی نہ کرے۔[1]

یہ نکتہ بھی قابل اہمیت ہے کہ ایک معمولی اور عام محبت کبھی بھی قیامت کے دن کے خوف و وحشت سے نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتی اور نہ ہی ایمان کی شرائط میں سے قرار پا سکتی ہے۔ یہ عبارتیں اچھی طرح سے ثابت کرتی ہیں کہ اہل بیتؑ کی محبت مسئلہ ولایت و امامت کی بنیاد ہے جو کہ دین کی بقاء کا سبب، نبوت کے راستے کا دوام اور ایمان کی حفاظت کا باعث ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں جو کچھ اجمالی طور پر بیان ہوا ہے اور ان کی تفسیر میں منقولہ روایات میں جو کچھ واضح طور پر بیان ہوا ہے۔ ان سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آل محمدؐ اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالخصوص علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کا بہت بلند مقام و مرتبہ ہے کیونکہ:

یہ وہ شخصیات ہیں جن کی مودت رسالت کا اجر اور جزا ہے

ان پر درود اور صلوات کے بغیر نماز باطل ہے

ان کی حیثیت صراط مستقیم کے طور پر پہنچانی جاتی ہے

حضرت آدمؑ جو ترک اولی کی وجہ سے اللہ کی ناراضگی کا شکار ہوئے تھے انہوں نے اللہ تعالی کو ان کا واسطہ دے کر توبہ کی تو ان کی توبہ قبول ہوگئی۔

ان کی محبت و دوستی ایسی نیکی ہے جو ہر صاحب ایمان کو قیامت کے دن کے خوف اور وحشت سے نجات دیتی ہے۔

واقعاً جو ہستیاں ان غیر معمولی ممتاز صفات کی حامل ہوں، جن کا بلند مقام و مرتبہ اہل سنت اور اہل بیت کی روایات اور کتب میں بیان ہوا ہو، ان کا دوسروں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ کوئی دوسرا ان کی برابری نہیں کر سکتا۔ نتیجے کے طور پر ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کی ضرورت نہیں رہتی، یقیناً یہ محبت اور مودت، ولایت اور رہبریت کے لیے پیش خیمہ ہے۔ جو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے کا تسلسل ہے۔ نیز وہ افراد جن کا ذکر جو متواتر روایات ثقلین میں قرآن کے ساتھ آیا ہے اور ان دو کا گمراہی سے نجات کے وسیلے کے طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ دو چیزیں (قرآن اور اہل بیت ÷) امت مسلمہ میں تا قیامت باقی رہیں گی اور مسلمانوں کو ان کے دامن میں پناہ لینی چاہیے۔ وہ شخصیات جنہیں کشتی نجات اور ہدایت کے چمکدار ستاروں کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے وہ ان تمام اوصاف میں دوسروں سے افضل اور برتر ہیں جن کا تذکرہ فریقین کے اکثر مشہور ماخذ اور اہم کتب میں ہوا ہے۔

---

[1] نور الابصار، ص ۱۲۶۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس بارے میں قرآن مجید کی آیات میں جو اشارے کیے گئے ہیں ان کے متعلق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کلام میں وضاحت کر کے تمام مسلمانوں پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہر قسم کے تعصّبات اور فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر اپنے لیے راہ نجات کا انتخاب کریں یعنی آل محمدؐ کے دامن سے وابستہ ہو جائیں اور ان کی قیادت اور راہنمائی میں سعادت اور خوش بختی کی منزل پالیں اور جو افراد ان تمام دلائل، قرائن، شواہد، اسناد اور تصریحات کو نظر انداز کرتے ہوئے توجیہ، تاویل اور تفسیر بالرائے کریں انہیں خود جوابدہ ہونا ہوگا۔

آئمہ اہل بیت کے ناموں کی صراحت

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اہل سنت کی بعض روایات میں تمام بارہ اماموں کے نام مکمل طور پر بیان ہوئے ہیں یعنی امام علیؑ کے بعد امام حسنؑ ان کے بعد امام حسینؑ، ان کے بعد امام علی بن الحسینؑ، پھر امام محمد بن علی الباقرؑ، ان کے بعد جعفر بن محمد الصادقؑ ان کے بعد موسی بن جعفر الکاظمؑ ان کے بعد علی بن موسی الرضاؑ، ان کے بعد محمد بن علی النقیؑ پھر حسن بن علی العسکری اور ان کے بعد آخر میں محمد بن الحسن المہدیٰ کے نام مذکورہ ہیں۔

اس حوالے سے سلیمان بن ابراہیم قندوزی حنفی نے اپنی کتاب ینابیع المودۃ میں دو حدیثیں ذکر کی ہیں۔ پہلی حدیث وہ فرائد السمطین سے بیان کرتے ہیں جس کی سند ابن عباس تک پہنچتی ہے وہ نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے اسلام اور اس کی تعلیمات کے بارے میں مختلف سوالات کیے ان میں سے ایک سوال اُس نے وصی رسول کے متعلق بھی پوچھا:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پہلے وصی کے طور پر علی بن ابی طالب- کا نام لیا اور پھر ان کے فرزندان حسنؑ اور حسینؑ اور پھر ان کے بعد دیگر نو اماموں کے ایک ایک کر کے نام بتائے۔ یہودی ایمان لے آیا اور اُس نے واشگاف الفاظ میں اظہار کیا کہ میں نے سابقہ انبیاء کی کتابوں اور حضرت موسی - کی کتاب میں دیکھا ہے کہ آخری نبیؐ کا سب سے پہلا جانشین ان کا داماد ہوگا، دوسرا اور تیسرا جانشین دونوں بھائی اور ان کے بیٹے ہوں گے اور دیگر نو امام تیسرے امام کی اولاد سے ہوں گے [۱]

دوسری حدیث: مناقب سے جابر بن عبداللہ انصاری کے ذریعے سے اسی طرح کا واقعہ بیان کرتی ہے جس میں بارہ اماموں کے نام ذکر کیے گئے ہیں کیونکہ یہ دونوں حدیثیں لمبی تھیں لہٰذا ہم نے ان کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ [۲]

یاد رہے کہ گزشتہ صفحات میں ہم نے بہت ساری ایسی روایات بیان کی ہیں جن میں اجمالی طور پر بارہ اماموں کا ذکر تھا، جب بھی آپ دوبارہ ان معتبر اور مشہور احادیث کا مطالعہ کریں گے جو شیعہ وسنی طرق سے نقل ہوئی ہیں اور ان میں غور وفکر کریں گے تو آپ دیکھیں

---

[۱] ینابیع المودۃ، صفحہ ۴۴۰، باب ۷۶

[۲] ایضا، صفحہ ۴۴۲، باب ۷۶

گے کہ بارہ اماموں (بارہ خلفاء یا اُمراء) کی صحیح اور معقول تفسیر اور تاویل پیش نہیں کی گئی مگر یہ کہ جو شیعہ نے بیان کی ہے۔ سب حضرات رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ خلفاء کی تفسیر اور تشریح میں حیران و سرگرداں ہیں۔

یہ روایات جو حدیث کی معتبر ترین کتب میں نقل ہوئی ہیں اس قدر قوی ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی صرف ایک تفسیر اور تشریح صحیح اور درست ہے اوہ وہ وہی ہے جو امامیہ نے ذکر کی ہے۔ اس دن کی امید کے ساتھ جب فرقہ پرستی سے ہٹ کر امامت اور خلافت رسولؐ کے بارے میں آیات اور روایات کی تحقیق کریں گے اور ہر قسم کے تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر ان کا جائزہ لیں گے تو سب پر فکر و نظر کے نئے دریچے کھلنے کی توقع ہے۔

الامام المہدی علیہ السلام

بعض ناسمجھ اور آگاہی نہ رکھنے والے افراد کے خیال کے برعکس، امام مہدیؑ کے انقلاب اور ان کی عالمی حکومت کا عقیدہ شیعہ اور مکتب اہل بیت ÷ کے پیروکاروں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ بغیر کسی استثناٗ کے تمام اسلامی فرقوں کا یہ نظریہ ہے کہ آخری زمانے میں پیغمبر اکرم ﷺ کی اولاد میں سے ایک مہدی نام کی شخصیت دنیا کو عدل وانصاف سے پُر کرے گی اور انہوں نے اس موضوع کے بارے میں احادیث نبوی کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔اس بارے میں اہل سنت اور شیعہ علماء کی طرف سے بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بعض کا آئندہ صفات میں ذکر کیا جائے گا۔

یہ روایات متواترہ اور قطعی ہیں جنہیں تمام اسلامی محققین (اپنے خاص فرقے سے قطع نظر) نے قبول کیا ہے صرف ابن خلدون اور احمد امین مصری جیسے چند محدود افراد نے ان روایات کے رسول خدا ﷺ سے صادر ہونے میں شک وتردید کا اظہار کیا ہے اور ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں کہ ان کا محرک روایات کا ضعف نہ تھا بلکہ شاید ان کا خیال یہ تھا کہ انقلاب مہدیؑ کے متعلق روایات خارق عادت کاموں پر مشتمل ہیں جس پر وہ آسانی سے یقین نہیں کر سکتے تھے۔حالانکہ متعصب ترین اسلامی فرقہ وہابیوں نے بھی انہیں قبول کیا ہے۔اور ان احادیث کے متواتر ہونے کا بھی انہوں نے اعتراف کیا ہے۔

اس مدعا کی دلیل وہ بیان ہے جو چند سال پہلے حضرت مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں رابطہ العالم الاسلامی سے سوال کے جواب میں صادر ہوا۔حالانکہ رابطہ العالم الاسلامی پر وہابیوں اور سعودی حکومت کا بہت زیادہ اثر ونفوذ ہے۔یہ بیان کینیا کے ابو محمد نامی باشندے کے سوال کے جواب میں رابطہ العالم الاسلامی کے جنرل سیکرٹری محمد صالح القزاز کے دستخط کے ساتھ جاری ہوا۔اس بیان میں آیا ہے کہ ''ابن یتمیہ وہابی مذہب کے بانی نے بھی مہدی (علیہ السلام) کے متعلق احادیث کو قبول کیا ہے۔اس کے بعد وہ اس موضوع پر سعودی عرب کے پانچ بڑے علماء کے تحریر کردہ رسالہ کے بارے میں بحث کرتا ہے۔اس رسالے کا ایک اقتباس یہ ہے:

''جب دنیا میں ظلم اور فساد چھا جائے گا، کفر پھیل جائے گا تو اللہ تعالیٰ مہدی = کے ذریعے دنیا کو عدل وانصاف سے ایسے پُر کر دے گا جیسے وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی۔وہ بارہ خلفاء راشدین میں سے آخری ہوگا جن کے بارے میں کتب صحاح کے مطابق رسول خدا ﷺ نے خبر دی ہے۔مہدی = سے متعلق احادیث بہت سارے اصحاب رسولؐ سے نقل ہوئی ہیں جن میں عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب۔طلحۃ بن عبداللہ، عبدالرحمن بن عوف، عبداللہ بن عباس، عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود، ابوسعید خدری، ثوبان، قرۃ بن ایاس مزنی، عبداللہ بن حارث، ابوھریرہ، حذیفہ بن یمان، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ، جابر بن ماجد، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، عمران بن حصین اور ام سلمہ شامل ہیں۔

یہ بیس افراد وہ ہیں جنہوں نے روایات مہدی کو نقل کیا ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے افراد موجود ہیں۔خود صحابہ کرام سے بھی ظہور مہدی کے متعلق بہت ساری باتیں بیان ہوئی ہیں۔صحابہ کے اقوال کو حدیث نبوی کے بعد مقام حاصل ہے۔کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ

نہیں ہے جس کے بارے میں اجتہاد کی بنیاد پر رائے دی جا سکے (بنابرایں ان باتوں کو اصحاب نے خود رسول خدا صلى الله عليه وآله وسلم سے سنا ہے)

اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں:

یہ دو مطلب (احادیث نبوی اور اصحاب کی روایات جو یہاں پر حدیث کے حکم میں ہیں) بہت سارے اسلامی متون اور احادیث کی بنیادی کتب اعم از سنن، معاجم اور مسانید میں آئی ہیں۔ ان میں سنن ابی داود، سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ، ابن عمرو، مسند احمد، اور مسند ابن لیلی اور بزاز، صحیح حاکم، معاجم طبرانی، معاجم دارقطنی اور ابونعیم، خطیب بغدادی اور ابن عساکر اور دیگر کتب شامل ہیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ:

یہ موضوع اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ بعض علمائے اسلام نے روایات مہدی کے نام سے خاص کتابیں تالیف کی ہیں، جیسے ابو نعیم اصفہانی کی کتاب ''اخبار المهدی''، ابن حجر ہیثمی کی ''القول المختصر فی علامات المهدی المنتظر''، علامہ شوکانی کی ''التوضیح فی تواتر، جاء فی المنتظر والرجال والمسیح''، اسی طرح ادریس عراقی مغربی کی کتاب ''المہدی'' اور ابوالعباس ابن عبدالمومن المغربی کی کتاب ''الوهم المکنون فی الرد علی بن خلدون''

پھر مزید لکھتے ہیں:

اسلام کے قدیم اور متاخر بڑے علماء کی ایک جماعت نے اپنی تحریروں میں واضح طور پر لکھا ہے کہ مہدیؑ کے بارے میں احادیث تواتر کی حد تک ہیں (اور اسی وجہ سے ناقابل انکار ہیں) ان علماء میں نمایاں طور پر سخاوی نے اپنی کتاب ''فتح المغیث'' میں محمد بن احمد سفاوینی نے اپنی کتاب ''شرح العقیدہ'' میں ابوالحسن الابری نے ''مناقب الشافعی'' میں، ابن تیمیہ نے فتاویٰ کی کتاب میں، جلال الدین سیوطی نے ''الحاوی'' ادریس عراقی نے اپنی کتاب، شوکانی نے ''التوضیح'' میں اور محمد جعفر کنانی نے ''نظم التناثر'' میں واضح طور پر روایات مہدی کے تواتر کا اعتراف کیا ہے۔

آخر میں وہ کہتے ہیں:

صرف ابن خلدون نے احادیث مہدی پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بزرگان دین اور علمائے اسلام نے اس کی باتوں کو رد کیا ہے اور بعض نے تو جیسے ابن عبدالمومن نے اس پر خصوصی کتاب تحریر کی ہے۔ مختصر یہ کہ حافظان حدیث اور بزرگان دین نے تصریح کی ہے کہ مہدیؑ کے بارے میں احادیث، صحیح اور حسن احادیث ہیں اور مجموعاً متواتر ہیں۔

آخر میں وہ یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں: بنابرایں ظہور مہدی کا عقیدہ رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور یہ اہل سنت و جماعت کے عقائد میں سے ہے اور نادان، جاہل یا بدعتیوں کے علاوہ کوئی بھی اس عقیدے کا انکار نہیں کرتا۔[1]

---

[1] یہ خطب ۲۱ یو ما ۱۹۷٦ کو مجمع فقہی اسلامی کے سیکرٹری محمد منتظر کنانی کے دستخط کے ساتھ پہنچا، یہ مقالہ مذکورہ شخص اور سعودی عرب کے چار دیگر مشہور علماء کی علمی کاوش تھی، جن کے نام یہ ہیں۔ شیخ صالح بن عثیمین، شیخ احمد محمد جمال، شیخ احمد علی، شیخ عبداللہ خیاط۔

اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض محققین کے نزدیک مہدویت کا نظریہ صرف مسلمانوں کا نظریہ نہیں ہے بلکہ دیگر ادیان کے ماننے والے بھی ہمیشہ سے ایک بڑے عالمی مصلح کے منتظر ہیں اور ان کی کتب میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔ اس بارے میں تفصیل جاننے کے لیے ان کتب کا مطالعہ کیا جائے جو ظہور مہدی کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔[1]

ذیل میں ہم موجودہ کتاب کے اسلوب کے مطابق جس کا محور تفسیر موضوعی ہے، ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس عظیم ظہور کو اجمالی طور پر بیان کرتی ہیں۔

۱۔ زمین پر صالحین کی حکومت

سورہ مبارکہ انبیاء میں ارشاد پروردگار ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝١٠٥ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝١٠٦

ہم نے ذکر (تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے (حتمی کر دیا ہے) کہ میرے صالح بندے زمین (کی حکومت) کے وراث ہوں گے۔ اور عبادت گزاروں کے لیے اس بات میں واضح پیغام ہے۔ (انبیاء ۱۰۵/۱۰۶)

یہ آیات ان آیات کے بعد آئی ہیں جن میں صالحین کے لیے اخروی جزا اور اجر کا تذکرہ ہوا ہے اور یہاں پر درحقیقت ان کے دنیاوی اجر کو بیان کیا جارہا ہے اور یہ جزا بہت ہی اہم ہے جو انسانی معاشرے کی سعادت، احکام الٰہی کے اجراء اور انسانی معاشرے کی فلاح اور نجات کا باعث ہے۔ اس بات کے پیش نظر کہ ''ارض'' کا اطلاق تمام کرہ زمین اور پوری دنیا پر ہوتا ہے۔ (مگر یہ کہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو) یہ آیت ''صالحین کی عالمی حکومت'' کے بارے میں بشارت ہے اور چونکہ یہ مطلب ماضی میں وقوع پذیر نہیں ہوا ہے لہٰذا مستقبل میں اس کا منتظر رہنا چاہیے اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم ''مہدی کی عالمی حکومت'' کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے جو آیت کہہ رہی ہے کہ ہم نے اس وعدے کو سابقہ انبیاء کی کتابوں میں بھی لکھا ہے، گویا آیت بتا رہی ہے کہ یہ کوئی نیا اور تازہ وعدہ نہیں ہے بلکہ یہ بنیادی امر ہے جو دیگر ادیان میں موجود ہیں۔

قوی احتمال یہ ہے کہ ''زبور'' سے مراد وہی ''زبور داود'' ہے جو حضرت داود کی مناجات راز و نیاز، دعاؤں اور نصیحتوں کا مجموعہ ہے جو عہد قدیم (تورات سے متعلق کتب) میں مزامیر داود کے عنوان سے یاد کی جاتی ہے۔ قابل ملاحظہ نکتہ یہ ہے کہ اسی کتاب مزامیر داود میں (ان تمام تحریفوں کے باوجود جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عہد قدیم کی کتب میں رونما ہوئیں) یہ عظیم بشارت دیکھی جا سکتی ہے۔ مزمور

---

[1] اس بارے میں کتاب ''انقلاب جہانی مہدی'' کا معالعہ کر سکتے ہیں

۳۷/ میں جملہ۹/ میں ہم پڑھتے ہیں:

''۔۔۔ کیونکہ بُرے اور شریر لوگ ختم ہوجائیں گے اور خدا پر بھروسہ کرنے والے زمین کے وارث ہوں گے اور بہت جلد شریر نیست و نابود ہوں گے اگر چہ اس کے مقام کا پتہ پوچھیں گے تو وہ ناپید ہوگا۔''

اسی مزمور کے گیارہویں جملے میں آیا ہے:

''پھر تواضع کرنے والے زمین کے وراث اور امن وسلامتی کی کثرت سے لطف اندوز ہوں گے۔''

نیز اسی مزمور کے جملے ۲۷ میں یہی بات ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے:

''چنانچہ خدا سے برکت حاصل کرنے والے زمین کے وراث ہوں گے اور رحمت خدا سے دور (معلون) ختم ہوجائیں گے۔''

جملہ/۲۹ میں آیا ہے:

''صدیق زمین کے وارث ہوں اور ہمیشہ اس میں سکونت اختیار کریں گے۔''

صدیق؛ متوکل (بھروسہ کرنے والے) متبرک اور متواضع کے الفاظ واضح طور پر مومنین صالحین کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہوا ہے۔ مذکورہ آیت میں بہت سارے مفسرین کی رائے کے مطابق ذکر سے مراد تورات ہے، اور اسی سورہ انبیاء کی آیت ۴۸؛ اس بات کی گواہی دے رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾

ہم نے موسیٰ اور ہارون کو ایسی چیز عطا کی جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی اور متقین کے لیے روشنی اور یاد آوری تھی۔

بعض افراد نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ذکر سے مراد قرآن اور زبور سے مراد تمام سابقہ انبیاء کی کتابیں ہیں۔ (اس بنا پر آیت کا معنی یوں ہوگا کہ ہم نے قرآن کے علاوہ سابقہ انبیاء کی تمام کتابوں میں یہ بشارت دی ہے۔) بہر حال یہ بشارت اور خوشخبری تورات کے بعض ملحقات جیسے کتاب ''اشعیاء نبی'' میں بھی آئی ہے چنانچہ اس کتاب کی گیارہویں فصل میں ہم پڑھتے ہیں: کہ ذلیلوں کو عدالت کا حکم اور زمین کے مسکینوں کو سچائی کی تنبیہ (بیداری کا سبب) ہوگی۔

اس کا کمر بند عدالت ہوگا

ان کے درمیان وفاداری شعار ہوگا

شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے

چھوٹا بچہ ان کا رکھوالا ہوگا

کیونکہ اس وقت زمین علم الٰہی سے ایسی پُر ہوگی جس طرح پانی سے سمندر پُر ہوتا ہے۔

خود تورات میں اس مطلب کی طرف اشارے موجود ہیں فصل نمبر ۱۳ میں جملہ ۱۵ میں آیا ہے:

ہم زمین کو اولاد ابراہیم میں سے ایک شخص کو دیں گے اور اس کی اولاد کوئی وہی شمار کر سکے گا جو زمین کے ذرات کو گن سکے گا (یعنی ان کی اولاد کی کثرت کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں کوئی گن سکے گا)

فصل ۱۷ جملہ ۲۰ میں آیا ہے: اُسے (اسماعیل کو) ہم نے برکت دی ہے اور اس کی نسل کو خوب بڑھایا ہے آخر میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگی، بارہ سردار پیدا ہوں گے اور اسے عظیم امت عطا ہوگی۔

''بارہ سردار پیدا ہوں گے'' کا جملہ بتا رہا ہے کہ بارہ امام اور راہنما، سب کے سب ان کی اولاد سے ہوں گے۔ یہ جملہ انتہائی قابل توجہ ہے۔ فصل ۱۸ جملہ ۱۸ میں آیا ہے: ''دنیا کی تمام اقوام اس سے برکت حاصل کریں گی''۔ اسی طرح دیگر جملے اور الفاظ میں جن کو ذکر کرنے سے بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

مذکورہ آیت میں قیام مہدی کی طرف واضح اشارے کے علاوہ، اسلامی روایات میں بھی یہ موضوع بڑے واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔ طبرسی مرحوم، مجمع البیان میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں امام محمد — سے یوں نقل کرتے ہیں:

هُمۡ اَصۡحَابُ الۡمَهۡدِیِّ فِی آخِرِ الزَّمَانِ

یہ (صالح بندے جن کا آیت میں زمین کے وارثوں کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے) آخری زمانے میں مہدیؑ کے یار و انصار ہیں۔

تفسیر قمی میں آیت کی تفسیر میں یوں آیا ہے:

''قَالَ: القَائِمُ وَ اَصۡحَابُهٗ''

فرمایا: اس آیت سے مراد مہدیؑ (قائم) کے اصحاب ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے صالح بندے روئے زمین کے بعض حصے پر حکومت حاصل کر لیں گے جیسا کہ رسول اللہ کے زمانے میں اور دیگر ادوار میں ہوا ہے۔ لیکن پوری دنیا پر صالحین کی حکومت صرف حضرت مہدیؑ کے دور میں واقع ہوگی۔ اس موضوع پر شیعہ اور سنی ذرائع سے منقولہ روایات تواتر کی حد تک پائی جاتی ہیں۔

کتاب ''التاج الجامع للاصول'' (اس کتاب میں اہلسنت کے مشہور پانچ اصول جمع کیے گئے ہیں اور اس پر الازھر کے علماء نے اہم تقریظات لکھی ہیں) کے مصنف ''شیخ منصور علی ناصف'' مذکورہ کتاب میں یوں تحریر کرتے ہیں:

اِشۡتَهَرَ بَیۡنَ الۡعُلَمَاءِ سَلَفًا وَ خَلَفًا اَنَّهٗ فِی آخِرِ الزَّمَانِ لَا بُدَّ مِنۡ ظُهُوۡرِ رَجُلٍ مِنۡ اَهۡلِ الۡبَیۡتِ مُسَمًّی الۡمَهۡدِی یَسۡتَوۡلِی عَلَی الۡمَمَالِكِ الۡاِسۡلَامِیَّةِ وَ یَتۡبَعُهُ الۡمُسۡلِمُوۡنَ وَ یَعۡدِلُ بَیۡنَهُمۡ وَ یُؤَیِّدُ الدِّیۡنَ

گزشتہ اور موجود تمام علماء کے درمیان مشہور ہے کہ یقینا آخری زمانے میں اہل بیت (علیہم السلام) سے ایک شخص ظاہر ہوگا جو تمام اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کرلے گا اور تمام مسلمان اس کی پیروی کریں گے اور وہ ان کے درمیان عدل وانصاف کو جاری کرے گا اور دین کو مستحکم اور قوی کرے گا۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

و قَدْ رَوی اَحادیثُ المَهْدِیِّ جَماعَة مِنْ خیار الصَّحابَة وَ اَخْرَجَها اَکَابِرُ المُحَدِّثِیْنَ کَابی داود. و ترمذی و ابن ماجه و الطبرنی و ابی یعلی و البنراز و الامام احمد و الحاکم (رض)

احادیث مہدیؑ کو اصحاب رسولؐ کی ایک بہترین جماعت نے نقل کیا ہے اور انہیں ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، طبرانی، ابویُعلی، بزاز، امام احمد اور حاکم (رض) جیسے اکابر محدثین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔[1]

یہاں تک کہ ابن خلدون جس کا شمار احادیث مہدی کے مخالفوں میں سے ہوتا ہے، وہ بھی علمائے اسلام کے درمیان ان احادیث کی شہرت سے انکار نہیں کرسکا ہے۔[2] جن افراد نے ان اخبار وروایات کے تواتر کا تذکرہ اپنی کتب میں کیا ہے ان میں ایک مشہور مصری عالم اور دانشور محمد شبلنجی ہیں وہ اپنی کتاب ''نور الابصار'' میں لکھتے ہیں: تَواتُرِ الاَخْبارِ عَنِ النَّبِیِّ (ص) عَلی اَنَّ المَهْدی مِنْ اَهْلِ بَیْتِهِ وَاَنَّهُ یَمْلَاءُ الاَرْضَ عَدْلاً یعنی: نبی اکرم ﷺ سے احادیث متواترہ ہم تک پہنچی ہیں کہ مہدی = آنحضرت کے اہل بیت ÷ میں سے ہیں اور پوری دنیا کو عدل وانصاف سے پُر کردیں گے۔

یہ الفاظ بہت ساری دوسری کتب میں بھی آئے ہیں، یہاں تک کہ اہلسنت کے مشہور عالم شوکانی جنہوں نے حضرت مہدیؑ کے انقلاب، دجال کے خروج اور حضرت مسیح کی بازگشت کے متعلق احادیث کے تواتر کے بارے میں کتاب لکھی ہے، اس نے حضرت مہدیؑ کے بارے میں احادیث کے تواتر کے حوالے سے مفصل گفتگو کرنے کے بعد لکھا ہے: ''هذا یَکْفِی لِمَنْ کانَ عِنْدَهُ ذرَّةٌ مِنَ الایمانِ وَ قَلیل مِنْ انصاف۔ یعنی: جو کچھ کہا گیا ہے اس شخص کے لیے کافی ہے جس کے پاس ذرا برابر بھی ایمان اور تھوڑا سا بھی انصاف ہو۔[3]

بہتر ہے یہاں پر نمونے کے طور پر چند اہم روایات کو بیان کیا جائے جو مشہور اسلامی کتب میں نقل ہوئی ہیں۔

۱۔ اہل سنت کے چار اماموں میں سے ایک امام احمد بن حنبل اپنی کتاب مسند میں ابوسعید خدری سے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

---

[1] التاالاجامع اللااصول، جلد ۵، صفحہ ۳۴۱ (یہ بات اس کتاب کے حاشیہ پر اسی صفحہ پر آئی ہے)

[2] ابن خلدون، صفحہ ۳۱۱ (مطبوعہ بیروت)

[3] کتاب التاج جلد ۵، صفحہ ۳۶۰ (مطبوعہ داراحیاء تراث العربی) سے نقل شدہ۔

لاتقوم الساعة حتی تمتلأ الارض ظلما و عدوانا۔ قال: ثم یخرج رجل من عترتی او من اھل بیتی یملأھا قسطاً و عدلاً کما ملئت ظلماً و عدواناً

قیامت اس وقت تک برپا نہیں ہوگی جب تک زمین ظلم وستم سے پُر نہیں ہو جائے گی اس وقت میری عترت یا اہل بیت میں سے ایک شخص قیام کرے گا اور وہ زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی۔[1]

۲۔اسی مطلب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ حافظ ابوداود سجستانی نے اپنی کتاب سنن میں ذکر کیا ہے۔[2]

۳۔مشہور ومعروف محدث ترمذی، صحیح سند (منصور علی ناصف کی کتاب التاج میں تصریح کے مطابق) کے ساتھ عبداللہ کے ذریعے رسول خداؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنیا اِلاَّ یَوْمٌ لَطَوَّلَ اللہُ ذٰلِکَ الْیَوْمَ حَتّٰی یَبْعَثَ رَجُلاً مِنّی اَوْ مِنْ اَھْلِ بَیْتِی یُواطِئُ اِسْمُہُ اِسْمِی وَ اِسْمُ اَبِیہِ اِسْمَ اَبِی یَمْلأُ الاَرْضَ قِسْطاً و عَدْلًا کما مُلِئَتْ ظُلْمًا وَ جَوْراً

اگر دنیا کا ایک دن بھی باقی ہو تو اللہ تعالیٰ اس ایک دن کو اتنا لمبا کر دے گا اور اس ایک دن میں مجھ سے یا میرے اہل بیت (یہ شک وتردید راوی کی طرف سے ہے البتہ اس کا معنی اور مفہوم ایک ہے) میں سے اللہ تعالیٰ ایک مرد کو بھیجے گا (جس کا نام میرے نام پر ہوگا اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا[3] وہ زمین کو عدل وانصاف سے ایسے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی)[4]

اسی طرح کی حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ حاکم نیشاپوری نے بھی مستدرک میں بیان کی ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے نقل نہیں کیا ہے۔[5]

۴۔اسی طرح صحیح داود میں اُمّ سلمہ سے منقول ہے کہ میں نے رسول خداؐ سے سنا کہ آپ نے یوں فرمایا ہے:

---

[1] مسند احمد، جملہ ۳، صفحہ ۳۶

[2] سنن ابی داود، جلد ۴، صفحہ ۱۶۲۔

[3] بعض بزرگ علماء نے وضاحت کی ہے کہ یہاں پر ''اسم ابیہ اسم ابنی'' (اس کے باپ کا نام میرے بیٹے کا نام ہوگا) درست ہے اس لحاظ سے حضرت امام مہدیؑ کا نام مبارک (محمد بن الحسن العسکری) شیعہ عقیدے کے بالکل مطابق ہے۔

[4] التاج، جلد ۵، صفحہ ۳۴۳۔

[5] المستدرک جلد ۴، صفحہ ۵۵۸۔

اَلْمَهْدِیُّ مِنْ عِتْرَتِی مِنْ وُلْدِ فاطِمَةَ:

مہدی میرے خاندان میں سے فاطمہ زہرؑا کی نسل سے ہوں گے۔ [۱]

۵۔اس بارے میں مستدرک میں حاکم نیشاپوری نے ایک تفصیلی حدیث ابوسعید خدری کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

یَنْزِلُ بِأُمَّتِی فِی آخِرِ الزَّمانِ بلاءً شدِید مِنْ سُلْطانِهِمْ لَمْ یُسْمَعْ بَلاءً اَشَدُّ مِنهٔ حتّی تَضِیقَ عَنْهُمُ الْاَرْضُ الرَّحبَةُ وَ حتّی یَمْلأُ الاَرْضَ جَوْراً و ظُلْمًا لایَجِدُ الْمُؤمِنُ مَلْجَأً یَلْتَجِأُ اِلَیْهِ مِنَ الظُّلْمِ فَیَبْعَثُ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ رَجُلاً مِنْ عِتْرَتِی فَیَمْلأُ الْاَرْضَ قِسْطًا و عَدْلًا کماَ مُلِئَتْ ظُلْمًا وجُورًا یَرْضَی عَنْهُ ساکِنُ السَّماءِ و ساکِنُ الاَرْضِ لَاتَدَّخِرُ الْاَرْضُ مِنْ بَذْرِها شَیئاً اِلَّا اَخْرَجَتْهُ وَ لَا السَّماءُ مِنْ قَطْرِها شَیئًا اِلَّا صَبَّهُ اللهُ عَلَیْهِمْ مِدْراراً

آخری زمانے میں میری امت پر ان کے حکمرانوں کی طرف سے سخت مشکلات اور مصائب ٹوٹیں گے ایسی مصیبتیں اور بلائیں جن سے زیادہ شدید پہلے نہ سنی ہوں گی، یہانتک کہ زمین اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو جائے گی، زمین ظلم وستم سے بھر جائے گی مومن کو ظلم وستم سے کوئی پناہ گاہ میسر نہ ہوگی اس وقت اللہ تعالیٰ میری عترت سے ایک مرد مبعوث کرے گا جو زمین کو عدل وانصاف سے ایسے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی آسمان ان پر تمام بارش کے قطروں کو نازل کرے گا (یعنی پوری زمین کو سیراب اور بابرکت کردے گا) [۲]

اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے اپنی کتب میں نقل نہیں کیا ہے۔
مشہور کتب میں اسی طرح کی احادیث مختلف راویوں سے بہت زیادہ ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ آخرکار امام مہدیؑ کے بابرکت ہاتھوں سے عالمی حکومت قائم ہوگی جو تمام جگہوں کو عدل وانصاف سے پر کردے گی۔اور مذکورہ آیت 'اِنَّ الاَرْضَ یَرِثُها عِبادِیَ الصّالِحونَ' کا معنی اور مفہوم عملی جامعہ پہنے گا۔

---

[۱] صحیح ابی داود، جلد ۲، صفحہ ۲۰۷۔

[۲] المستدرک علی الصحیحین، جلد ۴، صفحہ ۴۶۵ (مطبوعہ حیدرآباد دکن)

۲۔سورہ نور کی آیت

اس سورہ کی آیت ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝۵۵

تم سے ایمان لانے والوں اور عمل صالح انجام دینے والوں سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یقیناً انہیں زمین پر خلیفہ قرار دے گا جس طرح اُس نے ان سے پہلے والوں کو (زمین پر) خلافت بخشی ہے اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند اور انتخاب کیا ہے اُسے محکم اور پا برجا کرے گا ان کے خوف اور ڈر کو امن وسلامتی میں تبدیل کر دے گا، میری عبادت کرو اور کسی کو میرا شریک قرار نہ دو اور جو اس کے بعد کافر ہو جائیں یہی لوگ فاسق ہیں۔

اس آیت میں واضح طور پر صالح مومنین کو بشارت دی گئی ہے کہ آخر کار روئے زمین پر ان کی حکومت ہوگی، دین اسلام پوری دنیا میں پھیل جائے گا بدامنی اور خوب و دہشت امن وامان اور آرام وسکون میں بدل جائیں گے پورے عالم سے شرک کی بساط لپیٹ دی جائے گی خدا کے بندے پوری آزادی کے ساتھ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت و پرستش کو انجام دیں گے، سب کے لیے اتمام حجت ہو جائے گی اس طرح سے کہ اس کے بعد اگر کوئی کفر کے راستے کو اختیار کرے گا تو وہ قصوروار اور فاسق ہوگا۔ (آیت کے آخری حصے میں خاص طور پر غور وفکر کیجیے گا)

اگر چہ یہ اہم امور جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے بعد کے ادوار میں نسبتاً بڑے وسیع پیمانے پر اسلامی دنیا کے لیے وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ اسلام جو کہ ایک زمانے میں دشمنوں کے نرغے میں گھیرا ہوا تھا اور وہ ذرا برابر بھی اس کی تبلیغ اور اظہار کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور مسلمان مسلسل خوف و ہراس کی حالت میں تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد نہ صرف جزیرۃ العرب بلکہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر اسلام کی حکمرانی قائم ہوگئی اور اس کے دشمن تمام محاذوں پر شکست کھا گئے لیکن اس کے باوجود اسلام کی عالمی حکومت جو پوری دنیا پر قائم ہو، جو شرک و بت پرستی کا مکمل طور پر خاتمہ کر دے، امن وامان، آزادی اور توحید خالص کو تمام جگہوں پر پھیلا دے، ایسی حکومت ابھی تک وجود میں نہیں آئی ہے۔ پس اس کے وقوع پذیر ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔

روایت متواترہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس کے مطابق یہ امر امام مہدیؑ کے انقلاب کے زمانے میں حقیقت کا روپ دھارے

گا۔ بنابرایں، اس آیت کا ایک مصداق رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد کے ادوار میں حاصل ہوا ہے لیکن وسیع پیمانے پر اس کا وقوع امام مہدیؑ کے انقلاب کے زمانے میں ہوگا اور ان دو باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، اور یہ وعدہ الٰہی دونوں مرحلوں میں انجام پانا چاہیے۔

مذکورہ بالا آیت میں جس جانشینی اور خلافت کی بات ہوئی ہے، اس سے مراد سابقہ کافر اقوام کی حکومت کا خاتمہ اور اس کی جگہ حق کی حکومت کی جاگزینی ہے۔ جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۱۴ میں آیا ہے: ثُمَّ جَعَلْنَا كُمْ خلائِفَ فِي الارضِ مِنۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كيف تَعْلَمُونَ۔ یعنی: پھر ہم نے تمہیں ان (ظالم قوموں) کا روئے زمین پر جانشین بنایا تا کہ ہم دیکھیں تم کس طرح عمل کرتے ہو۔ اسی طرح کا مطلب سورہ اعراف کی آیت ۶۹ اور ۷۴ میں بھی بیان ہوا ہے۔

اس بنا پر (فخر رازی جیسے) جن افراد کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت پہلے چار خلفاء کی خلافت کی صحت پر واضح دلیل ہے کیونکہ وہ تھے جو پیغمبر اکرمؐ کے جانشین اور خلیفہ بنے اور ان کے دور میں یہ وعدہ الٰہی پورا ہوا، یہ افراد غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں کیونکہ مندرجہ بالا آیت خلافت رسولؐ کی طرف ناظر نہیں ہے بلکہ وہ گزشتہ اقوام کی خلافت اور جانشینی کو بیان کر رہی ہے جس طرح مذکورہ تین آیات میں موجود ہے اور جس طرح سورہ اعراف کی آیت ۱۳۷ میں آیا ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ

ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور کر دیئے گئے تھے اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنایا جسے ہم نے برکتوں سے نوازا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ آپ کے رب کا نیک وعدہ پورا ہو گیا کیونکہ انہوں نے صبر کیا تھا۔

واضح ہے کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے وراث بنے تھے اور اس وسیع و عریض اور پر برکت ملک (مصر اور اس کے اطراف) کے وہ حکمران بنے تھے۔ بہر حال آیت پوری دنیا پر صالح مومنین کی حکومت کی نوید اور بشارت دے رہی ہے جس کا ایک بڑا حصہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے بعد کے زمانے میں وقوع پذیر ہوا اگر چہ وہ پورے عالم تک نہ پھیل سکا۔ البتہ اس وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا ایک نمونہ تھا لیکن تمام روئے زمین پر عالمی حکومت کی صورت میں ابھی تک یہ وعدہ پورا نہیں ہوا اس کا کامل مصداق لوازمات فراہم ہونے کی صورت میں مشیت الٰہی سے حضرت امام مہدیؑ کی حکومت میں وجود میں آئے گا جب وہ احادیث نبویؐ اور معصومین کی روایات کے مطابق دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی اور ہم اس قرآنی وعدے کے منتظر ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں مختلف ماخذ میں جو روایات نقل ہوئی ہیں وہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں۔ مشہور مفسر قرطبی اپنی تفسیر ''الجامع الاحکام القرآن'' میں اسی آیت کے حوالے سے سلیم بن عامر کے ذریعے مقداد بن اسود سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خداؐ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَا عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ حَجَرٍ وَ لَا مَدَرٍ اِلَّآ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الاسلام

صفحہ زمین پر کوئی بھی مٹی یا پتھر کا گھر باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کو داخل کر دے گا۔[1]

تفسیر روح المعانی میں امام علی بن حسین- سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

هُم و اللهِ شِيْعَتُنَا اَهْلَ الْبَيْتِ يُفْعَلُ ذٰلِكَ بِهِمْ عَلٰى يَدِ رَجُلٍ مِنَّا وَ هُوَ مَهْدِيٌّ هذه الاُمَّةِ وَ هُوَ الّذِى قالَ رَسُولُ اللهِ (ص) فِيهِ لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنيا اِلاَّ يَوْمٌ واحِدٌ لَطَوَّلَ اللهُ تعالىٰ ذٰلِكَ الْيَوْمَ حَتّٰى يَلِيَ رَجُلٌ مِنْ عِتْرَتِي اِسْمُهُ اِسْمِي يَمْلَأُ الاَرْضَ عَدْلًا و قِسْطًا كم مُلِئَتْ ظُلْماً و جَوْرًا

خدا کی قسم وہ ہم اہل بیت کے شیعہ ہیں اللہ تعالیٰ یہ کام ہم میں سے ایک مرد کے ہاتھوں انجام دے گا وہ اس امت کے مہدیؑ ہوں گے یہ وہی ہیں جن کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر دنیا کی عمر میں سے ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس ایک دن کو اتنا طولانی کر دے گا یہاں تک کہ میری عترت سے ایک مرد جس کا نام میرے نام پر ہوگا اس زمین پر حکمران ہوگا اور وہ زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح پُر کر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔

اس حدیث کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ اہل بیت کے ماخذ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اگر چہ آلوسی نے روح المعانی میں اس حدیث کو مثبت نظر سے نہیں دیکھا ہے لیکن اس کے نیچے وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے ذرائع سے بعض روایات نقل ہوئی ہیں جو اس مطلب کی تائید کرتی ہیں اگر چہ ہم ان پر بھروسہ نہیں کرتے) جیسے عطیہ نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے مذکورہ آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا: اهل البیت هیهنا۔ یعنی: ''اہل بیتؑ یہاں پر ہیں'' اور قبلہ کی طرف اشارہ کیا۔[2]

قرطبی نے اس بارے میں ایک اور حدیث بھی بیان کی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

زُوِيَتْ لِيَ اَلْاَرْضُ فَرَأَيْتُ مشارِقَها و مَغَارِبَهَا وَ سَيَبْلُغُ مِلْكُ اُمّتي ما زُوِيَ لِي مِنْها

زمین میرے لیے سمیٹ دی گئی اور میں نے اس کے مشرق اور مغرب کو دیکھا ہے بہت جلدی میری امت کی حکومت اس تمام پر قائم ہوگی جو میرے سامنے سمٹ گئی (یعنی تمام روئے زمین)[3]

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے مذکورہ آیت کی تفسیر کے حوالے سے اہل بیت کے پیروکاروں پر مخالفین کے بہت سے اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ جس طرح ہم نے کہا ہے کہ اس وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کے مراحل ہیں، اس کا ایک مرحلہ

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۷، صفحہ ۴۶۹۲

[2] روح البیان، مذکورہ آیت کی تفسیر میں۔

[3] تفسیر قرطبی، مذکورہ آیت کی تفسیر میں۔

پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں صالح مومنین کے بارے میں وقوع پذیر ہوا۔ جب فتح مکہ اور جزیرۃ العرب پر اسلام کے تسلط کے بعد مسلمان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے زیر سایہ امن وامان کی زندگی گزارنے لگے اور علاقے کے بہت بڑے حصے پر حکومت کرنے لگے اس طرح اس آیت کے شان نزول نے عملی صورت اختیار کی۔

(اس آیت کے شان نزول کے بارے میں بہت سی تفسیروں جیسے اسباب النزول، مجمع البیان، فی ظلال القرآن اور تفسیر قرطبی (کچھ فرق کے ساتھ) میں بیان ہوا ہے کہ جب رسول خداؐ اور مسلمانوں نے مدینے کی طرف ہجرت کی اور انصار نے خندہ پیشانی اور کھلے دل سے ان کا استقبال کیا تو تمام عرب ان کے خلاف کمر بستہ ہو گئے۔ اور حالت یہ ہوگئی کہ مسلمان ہر وقت اسلحہ اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور ہو گئے، رات کو سوتے وقت اور صبح اٹھتے وقت اسلحہ اپنے ساتھ رکھنے لگے، اس صورت حال کا جاری رہنا مسلمانوں کے لیے بہت مشکل بن گیا۔ بعض افراد پوچھتے تھے کہ یہ حالت کب تک جاری رہے گی؟ ایسا وقت کب آئے گا جب ہم رات کو سکون سے سوئیں گے اور اللہ کے سوا کسی کا ہمیں ڈر نہیں ہوگا؟ اس موقعہ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور اس نے خوش خبری سنائی کہ یہ وقت جلد آنے والا ہے)

اس کا دوسرا مرحلہ خلفاء کے دور میں پورا ہوا جب دنیا کے ایک بڑے حصے پر اسلام کی حکومت قائم ہوئی اور مسلمان زیادہ امن و سکون سے رہنے لگے۔ لیکن اس کا تیسرا اور آخری مرحلہ یعنی اسلام کا ہمہ گیر ہونا، پوری دنیا پر اس کی حکمرانی مکمل امن وامان اور آرام وسکون کے ساتھ اور لشکر توحید کی لشکر شرک پر فتح وکامیابی ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوا ہے۔ اور یہ صرف حضرت مھدی - کے انقلاب کے دور میں واقع ہوگا۔ اور یہ تین باتیں جو ایک ہی حقیقت کے تین درجے ہیں، ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ الٰہی وعدہ، صاحبان ایمان اور عمل صالح رکھنے والے افراد کے ساتھ مختص ہے۔ یقینا جس دور اور زمانے میں یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو اللہ کی حاکمیت وحکمرانی کا یہ مرحلہ بھی مسلمانوں کے لیے پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اس کے برعکس جب بھی مسلمان شکست کھا جائیں اور مسلمان دشمن کے چنگل میں ذلیل وخوار ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وعدہ الٰہی کی یہ شرائط اور بنیادی اصولوں کو فراموش کر دیا گیا ہے، ایمان کمزور ہو گیا ہے اور اعمال فاسد اور گندے ہو گئے ہیں۔

۳۔ آیت ظہور حق

سورہ توبہ کی آیت ۳۳ میں ارشاد الٰہی ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝۳۳

وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اُسے تمام ادیان پر غالب کر دے اگر چہ مشرکین کو نا گوار ہی کیوں نہ ہو؟

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ آیت اس آیت کے بعد آئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَيَاۡبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنۡ يُّتِمَّ نُوۡرَهٗ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ۝۳۲

وہ اللہ کے نور کو پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں لیکن اللہ اپنے نور کو ہر صورت میں مکمل کرنا چاہتا ہے اگر چہ کافروں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔

گزشتہ آیت کی طرح ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے تمام ادیان پر اسلام کے غلبے اور فتح کا وعدہ دیا ہے۔ تمام ادیان پر اسلام کی فتح و کامیابی سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے بہت احتمال ذکر کیے ہیں۔ فخر رازی نے یہاں پر پانچ تفسیری احتمالات بیان کیے ہیں جو درحقیقت اس غلبے اور کامیابی کی کیفیت کے بارے میں سوالات کا جواب ہیں:

۱۔ غلبے اور کامیابی سے مراد نسبی (جزوی) اور علاقائی کامیابی ہے کیونکہ ہر علاقے میں اسلام ہر دین اور مذہب پر کامیاب اور غالب ہوا ہے۔

۲۔ اس سے مراد جزیزۃ العرب کے ادیان پر غلبہ اور کامیابی ہے۔

۳۔ اس سے مراد تمام ادیان الٰہی سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ کرنا ہے۔ (یہاں پر لفظ "لِيُظۡهِرَ" کا معنی آگاہ کرنا کیا گیا ہے)

۴۔ اس سے مراد دلائل اور منطق کے اعتبار سے کامیابی اور غلبہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دلائل کو دیگر ادیان پر کامیاب اور غالب کرے گا۔

۵۔ اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ کے آسمان سے نزول اور قیام مہدیؑ کے موقع پر اسلام کی تمام ادیان اور مذاہب پر مکمل کامیابی اور غلبہ ہے جب اسلام پوری دنیا پر چھا جائے گا۔

بلاشک آیت کی منطقی دلائل کے لحاظ سے کامیابی سے تفسیر کرنا اور وہ بھی مستقبل میں وعدہ الٰہی کے طور پر ایک غیر معقول تفسیر ہے کیونکہ اس لحاظ سے یعنی منطق دلائل کے اعتبار سے اسلام پہلے دن سے غالب اور کامیاب تھا۔ علاوہ ازیں "ظہور" اور "اظہار" (لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّه) کے الفاظ کا معنی عینی اور واقعی غلبہ ہے جیسا کہ ان الفاظ کے قرآن مجید میں استعمال کے مقامات سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اصحاب کہف کے واقعے میں قرآن فرماتا ہے:

اِنَّهُمۡ اِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ يَرۡجُمُوۡكُمۡ (کہف/۲۰)

اگر وہ تم پر غلبہ پالیں تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

سورہ توبہ کی آیت نمبر ۸ میں آیا ہے:

كَيۡفَ وَاِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ لَا يَرۡقُبُوۡا فِيۡكُمۡ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ

(ان عہد و پیمان کی اہمیت) کیونکر ہو سکتی ہے جب کہ یہ تم پر غالب آجائیں تو نہ کسی قرابت اور ہمسائیگی کا خیال کریں گے اور نہ کسی عہد و پیمان کو دیکھیں گے۔

واضح ہے کہ نہ تو اصحاب کہف کی قوم کے بت پرست اور نہ ہی مکہ کے بت پرست خدا پرستوں پر منطقی دلائل کے اعتبار سے ہر گز غلبہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا غلبہ مادی اور واقعی تھا بنابرایں دیگر تمام ادیان پر اسلام کے غلبے سے مراد بھی مادی، واقعی اور عینی غلبہ ہے نہ کہ منطقی اور ذہنی۔ جیسا کہ اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے کہ اس غلبے کے مختلف مراحل ہیں:

اس کا ایک مرحلہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مکمل ہوا اس سے وسیع سطح پر مرحلہ آپ کے بعد والے ادوار میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور اس کا آخری مرحلہ امام مہدیؑ کے انقلاب کے موقعہ پر حاصل ہوگا کیونکہ آیت شریفہ اسلام کے تمام ادیان پر غلبے کی بات بلا قید وشرط کے کر رہی ہے اور بلا قید وشرط اور مطلق غلبہ مکمل طور پر اس صورت میں واقع ہوتا ہے جب تمام روئے زمین پر چھا جائے جیسا کہ رسول اکرمؐ کی روایت میں آیا ہے جس میں آپ نے فرمایا؛

لَا يَبْقَىٰ عَلَىٰ ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللهُ كَلِمَةَ الاسلام

روئے زمین پر کوئی گھر نہ پتھر کا اور نہ مٹی کا، نہ کوئی اون اور بالوں سے بنا ہوا خیمہ، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کلمہ اسلام اس میں داخل کر دے گا۔[1]

اس طرح کا مطلب تفسیر الدر المنثور میں، سعید بن منصور، ابن منذر سے اور بیہقی نے سنن میں جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں کہا: ''لَا يَكُونُ ذٰلِكَ حَتّٰى لَا يَبْقٰى يَهُودِيٌّ وَلَا نَصرانِيٌّ صَاحِبُ مِلَّةٍ إِلَّا الإِسْلَامُ۔ یعنی: ''یہ معنی اس وقت واقع ہوگا جب کوئی بھی یہودی اور عیسائی اپنے مذہب پر قائم نہیں رہے گا۔ بلکہ اسلام قبول کرلے گا۔'' (یعنی یہ سب اسلام کے سایے میں آجائیں گے اور ہر جگہ اسلام، کلمہ توحید اور خداوند کی عظمت و بزرگی کی بات ہوگی)[2]

سچ ہے کہ اس عظیم دن میں یہ عظیم وعدہ الٰہی وقوع پذیر ہوگا:

ہمہ جا نغمہ قرآن و دعا خواہد بود
ھمہ جا غلغل تسبیح و ثنا خواھد بود
بانگ تکبیر زھر بام و دری برخیزد
عیش دجال مبدل بہ عزا خواھد شد
عالم آن گونہ کہ از ظلم و ستم پر گشتہ
پر ز انوار عدالت ھمہ جا خواھد شد
اھرمن خیمہ ز اطراف جھاں برچیند

---

[1] مجمع البیان مذکورہ آیت کی تفسیر میں۔

[2] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۳۱

ھمہ جا مظہر انوار خدا خواھد شد!

ہر جگہ پر قرآن اور دعا کے نغمے ہوں گے اور ہر طرف تسبیح وحمد وثنا کا شور وغل ہوگا، تکبیر کی آواز ہر در و دیوار سے بلند ہوگی دجال کی زندگی اجیرن اور غم زدہ ہو جائے گی دنیا جس طرح ظلم وستم سے بھری ہوگی اسی طرح عدل وانصاف سے بھر جائے گی۔ شر اور برائی اپنی بساط دنیا سے لپیٹ لیں گے اور ہر جگہ انوار الٰہی کا مظہر بن جائے گی۔

مذکورہ آیت کی تفسیر میں یہی بات امام صادق -سے بھی نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

وَ اللهِ ما نَزَلَ تأويلُها بَعْدُ وَ لَا يَنْزِلُ تأويلُها حتىّ يَخْرُجَ القائِم فاذا خَرَجَ القائِمُ لَمْ يَبْقَ كافِرٌ بِاللهِ العظيم

اللہ کی قسم ابھی تک اس آیت کا مطلب عملی (آخری مرحلہ تک) نہیں ہوا ہے اور صرف یہ اس وقت واقع ہوگا جب حضرت قائم خروج کریں گے اور ان کے قیام کے وقت خدا کا انکار کرنے والا کوئی بھی دنیا میں باقی نہیں رہے گا۔[1]

یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ جملہ ''هُوَ الّذِی اَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدی وَ دِيْنِ الحَقّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّه'' قرآن کی تین سورتوں میں ہے۔ پہلی سورہ توبہ آیت ۳۳ (جس کا ذکر گذر چکا ہے) دوسری سورہ فتح آیت نمبر ۲۸، تیسری سورہ صف آیت ۹/۔ اس مطلب کا تکرار بتاتا ہے کہ قرآن مجید نے زیادہ سے زیادہ اصرار کے ساتھ اس مسئلے کو بیان کیا ہے۔ اہل سنت کی کتب میں ایک اور حدیث ابوھریرہ سے منقول ہے اس میں ہے کہ ''ليظهره على الدين كله'' کے جملے سے مراد حضرت عیسیٰ -کا خروج ہے۔ (اور ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ کا خروج حضرت مہدیؑ کے انقلاب کے موقع پر ہوگا) (۱)

اس موضوع کو ایک اور حدیث کے بیان کرنے پر ختم کرتے ہیں جسے مشہور مفسر قرآن جناب قتادہ سے نقل کیا گیا ہے وہ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: اَلْاَدْيانُ سِتَّةٌ الّذِينَ آمَنُوا، و الّذِينَ هَادُوا، الصّائِبِيْنٌ، و النَّصارىٰ، و المَجُوسُ الّذِيْنَ اَشْرَكُوا، فالاَدْيَانُ كُلُّها تَدْخُلُ فِي دِيِنِ الاسلام۔ یعنی: دنیا میں کل دین چھ ہیں: الذین آمنو (مسلمان) یہودی، ستارہ پرست، عیسائی مجوسی اور مشرکین، یہ سب ادیان اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔

واضح ہے کہ یہ بات ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے یہ امر صرف اور صرف امام مہدی -کے قیام کے وقت وقوع پذیر ہوگا۔ یہ نکتہ بھی قابل ملاحظہ ہے کہ دین یہود اور مسیحیت کے خاتمہ کا مطلب مکمل خاتمہ نہیں بلکہ اس سے مراد اسلام کی ساری دنیا پر حاکمیت ہے۔ (غور کیجیے گا)

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۲۱۲۔

ظہور مہدیؑ کے انتظار کے اثرات

بعض نادان لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مذکورہ آیات اور روایات کی بنیاد پر ظہور مہدیؑ کا انتظار، جمود، پسماندگی یا ذمہ داریوں اور مسئولیت سے فرار اور ظلم وستم سے آگے سر تسلیم خم کرنے کا موجب بن سکتا ہے کیونکہ اس عظیم ظہور کے نظریے کا معنیٰ یہ ہے کہ اس سے پہلے دنیا کی اصلاح اور بہتری سے ناامید ہونا ہے بلکہ ظلم وفساد کے پھیلاؤ میں مدد کرنا ہے تاکہ ان کے ظہور کی راہ ہموار ہو سکے۔

یہ وہ اعتراض ہے جو سالوں سے قیام مہدیؑ کے منکروں اور مخالفوں کی زبانوں پر جاری ہے۔ابن خلدون نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ مطلب بالکل برعکس ہے۔اس عظیم ظہور کا انتظار بہت زیادہ مفید اور تعمیری ہے اس کے بارے میں مختصر طور پر ہم روشنی ڈالیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس قسم کی رائے قائم کرنا جلد بازی ہے اور معقول نہیں کہ ایسے موضوع کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے کوئی نظریہ قائم کر لیا جائے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہو اور شیعہ اور سنی کی مشہور اور اہم ترین کتب میں مذکورہ احادیث متواترہ میں بھی واضح طور پر موجود ہو۔

انتظار کی حقیقت اور اس کے مفید اثرات

بحث یہ تھی کہ کیا ظہور مہدی - پر ان کے دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دینے اور ظلم وستم کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے عالمی منصوبے کے ساتھ ایمان کے مثبت اور مفید تربیتی اثرات ہیں یا اس کے منفی اثرات ہیں؟ کیا اس قسم کے ظہور پر ایمان انسان کو اس طرح سے خیالی افکار میں غرق کر دیتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے غافل ہو جاتا ہے اور ہر قسم کے حالات کو قبول کر لیتا ہے اور سر تسلیم خم کر دیتا ہے؟ یا یہ کہ واقعاً یہ عقیدہ ایک طرح کے قیام اور افراد سازی اور معاشرہ سازی کی دعوت ہے؟ کیا یہ عقیدہ اور نظریہ انسانوں میں تحرک پیدا کرتا ہے یا جمود؟ کیا یہ احساس ذمہ داری کا باعث بنتا ہے یا پھر ذمہ داریوں سے بھاگنے کا بہانہ بنتا ہے؟ کیا یہ سلانے والا ہے یا بیدار کرنے والا ہے؟

ان سوالات پر تحقیق اور ان کے جوابات دینے سے پہلے ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ بہترین تعلیمات اور بہت زیادہ تعمیری افکار جب بھی نااہل، ناتجربہ کار اور مفاد پرست افراد کے ہاتھوں میں آئیں گے ممکن ہے وہ انہیں اس طرح مسخ کر دیں کہ وہ اصلی ہدف کے بالکل برخلاف نتیجہ دیں اور بنیادی مقصد کی مخالف سمت میں حرکت کریں اس قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں اور انتظار کا موضوع بھی سی قبیل سے ہے جیسا کہ آپ اس کا ملاحظہ کریں گے۔

لہٰذا اس قسم کے موضوعات کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے ہر قسم کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے بقول کسے آب را از سر چشمہ گرفت، پانی کو سرچشمہ سے لینا چاہیے۔تاکہ نہروں اور نالوں اور بیچ کے ذریعوں کی آلودگی اس میں شامل نہ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم انتظار کے موضوع کے حوالے سے اسلامی بنیاد اور اصل کی طرف رجوع کریں اور ان گوناگوں روایات کی تحقیق کریں جو مسئلہ انتظار پر بہت تاکید کرتی ہیں تاکہ ہم اصلی مقصد سے آگاہ ہو جائیں۔

چندروایات میں غوروفکر کریں

کسی نے امام صادق - سے پوچھا کہ اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو اماموں کی ولایت پر ایمان رکھتا ہے اور حق کی حکومت کا انتظار کر رہا ہے اور اس حالت میں دنیا سے چلا جاتا ہے؟ امام - نے جواب میں فرمایا:

هُوَ بِمَنْزِلَةِ مَنْ كَانَ مَعَ القائِمَ فِي فُسْطَاطِهِ. ثُمَّ سَكَتَ هُنَيْئَةً. ثُمَّ قَالَ: هُوَ كَمَنْ كَانَ مَعَ رَسُولِ اللهِ

وہ اس شخص کی طرح ہے جو قائد انقلاب (قائم) کے خیمے (فوجی کیمپ) میں اس کے ساتھ ہو پھر تھوڑی سی خاموشی اختیار کی پھر فرمایا وہ اس شخص کی مانند ہے جو رسول اللہؐ کے ساتھ جہاد میں شریک رہا ہو۔[1]

بالکل یہی بات بہت ساری روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

۲۔ بعض روایات میں 'بِمَنْزَلَةِ الضَّارِبِ بِسَيْفِهِ فِي سَبِيلِ الله' کے الفاظ آئے ہیں جن کا معنی ہے راہ خدا میں تلوار چلانے والے جیسا۔

۳۔ بعض میں آیا ہے: 'كَمَنْ قَارَعَ مَعَ رَسُولِ اللهِ بِسَيْفِهِ' یعنی اس شخص کی طرح ہے جس نے رسول اللہ کی ہمراہی میں تلوار سے دشمن کے سر پر وار کیا ہو۔

۴۔ چندروایات میں یہ جملہ ہے: 'بِمَنْزَلَةِ مَنْ كَانَ قَاعِدًا تَحْتَ لِوَاءِ القَائِمِ' یعنی وہ اس کی طرح ہے جو قائم کے پرچم کے نیچے ہو۔

۵۔ بعض میں یہ الفاظ ذکر ہوئے ہیں: 'بِمَنْزَلَةِ الْمُجَاهِدِ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللهِ (ص)' اس شخص کی طرح ہے جس نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جہاد کیا ہو۔

۶۔ بعض میں ہے کہ: ''بِمَنْزَلَةِ مَنِ اسْتَشْهَدَ مَعَ رَسُولِ اللهِ'' وہ اس شخص کی طرح ہے جو رسول اللہ کے ہمراہ شہید ہوا ہو۔

ان چھ روایات میں انتظار ظہور مہدیؑ کے بارے میں یہ سات تشبیہات ذکر ہوئی ہیں جو اس حقیقت کو بیان کر رہی ہیں کہ انتظار کے مسئلہ کا اور جہاد اور دشمن سے آخری شکل میں جنگ کے درمیان ایک قسم کا رابطہ اور شباہت موجود ہے (غور کیجیے گا)

۷۔ متعدد روایات میں ایسی حکومت کا انتظار کرنا افضل ترین عبادت بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقولہ بعض احادیث میں اور بعض امیر المومنینؑ سے منقولہ احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا: ''اَفْضَلُ اَعْمَالِ اُمَّتِي اِنْتِظَارُ الفَرَجِ مِنَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ یعنی: ''میری امت کا اعلیٰ ترین عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے گشائش کا انتظار کرنا ہے۔''[2]

---

[1] محاسن برقی، بحارالانوار (طباعت قدیم) جلد ۱۳، صفحہ ۱۳۶ سے نقل کے مطابق

[2] کافی، بحارالانور، ج ۱۳، ص ۱۳۷ سے نقل کے مطابق۔

ایک اور حدیث نبویؐ میں آیا ہے: اَفضَلُ العبادةِ اِنتِظارُ الفَرَجِ[1] یعنی: ''کشائش کا انتظار اعلیٰ ترین عبادت ہے۔''
یہ حدیث ہمارے زیر بحث موضوع انتظار کی اہمیت کو واضح کرتی ہے خواہ ہم انتظار 'فَرَج' کا عام معنی مراد لیں یا خاص معنی یعنی عالمی مصلح کے ظہور کا انتظار۔ یہ تمام کلمات اور الفاظ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس طرح کا انقلابی انتظار کرنا ہمیشہ ایک وسیع اور مختلف پہلوؤں سے جہاد کے ساتھ ہے۔ یہ مطلب آپ کے ذہن میں رہے، اب ہم انتظار کے مفہوم کو بیان کریں گے اور پھر مجموعی طور پر نتیجہ اخذ کریں گے۔

انتظار کا مفہوم

انتظار عام طور پر ایسی حالت کو کہا جاتا ہے جب انسان موجودہ حالت سے بیزار ہو اور اس کو بہتر کرنے کے لیے کوشش کرے۔ مثال کے طور پر بیمار جو صحت مند ہونے کے انتظار میں ہوتا ہے یا باپ جو بیٹے کے سفر سے واپسی کا انتظار کر رہا ہے۔ بیمار اپنی بیماری اور باپ اپنے بیٹے کی جدائی پر پریشان اور ناراحت ہے اور بہتر صورت حال کے لیے کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح وہ تاجر جو کساد بازاری سے تنگ اور پریشان ہے وہ اقتصادی بحران کے ختم ہونے کا انتظار کرتا ہے اس میں دو حالتیں ''موجودہ حالت سے بیزاری'' اور ''اسے بہتر بنانے کے لیے سعی و کوشش''، موجود ہوتی ہیں۔

لہٰذا امام مہدیؑ کی حق و عدالت کی حکومت اور عالمی مصلح کے قیام کے انتظار کا مسئلہ درحقیقت دو عنصر سے مرکب ہے ایک عنصر منفی اور دوسرا عنصر مثبت ہے منفی عنصر وہی موجودہ حالت سے بیزاری اور مثبت عنصر حالات کی بہتری کی خواہش ہے۔ اگر یہ پہلو انسان کی روح میں جڑ پکڑ لیں تو پھر دو قسم کے اعمال کا سرچشمہ بن جائیں گے۔ اعمال کی یہ دو قسمیں یہ ہیں، ایک ظلم و فساد کے عوامل سے ہر طرح کے تعاون اور ہم آہنگی کو ترک کرنا بلکہ ان سے مقابلے اور لڑائی کرنا ہے۔ دوسری اپنی اصلاح اور خود سازی اور اس یگانہ عالمی اور عوامی حکومت کے قیام کے لیے جسمانی، روحانی، مادی اور معنوی طور پر آمادہ اور تیار ہونا ہے۔

اچھی طرح غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ دونوں قسمیں تعمیری ہیں اور انسان کے اندر تحرک، آگہی اور بیداری کا موجب ہیں۔ انتظار کے اصلی معنی اور مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ بالا متعدد روایات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو منتظرین کے کام کے نتیجے اور اجر و ثواب کو بیان کرتی ہیں، اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں حقیقی منتظرین کا شمار ان افراد میں کیا گیا ہے جو امام مہدیؑ کے خیمہ میں یا ان کے پرچم کے نیچے ہوں گے یا وہ اس کی طرح ہیں جس نے راہ خدا میں تلوار چلائی ہو یا اپنے خون میں غلطاں ہوا ہو یا شہید ہوا ہو۔ کیا یہ حق و عدالت کے راستے میں جہاد و کوشش کے مختلف درجات اور مراحل کی طرف اشارہ نہیں ہے جو افراد کی آمادگی کے لحاظ اور انتظار کے درجے کے اعتبار سے ہیں؟

یعنی جس طرح سے مجاہدین کی خدا کے راستے میں جانثاری اور کردار مختلف ہے اسی طرح انتظار خودسازی اور آمادگی کے بھی بالکل مختلف درجات ہیں اور ان میں ہر ایک مقدمات اور نتیجے کے لحاظ سے اول الذکر درجات سے مشابہ ہیں۔ دونوں جہاد ہیں۔ دونوں کے

---

[1] ایضاً، ج۱۴، ص۶۳۱ سے نقل کے مطابق۔

لیے آمادگی اور تیاری لازم ہے اور دونوں کے لیے خودسازی کی ضرورت ہے جو شخص اس قسم کی حکومت کے قائد ورا ہنما کے خیمے میں ہو یعنی وہ ایک بین الاقوامی حکومت کے احکام کے صدور کے مرکز میں ہے وہ ایک غافل، بے خبر اور لاتعلق فرد نہیں ہوسکتا۔ وہ جگہ ہر کسی کے لیے نہیں ہے یہ ان افراد کا مقام ہے جو واقعاً اس صلاحیت اور حیثیت کے لائق اور اہل ہیں۔

اسی طرح جس کے ہاتھ میں اسلحہ ہے وہ اس انقلاب کے قائد ورہبر کے سامنے عدل وانصاف اور امن وآشتی کی اس حکومت کے مخالفین کے ساتھ جنگ کرتا ہے اس کے لیے فکری، روحانی اور جنگی لحاظ سے بہت زیادہ تیاری اور آمادگی کی ضرورت ہے۔ ظہور امام مہدیؑ کے انتظار کے حقیقی اثرات سے مزید معلومات کے لیے درج ذیل وضاحت پر غور کریں۔

اگر میں خود ظالم اور ستم گر ہوں تو میں اس کا منتظر کیسے ہوسکتا ہوں جس کی تلوار ستم گروں کے خون کی پیاسی ہے؟ اگر میں خود فاسق و فاجر ہوں تو میں اس کا انقلاب کیسے انتظار کر سکتا ہوں جس کا پہلا شعلہ ہی فاسقوں اور فاجروں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا؟ وہ فوج جو ایک بڑے جہاد اور جنگ کی منتظر ہے وہ اپنی جنگی قوت اور افراد کو بڑھاتی ہے ان کے اندر روح انقلاب پھونکتی ہے اور ہر قسم کی کمزوری اور خامی کی اصلاح کرتی ہے۔ کیونکہ انتظار کی کیفیت ہمیشہ اس ہدف اور مقصد کے مطابق اور متناسب ہوتی ہے جس کے انتظار میں ہم ہوتے ہیں۔

ایک عام سفر سے مسافر کے آنے کا انتظار

ایک قریبی دوست کی واپسی کا انتظار

درخت سے پھل چننے اور فصل کے کاٹنے کے موسم کا انتظار

ان میں سے ہر ایک انتظار ایک طرح کی آمادگی اور تیاری سے آمیختہ ہے۔ ایک میں گھر کو تیار کرنا چاہیے اور مہمان نوازی کے لوازمات پورے کرنے چاہیں اور دوسرے میں ضروری اوزار درانتی، تھریشر وغیرہ کو تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب غور وفکر کریں کہ وہ لوگ جو ایک عظیم عالمی مصلح کے قیام کا انتظار کر رہے ہیں درحقیقت وہ ایسے انقلاب، تبدیلی اور تغیر کے منتظر ہیں جو پوری تاریخ انسانیت میں بنیادی ترین اور وسیع ترین انسانی انقلاب ہے۔ ایک ایسا انقلاب جو سابقہ انقلابوں کے برخلاف علاقائی نہیں بلکہ بین الاقوامی بھی ہے اور ہمہ گیر بھی، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور جوانب کو شامل ہے خواہ وہ سیاسی ہوں یا ثقافتی، اقتصادی ہوں یا اخلاقی۔

پہلا فلسفہ: خودسازی

اس قسم کا تغیر وتبدل ہر چیز سے پہلے آمادگی رکھنے والے، باقدر و قیمت اور قابل اہمیت انسانوں کا محتاج ہے جو پوری دنیا میں اس قسم کی وسیع اصلاحات کے سنگین بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے فکر وآگہی کی سطح کو بلند کرنے کی ضرورت ہے اور اس عظیم پروگرام علمی جامعہ پہنانے کے لیے تعاون اور ساتھ دینے کے لیے روحانی اور فکری آمادگی کی ضرورت ہے تنگ نظری، کوتاہ بینی، کج فکری، حسد، بچگانہ اور جاہلانہ اختلافات اور کلی طور پر ہر قسم کی منافقت اور انتشار، حقیقی منتظرین، کے شایان شان قطعاً نہیں ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ایسے اہم انقلاب کے حقیقی منتظر کا کردار کبھی تماشا دیکھنے والے کا نہیں ہوسکتا ہے اُسے ابھی سے انقلابیوں کی صف میں ہونا چاہیے۔اس انقلاب اور تبدیلی کے اثرات اور نتائج پر ایمان ہرگز اُسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ مخالفین کی صف میں شامل ہو۔ حامیوں کی صف اور زمرے میں شامل ہونے کے لیے نیز پاکیزہ اعمال کی ضرورت ہے اسی طرح پاکیزہ روح، اخلاقی جرات اور کافی آگاہی کا ہونا بھی ضروری ہے۔

میں اگر غلط اور بُرا ہوں تو پھر کس طرح ایسے نظام کا انتظار کروں گا جس میں بُرے اور غلط افراد کا نہ صرف کوئی کردار نہیں ہے بلکہ اس میں وہ قابل نفرت اور مردود ہوں گے۔کیا یہ انتظار روح اور فکر کے تصفیہ کے لیے اور جسم و جان کو گندگی اور آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟

وہ فوج جو آزادی دلانے کے لیے جہاد کی خواہاں ہے وہ مکمل آمادہ اور تیار ہوگی ایسے میدان جنگ کے لیے جس قسم کے اسلحہ کی ضرورت ہے وہ اِسے حاصل کرے گی، جہاں مورچے بنانے ضروری ہیں وہ بنائے گی اپنے افراد کی جنگی تیاریوں کو عروج پر لے جائے گی اپنے سپاہیوں کی ہمت اور جذبے بڑھائی گی ان میں سے ہر فرد کے دل میں اس قسم کی جنگ کو شوق اور جذبے کو زندہ رکھے گی۔جس فوج میں اس طرح کی تیاری اور آمادگی نہ ہو وہ ہرگز منتظر نہیں ہے اگر وہ کہتی ہے تو جھوٹ بولتی ہے۔

ایک عالمی مصلح کے انتظار کا مطلب پوری دنیا کی اصلاح کے لیے فکری، اخلاقی، مادی اور معنوی لحاظ سے مکمل آمادگی ہے آپ سوچیں یہ آمادگی اور تیاری کس قدر تعمیری اور سودمند ہے تمام روئے زمین کی اصلاح اور تمام مظالم اور ناانصافیوں کا خاتمہ کرنا کوئی مذاق اور معمولی بات نہیں ہے اس طرح کے عظیم مقصد اور ہدف کے لیے آمادگی اور تیاری بھی اسی وسعت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ہونی چاہیے۔

اس قسم کے انقلاب کے لانے کے لیے بڑے بڑے عظیم پُرعزم، بہت طاقتور، ناقابل شکست، غیر معمولی طور پر پاکیزہ، مکمل تیار، بابصیرت، دوراندیش اور نگاہ بلند رکھنے والے مردوں کا ہونا ضروری ہے۔ایسے ہدف اور مقصد کے لیے خودسازی کا لازمہ یہ ہے کہ دقیق اور عمیق اخلاقی، فکری اور معاشرتی پروگراموں کا اجراء کیا جائے۔ یہ ہے حقیقی انتظار کا مطلب۔کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا انتظار تعمیری نہیں ہے؟

دوسرا فلسفہ: معاشرہ سازی

حقیقی منتظرین کا صرف یہ فریضہ نہیں ہے کہ اپنی اصلاح اور تزکیہ کریں بلکہ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ دوسروں کا بھی خیال رکھیں اپنی خودسازی کے ساتھ دوسروں کی بھی اصلاح کی کوشش کریں کیونکہ جس عظیم اور بھاری پروگرام کے وہ منتظر ہیں وہ کوئی انفرادی پروگرام نہیں ہے وہ ایک ایسا پروگرام ہے جس میں انقلاب کے تمام عناصر شریک ہوں، کام کو اجتماعی طور پر اور سب مل کر انجام دیں تمام کوشیش اور سرگرمیاں آپس میں ہم آہنگ ہوں اس ہم آہنگی کی وسعت اور گہرائی اُسی عالمی اور بین الاقوامی انقلاب کی عظمت اور بزرگی کے مطابق ہو جس کا وہ انتظار کررہے ہیں۔

ایک وسیع اور اجتماعی میدان جنگ میں کوئی بھی فرد دوسرں کے حال سے غافل اور بے خبر نہیں رہ سکتا بلکہ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ جہاں بھی کوئی خامی دیکھے اس کی اصلاح کرئے اور ہر نقصان پہنچانے والے سوراخ کو بند کردے، جہاں کوئی کمزوری اور ضعف دکھائی دے اُسے قوی کر دے کیونکہ تمام جنگ کرنے والوں کی فعال، ہم آہنگ اور باہم مربوط شرکت کے بغیر اس پروگرام کو عملی جامعہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ بنا بر ایں حقیقی منتظرین اپنی اصلاح اور خودسازی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی اصلاح کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ ایک عالمی مصلح کے قیام کے انتظار کا یہ ایک اور مفید اثر ہے اور یہ ہے ان تمام فضلیتوں کا فلسفہ جو حقیقی منتظرین کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

تیسرا فلسفہ: حقیقی منتظر کبھی فاسد ماحول کے رنگ میں رنگے نہیں جاتے

انتظار مہدیؑ کا ایک اور اہم ترین فائدہ اور اثر فاسد ماحول میں نہ ڈھلنا اور گناہوں اور پلیدیوں کے سامنے نہ جھکنا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب فساد اور خرابیاں ہر طرف پھیل جاتی ہیں جو لوگوں کی بہت بڑی تعداد یا اکثریت کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہیں اور کبھی پاکیزہ افراد نفسیاتی لحاظ سے بند گلی میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس بند گلی کا سرچشمہ اصلاح سے مایوسی ہوتا ہے۔

بعض اوقات وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ پانی سر سے گزر گیا ہے اب بہتری اور اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے لہذا اپنے آپ کو پاکیزہ رکھنا فضول ہے۔ یہ مایوسی اور نا اُمیدی ممکن ہے انہیں بتدریج برائی اور ماحول کے ساتھ ہم رنگ ہونے کی طرف کھینچ لے جائے اور یہ ایک صالح اقلیت کے طور پر فاسد اور بری اکثریت کے مقابلے پر اپنی حفاظت نہ کر سکیں اور ہم رنگ جماعت نہ ہونے کو اپنے لیے ذلت و رسوائی کا موجب سمجھیں۔

صرف ایک چیز ان کے اندر اُمید کی کرن جگا سکتی ہے اور انہیں ڈٹ جانے اور اپنی حفاظت پر آمادہ کر سکتی ہے اور انہیں بُرے اور فاسد ماحول میں ڈھلنے سے بچا سکتی ہے اور وہ ہے قطعی اور آخری اصلاح کی امید صرف اس صورت میں وہ اپنی پاکیزگی کی حفاظت اور دوسروں کی اصلاح کی کوششوں سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات میں بخشش و آمرزش سے مایوسی کو گناہان کبیرہ میں شمار کیا گیا ممکن ہے کہ بعض جاہل افراد تعجب کا اظہار کریں کہ کیوں اللہ کی رحمت سے مایوسی کو اتنی اہمیت دی گئی ہے، بہت سے گناہوں سے زیادہ اہم؛ درحقیقت اس کی وجہ اور فلسفہ یہی ہے کہ رحمت سے مایوس گناہگار کے پاس اپنے گناہوں کے ازالے یا کم از کم گناہوں سے ہاتھ اٹھانے کی کوئی وجہ یا دلیل نہیں ہوتی، اس کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اب پانی میرے سر سے گذر چکا ہے کیا ایک فٹ اور کیا دس فٹ! اب جب کہ میں بدنام ہو ہی گیا تو پھر کسی کی مجھے کیا پروا! کالے رنگ سے اوپر تو کوئی کالک نہیں ہے۔ میرا انجام جہنم ہے اب جب کہ میں نے دوزخ خرید لی ہے اب مجھے کس کا ڈر ہے؟ اور اس طرح کی باتیں۔

لیکن جب اس کے لیے امید کا دریچہ کھل جائے، رب کی عفو و درگذر کی امید، اپنی حالت میں تبدیلی کی امید، تو یہ اس کی زندگی میں تبدیلی کا نقطہ آغاز ہوگا اور اُسے گناہوں کے راستے پر کھڑے رہنے سے روکے گا اور اُسے پاکیزگی اور اصلاح کی طرف لوٹنے کی دعوت

دے گا۔اسی وجہ سے ہمیشہ بُرے لوگوں میں امید کوایک موثر تربیتی عامل کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح وہ صالح افراد جو بُرے اور فاسد ماحول میں پھنسے ہوئے ہیں وہ امید کے بغیر اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسے مصلح کے ظہور کے انتظار کا نفسیاتی اثر اس پر عقیدہ رکھنے والے افراد میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

دنیا جس قدر فاسد اور خراب ہوتی جاتی ہے۔اس کے ظہور کی امید اتنی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔یہی روز افزوں امید برائی کی تیز وتند اور طاقت ور موجوں کے مقابلے پر ان کا بیمہ کردیتی ہے۔یہ لوگ نہ صرف ماحول میں برائی اور گناہوں کے پھیلنے سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ ''وعدہ وصل چون شود نزدیک۔آتش عشق تیز تر گردد'' (جوں جوں وصل کا وعدہ نزدیک ہوتا ہے عشق کی آگ تیز ہوتی جاتی ہے) کے مطابق جب وہ ہدف کے حصول کو وہ اپنے سامنے دیکھتے ہیں تو برائی اور فساد سے مقابلے اور اپنی حفاظت کی کوششیں اور زیادہ شوق اور عشق سے انجام پاتی ہیں۔

گذشتہ بحث سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انتظار کا تخریبی اثر صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب اس کا مفہوم مسخ ہو یا اس میں تحریف کی جائے۔جس طرح اس کے بعض مخالفین نے تحریف کی ہے اور بعض حامیوں نے اسے مسخ کیا ہے۔لیکن اگر اس کا حقیقی معنی اور مفہوم فرد اور معاشرے میں لاگو ہو تو یہ تربیت،خودسازی،تحرک اور امید کا اہم ترین سبب بن جاتا ہے۔ان واضح دلائل میں سے جو اس مطلب کی تائید کرتے ہیں یہ آیت ہے:

وَعَدَ اللهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الارضِ....

اللہ کا ان لوگوں کے ساتھ وعدہ ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے کہ روئے زمین پر حکومت ان کے حوالے کرے گا۔

اور اسلام کے عظیم پیشواؤں سے نقل ہوا ہے کہ اس آیت سے مراد امام مہدیؑ اور ان کے اصحاب ہیں: ''هُوَ القائِمُ وَ اَصْحَابُهُ ''[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ: ''نَزَلَتْ فِي المَهْدِي ''یعنی: ''یہ آیت حضرت مہدی = کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔'' اس آیت میں حضرت امام مہدی- اور ان کے اصحاب وانصار (الّذِين آمَنُوا مِنْكُمْ و عَمِلُوا الصالحات۔یعنی: ''جو تم میں سے ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے) کا تعارف کرایا گیا ہے۔

لہٰذا یہ بین الاقوامی انقلاب،ایمان کامل اور محکم یقین کے بغیر واقع نہیں ہوسکتا،ایسا محکم ایمان جو ہر قسم کی کمزوری،ناتوانی اور ضعف کو دور کردے۔اسی طرح یہ انقلاب ایسے صالح اعمال کے بغیر بھی ممکن نہیں جو دنیا کی اصلاح کا راستہ ہموار کردیں۔اور وہ لوگ جو اس قسم کے انقلاب کے منتظر ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ایمان اور علم وآگہی کی سطح کو بلند کریں اور اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہیں۔

---

[1] بحارالانوار(پرانی چھاپ(جلد ۱۳،صفحہ ۱۴)

ایسے افراد ہی ان کی حکومت میں شمولیت اور شرکت کی نوید اپنے آپ کو دے سکتے ہیں نہ کہ وہ جو ظلم و ستم کے ساتھ سروکار اور تعاون کرتے ہیں نہ وہ جو ایمان اور عمل صالح سے بے بہرہ ہیں اور نہ ہی بزدل کمزور اور بدحال افراد جو ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اپنے سایے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اسی طرح نہ ہی سست، کاہل اور بے کار افراد جو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں انہوں نے خراب اور برے ماحول اور فاسد معاشرے کے مقابلے پر خاموشی اختیار کی ہوئی ہے اور برائی اور فساد کو ختم کرنے کے لیے ذرا برابر بھی سعی و کوشش نہیں کرتے۔ یہ ہے اسلامی معاشرہ میں قیام مہدیؑ کا تعمیری اور مفید کردار اور اثر۔

اے اللہ! ہماری آنکھوں کو ان کی زیارت سے منور فرما اور ہمیں ان کے وفادار اصحاب اور جانثار سپاہیوں میں شمار فرما!

پیام قرآن کی نویں جلد کے ترجمے کا اختتام
۳/شوال المکرم/ ۱۴۳۲ ہجری
بمطابق یکم/ستمبر/ ۲۰۱۱
شب جمعہ، رات ۱۱ بج کر ۲۰ منٹ پر ہوا۔
سید حسنین عباس گردیزی عفی عنہ